U 41884

2-12-79

Title - Deewan Momin May Shireh

Creator - Mohd. Momin Khan Momin; Murattiba Zia Ahmad Zia Badauni

Publisher - Shanti Press (Allahabad).

Date - 1962

Pages - ~~[illegible]~~ 8+102+267.

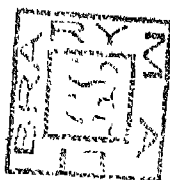
Subjects - Urdu Shayari - Dawaween.

كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ

تصنیفِ عشق معنیٰ و ترکیب دیگر است

ما شرحِ نکتۂ ز صد افسانہ می کنیم

الحمد للہ



کہ

دیوان مومن

مع شرح

جس میں رئیس المتغزلین **حکیم محمد مومن خاں** مرحوم دہلوی

کی غزلیات و فردیات و معمیات اکمل تصحیح و تحشیہ اور مفصل مقدمہ

کے ساتھ شامل ہیں

مرتبہ

احمد ضیا ایم اے بدایونی۔ سابق پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

دونوں

ڈاکٹر سید محمد حفیظ ایم اے پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ۔ لیکچرار الہ آباد یونیورسٹی)

علی گڑھ ۔۔

پریس الہ آباد میں طبع ہوا

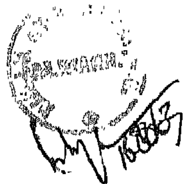
تقدمہ

گُل آورد سعدی سوئے بوستاں
بہ شوخی چو فلفل بہ ہندوستان

اگر بوستاں میں ہدیۂ گُل لیجانے کی شوخی پر سعدی کو معذور رکھا جا سکتا ہے تو مجھے توقع ہے کہ اس ناچیز ادبی نذر کو ادب نواز علم پرور نواب مسعود یار جنگ ڈاکٹر سر سید راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کی خدمت والا میں پیش کرنے کی جسارت پر میں بھی موردِ ملامت نہ ٹھہروں۔

خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

نیاز آگیں ضیاء





دیباچہ

طبع ثانی

دل نشیں شد سخنم تا تو قبولش کردی
آرے آرے سخنِ عشق نشانے دارد

خدا کا شکر ہے کہ شرح دیوان مومن کو ملک میں قبول عام حاصل ہوا۔ ممتاز ارباب فضل نے تحسین فرمائی۔ مشہور اہل قلم نے تعریفی ریویو لکھے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ اور تلامذہ نے شوق کے ہاتھوں سے لیا اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ مسلم یونیورسٹی اور بعض دوسرے اداروں نے شامل نصاب کیا۔ شرح مذکور میں تین خصوصیات کا التزام رکھا گیا تھا۔ شروع میں تحقیقی مقدمہ۔ متن میں تصحیح شدہ کلام۔ اور ذیل میں تشریحی حواشی۔ اب جب کہ طبع ثانی کی نوبت آئی تو کتاب پر نظر ثانی کا خیال ہوا۔ چنانچہ ہر ممکن سعی کی گئی ہے کہ زیر نظر ایڈیشن سابق سے بہتر اور مفید تر ثابت ہو۔ اس دوران میں کلام مومن کے کچھ اور قدیم اور صحیح نسخے دستیاب ہوئے جن میں ۱۸۳۴ء (موجودہ لٹن لائبریری علی گڑھ) ۱۸۴۸ء (مملوکہ خود) اور ۱۸۵۶ء (مقبوضۂ محمود میاں زبیری مارہروی) کے مخطوطات قابل ذکر ہیں۔ اُن سے دیوان کی تصحیح اور مقابلہ کیا گیا۔ علاوہ بریں شرح اشعار میں جابجا توضیح یا ترمیم سے کام لیا گیا۔ قصد تھا کہ مقدمے میں بھی ایک باب کا اضافہ کیا جائے جس میں شاعر کے طرز فکر کی نفسیاتی تشریح اور اُس کے تاریخی پس منظر کی کامل تنقیح ہو۔ مگر اہل مطبع کو عجلت ہے اور یہاں فقدان فرصت اس لئے یہ ارادہ فی الحال معرض التوا میں رکھا گیا۔ اس جگہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ عرصہ ہوا ملک کے بعض رسائل میں چند اشعار کی شرح پر ایرادات شائع ہوئے تھے۔ اُن پر غور کرنے کے بعد اگرچہ بعض جگہ راقم کو اپنی رائے میں ترمیم کرنی پڑی۔ لیکن بیشتر مقامات پر سابق تشریح کی صحت پر مزید شرح صدر بہم پہنچا۔ بہر حال راقم سطور نے دونوں قسم کے ایرادات سے یک گونہ فائدہ اُٹھایا۔ اور اسلئے دونوں کا شکر لازم آیا۔

علی گڑھ یکم فروری ۱۹۴۷ء

ضیاء احمد

دیباچہ

طبع ثالث

الحمدللہ کہ شرح دیوان مومن کا یہ تیسرا ایڈیشن اہل ملک کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ سابق ایڈیشنوں کی طرح اس کو بھی توقیع قبول روزی ہو۔

زیر نظر ایڈیشن میں ایک مقالہ (کلام مومن کا نفسیاتی مطالعہ) بھی شامل کیا گیا ہے۔ جس سے مومن کے سمجھنے میں مدد ملے گی +

خاکسار

ضیاء احمد

مسلم یونیورسٹی۔ یکم اپریل ۱۹۵۸ء

دیباچہ

طبع رابع

موجودہ ایڈیشن بھی حسب سابق شائقین ادب کی خدمت میں بہ امید قبول پیش ہے۔ تمام مندرجات پر پھر نظر ڈال لی گئی ہے اور جزوی ترمیمات کے سوا کوئی خاص تبدیلی نہیں کی گئی ہے +

ضیاء احمد

مسلم یونیورسٹی۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۱ء

فہرست مندرجات

تعارف

(از ڈاکٹر سید محمد حفیظ، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ)

ہمارے سامنے دنیا کی کون شے ہے جو ایک مستقل موضوع کی حیثیت نہیں رکھتی اور پھر کون سا موضوع ہے جس پر کچھ نہ کچھ ہر شخص اظہار خیال نہیں کرسکتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقی طور پر اظہار خیال کا وہی شخص حق رکھتا ہے جو اس موضوع سے مناسبتِ خاص کی بنا پر ایک مخصوص ذہنیت اور مخصوص بصیرت کا حامل ہو۔ تصنیف و تالیف کی اس وبائے عام میں اس نکتہ کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ پریس اور مشینوں کی لگاتار تگ و دو کے باوجود شاذ و نادر ہی کوئی کتاب ہمارے سامنے ایسی آتی ہے جسے صحیح معنوں میں ہم ایک علمی و ادبی کارنامہ کہہ سکیں۔

یہ کلیہ علوم و فنون سے لیکر تنقید ادب کے ہر شعبہ پر یکساں طور پر محتوی ہے شیلی کی شاعری پر جب فرانسس ٹامسن نے قلم اٹھایا تو انگلستان کو معلوم ہوا کہ شیلی کا شمار اس کے غیر فانی شعرا میں ہے۔ میر انیس عام طور پر ایک مرثیہ گو اور مرزا دبیر کے مد مقابل سمجھے جاتے تھے مگر علامہ شبلی مرحوم نے جب "موازنہ انیس و دبیر" لکھا تو لوگوں کو ان کی شاعری کی صحیح قدر و قیمت آنکھوں سے نظر آنے لگی، غالب کی نظم و نثر صرف نظم و نثر تھی مگر اس کی اہمیت و خصوصیت اس وقت معلوم ہوئی جب حالی نے "یادگار غالب" لکھکر اسے عالم آشکارا کردیا۔ مذکورہ مثالوں میں "مخصوص بصیرت و مناسبت" کی کارفرمائیاں نہیں تو اور کیا ہے؟

مومن کی شاعری اپنی چند در چند خصوصیات کی بنا پر اردو شاعری میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے ۔ تراکیب کی ندرت، خیالات کی نزاکت کے علاوہ اُن کی اصل چیز اُن کے محذوفات شعری ہیں جن سے اگر ایک طرف جدّت اور لطافت پیدا ہوئی ہے تو دوسری طرف ایک طرح کا اشکال و ابہام بھی پیدا ہو گیا ہے جس سے عام طور پر اُن کے کلام سے لطف اندوز ہونا دشوار ہو گیا ہے ۔ دوسری چیز جو مومن کو شعرائے اردو سے ممتاز کرتی ہے وہ اُن کا مخصوص طرزِ تغزل ہے ۔ اُنھوں نے غزل میں حُسن عشق و محبت کی ترجمانی کی ہے وہ ترغیبات جنسی سے آگے نہیں بڑھتی اُنھوں نے فلسفہ یا مابعد الطبیعیات کی وادیوں میں قدم نہیں رکھا با ایں ہمہ جرأت و انشا کی سی بیباکی و عریانی اُن کے کلام میں بہت کم ہے ۔ اُنھوں نے فطرتِ انسانی کی گہرائیوں سے موتی نکالے ہیں اور ایسے لطیف کیفیات و حسیات کو برافگندہ نقاب کیا ہے جو لفظ و بیان کی خفیف سی ٹھیس کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے ۔ عشق و محبت کے وہ نازک واردات جن کا تجزیہ و استقصاء صرف ایک حسّاس فطرت ہی کا حصّہ ہے ۔ مومن کے کلام میں اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ اُن سے نفسیات محبت کی ایک مستقل و مکمل تفسیر تیار ہو سکتی ہے ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شعر میں اخلاق و تصوف نہ ہو یا وہ دنیاوی عشق و محبت کے جذبات سے آلودہ نہ ہو ۔ شعر اور ایک عمدہ شعر کی پہلی اور شاید آخری شرط کیفیت ۔ لطافت اور بداعت اسلوب ہے ۔ اگر یہی چیزیں نہ ہوئیں تو صرف موضوع و مضمون کے اعتبار سے کوئی شعر حقیقی معنوں میں شعر کہلانے کا مستحق نہیں ہے ۔ اگر ایک ناظم

نے اخلاق، فلسفہ اور تصوّف کو نظم کر دیا یا دوسرے نے ہوس پرستانہ امور کو ردیف اور قافئے میں جکڑ دیا لیکن اس میں طرز بیان کی لطافت نہ ہوئی تو یہ دونوں باتیں یکساں طور پر صحیح شعر کی تعریف میں نہیں آسکتیں۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو اس اعتبار سے بھی اردو شاعری میں مومن کا کلام ایک بہت ہی مخصوص و منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اسلئے اس کا پورا لطف اُس وقت تک نہیں اُٹھایا جاسکتا جب تک اُن کے کلام کی شرح اور اُن کی خصوصیات شعری کو تفصیل و بسط کے ساتھ پیش نہ کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ کام مناسبت طبع، صحت مذاق اور جگر کاوی کا محتاج ہے۔ علم و فضل اور ایک مخصوص ذہنیت کے علاوہ ضرورت ہے بالاستیعاب مطالعہ کی جس کے بغیر مومن کے کلام کی تشریح و توضیح بوجوہ احسن انجام نہیں پاسکتی اس کی تصدیق موجودہ شرح غزلیات مومن مرتبۂ جناب ضیاء احمد صاحب ضیا بدایونی سے بخوبی ہوسکتی ہے۔

مولوی ضیاء احمد صاحب ضیا کا خاندان علم و ادب کے لحاظ سے بہت ممتاز ہے۔ آپ کے والد ماجد مولوی محمد رفیع احمد صاحب عالی مرحوم نہایت ذی علم اور صاحب مذاق بزرگ تھے۔ جو فن شعر میں کافی دستگاہ رکھتے تھے اور صاحب دیوان تھے۔ خود جناب ضیا نے الہ آباد یونیورسٹی سے درجہ اوّل میں ایم۔ اے کیا اس کے بعد ریسرچ اسکالر رہے۔ آپ کا شمار نہایت ذہین و طباع طالب علموں میں تھا۔ آپ نے فارسی کے علاوہ عربی میں بھی قابل قدر استعداد بہم پہونچائی تھی۔ الہ آباد یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دو سال تک

شعبۂ اُردو میں بحیثیت لکچرار کام کیا اور اب آپ وہاں شعبہ فارسی میں لکچرار ہیں۔ آپ کو اُردو ادب اور شعر و شاعری سے بغایت دلچسپی ہے۔ آپ نے ایک مجموعۂ نظم "تذکارِ سلف" کے نام سے شائع کیا تھا اس کے علاوہ آپ کے مضامین اُردو کے مشہور رسائل و جرائد میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے انشا و ادب میں آپ کی صحت مذاق اور ثروت نگاہی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

کلامِ مومن سے آپ کو ابتدا ہی سے خاص شغف رہا ہے چنانچہ ۱۹۳۵ء میں آپ نے قصائد مومن کی شرح شائع کی تھی۔ موجودہ دور میں مومن پر سب سے پہلا مضمون آپ ہی کے قلم سے نکلا اور رسالہ اُردو میں مومن کی تصویر کے ساتھ شائع ہوا۔ اس کے بعد ملک کے مختلف رسالوں میں مومن پر دیگر اہل قلم کے مضامین شائع ہوئے۔ اسلئے کلامِ مومن کی احیاء یا نشاۃ ثانیہ کے لئے اُردو زبان خاص طور پر آپ ہی کی مرہون و ممنون ہے۔

مومن کے کلام کے اصلی محاسن کو نمایاں کرنا دراصل خود شاعر کو قعرِ گمنامی سے نکال کر منظرِ عام پر لانا ہے۔ مولوی ضیا احمد صاحب کی یہ شرح دیوانِ مومن اس اعتبار سے تنقید ادب میں ایک گرانقدر اضافہ بلکہ خود اُردو ادب پر ایک احسان عظیم ہے۔ آپ نے کلامِ مومن کی تصحیح و تشریح میں جس جانفشانی اور دقتِ نظر سے کام لیا ہے اس کا صحیح اندازہ صرف کتاب کے مطالعہ ہی سے ممکن ہے۔ مزید شرح و بسط میں اُلجھا کر میں ناظرین کا وہ وقت جسے اصل کتاب کے مطالعہ میں صرف ہونا چاہیئے ضائع کرنا نہیں چاہتا۔

سخنہائے گفتنی

سخنِ دوست گراں بود فراواں کردم
جاں بہ بیعانہ بسیار بدکہ ارزاں کردم

سنہ ۱۹۲۵ء میں جب میں نے قصائدِ مومن[1] شائع کئے تھے تو وعدہ کیا تھا اگر وقت نے مساعدت کی تو غزلیات کا حصہ بھی جلد پیش کیا جائے گا۔ مگر کسی نے سچ کہا ہے۔ اَلْاُمُوْرُ مَرْھُوْنَۃٌ بِاَوْقَاتِہَا آٹھ برس کے قریب ہونے آئے اور دیوان غزلیات کو پریس میں بھیجنے کی نوبت نہ آئی۔ اس غیر معمولی تعویق کا سبب میرے ذاتی افکار و مکروہات تھے جنھوں نے اب تک سر اٹھانے کی مہلت نہ دی۔ ان امور کی تفصیل سے قارئین کرام کے لمحات عزیز کو ضائع کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ بارے آج خدا کے فضل سے یہ دن نصیب ہوا کہ غزلیات مومن کو تصحیح اور تشریح کے بعد پریس میں بھیجا جا رہا ہے اور حق تعالیٰ سے اُمید ہے کہ یہ حصہ بھی جلد شائع ہو کر حُسنِ قبول حاصل کرے گا۔

یہاں پر قدرۃً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کلام مومن کے نسخے عام طور پر بازار میں ملتے ہیں۔ تو پھر مجھے اس جانفشانی اور جگر کاوی کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مجھے شعرائے اُردو میں مومن سے غیر معمولی شغف رہا ہے اور میں (میر کو چھوڑ کر) نفسِ تغزل میں کسی کو اُن کا ہم پایہ نہیں سمجھتا۔ ادبِ اُردو کی بدقسمتی اور حامیانِ اُردو کی بے اعتنائی کہ اتنے بڑے باکمال اُستاد کی

[1] ملاحظہ ہو مجموعۂ قصائد مومن ۔ مرتبہ راقم ۔ مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ ۔

کلیات - طباعت کے ظاہری محاسن تو در کنار - زیور صحت سے بھی آراستہ نہیں - کاتبوں کے نسخ و مسخ نے اُس کی صورت اس قدر بگاڑ دی ہے کہ جی کُڑھتا ہے پھر طرّہ یہ کہ فکر کی بلندی اور خیال کی نزاکت کے ساتھ اُن کے یہاں اشکال و اغلاق کی اس قدر فراوانی ہے کہ اشعار کا معتد بہ حصہ نہ صرف عوام بلکہ اکثر خواص کے نزدیک بھی مُعمّا بنکر رہ گیا ہے - اسی لئے میں عرصہ سے سوچ رہا تھا کہ اُردو کے اس قادر الکلام شاعر کے دیوان کا ایک صحیح ایڈیشن ضروری مطالب کے ساتھ اس طرح شائع کر دیا جائے کہ مذاق جدید کی رعایت بھی مد نظر رہے - بحمد اللہ کہ یہ ارادہ آج قوۃ سے فعل میں آرہا ہے، یورپ میں ہر ناظم و ناثر سے متعلق نقد و نظر - شرح و تحشیہ کا اس قدر سواد فراہم ہو جاتا ہے اور ہر مصنف کی تصانیف کے متعدد ایڈیشن اس صحت و صفائی کے ساتھ شائع کئے جاتے ہیں کہ اُس کے مقابلے میں ہم کو اپنے ملک اور اپنی زبان کا نام لیتے بھی شرم آتی ہے - نواب[1] مسعود یار جنگ ڈاکٹر سر سید راس مسعود بالقابہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ایک فرینچ یا جرمن مستشرق جو میرا دوست تھا سیر و سیاحت کی غرض سے ہندوستان آیا - دہلی پہونچکر وہ میری معیت میں وہاں کے مشہور مقامات کو دیکھنے کی غرض سے نکلا - اثنائے راہ میں اُس نے دریافت کیا کہ آپ کی زبان کا سب سے بڑا شاعر کون ہے - جب اُس کو بتایا گیا کہ اُردو کا سب سے بڑا شاعر

---

[1] اُردو زبان کی خدمت کے سلسلہ میں شعبۂ تصنیف و تالیف قائم کرنے اور مشہور تصانیف کو صحت و صفائی کے ساتھ طبع کرانے کی ایک زبردست اسکیم ڈاکٹر صاحب ممدوح کے زیر غور ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ بہت جلد عملی صورت اختیار کرے گی۔

غالب ہے تو اُس نے دیوان غالب دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ بازار قریب ہی تھا۔ ایک کتب فروش کی دُکان پر جاکر دیوان غالب طلب کیا گیا۔ چنانچہ ایک معمولی نسخہ قلیل قیمت پر دستیاب ہوگیا۔ واپسی پر برسبیل تذکرہ میں (نواب مسعود جنگ) نے اُس سے پوچھا کہ ہندوستانیوں کی تہذیب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ اُس نے چھوٹتے ہی جواب دیا کہ میرے نزدیک ہندوستانیوں کی زندگی جانوروں کی زندگی سے کچھ ہی بہتر ہو تو ہو۔ وجہ دریافت کرنے پر اُس نے کہا کہ کسی مُلک کی تہذیب کا اندازہ وہاں کے ذوقِ ادب کو دیکھکر بہ آسانی کیا جاسکتا ہے۔ کیا یہ افسوس کا مقام نہیں کہ آپ کی زبان کا بہترین شاعر اس کس مپرسی کے عالم میں ہو کہ اُس کا کلام ادنیٰ کاغذ اور ذلیل طباعت کے ساتھ اس قدر ارزاں قیمت پر بازار میں ملتا ہو[۱]۔

اس واقعہ کو تقریباً بیس برس ہوئے مگر اُس کی واقعیت اُردو کے اکثر بڑے اساتذہ و مصنفین کے معاملہ میں آج بھی اُسی طرح آشکار ہے۔ مومن ہی کو دیکھئے جو حُسنِ تخیّل کے اعتبار سے یوسفِ مصرِ معانی کہے جانے کا مستحق ہے لیکن کیا آج اہلِ مُلک کی بے اعتنائی کے ہاتھوں شروہ بثمن بخس دراہم معدودہ وکانوا فیہ من الزاہدین کا مصداق نہیں؟ وللہ درّہٗ حیث قال۔ یوسفم را بہ کلاوۂ پیرزال نمی خرند واز چاہ کنعانی بسیم قلب ہم نمی برند۔

[۱] اس عبرت آموز واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ ڈاکٹر صاحب بالقابہٗ کی تحریک وسعی سے مرزا غالب کے دیوان کا ایک نہایت صحیح و دیدہ زیب ایڈیشن پہلی بار نظامی پریس۔ بدایوں سے شائع ہوا اور اُسکے بعد ملک کے طول وعرض میں غالب پرستی کی لہر دوڑ گئی۔ شکر کا مقام ہے کہ دہلی کے دوسرے اُستاد اور غالب کے معاصر (مومن) کے کلام کے نشر و احیا کا کام بھی جناب موصوف کے انتساب کے ساتھ بدایوں ہی سے ظہور میں آیا۔

یہ خیالات تھے جو زیر نظر ایڈیشن کے وجود میں آنے کے ذمہ دار ہوئے۔

اب ذرا اُس "جانفشانی اور جگر کاوی" کی حقیقت بھی سُن لیجئے جس کا اوپر کی سطور میں ذکر آیا ہے۔ یہ امر واقع ہے کہ کلیات مومن کے جس قدر نسخے بھی دستیاب ہوتے ہیں تصحیف و تحریف کی بدولت اغلاط سے لبریز ہیں اور اگرچہ آپس میں مختلف ہیں مگر غلط ہونے میں سب متفق ہیں۔ اس لئے ضرورت تھی کہ کوئی صحیح نسخہ بہم پہنچایا جائے اور صحیح نسخہ نہ ہونے کی صورت میں (جیسا کہ فی الواقع ہوا) مختلف نسخ کے مقابلہ اور ذاتی اجتہاد کے بعد ایک صحیح نسخہ مرتب کیا جائے۔ اس غرض سے الہ آباد یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی کی لائبریری اور اپنے بعض ذی علم احباب کے پرائیوٹ کتبخانوں سے مختلف سنوں اور مطبعوں کے کلیات حاصل کئے گئے۔ مگر سب کے سب کم و بیش اغلاط سے مملو تھے۔ ریاست ٹونک اور ریاست رامپور کے کتبخانوں کے قلمی نسخوں سے بھی استفادہ کا موقع ملا یہ دونوں نسبتۂ صحیح تر تھے لیکن مطلب ان سے بھی حاصل نہ ہوا، سب سے قدیم نسخے جو دستیاب ہوئے اون میں سے ایک (رامپور کا ناتمام قلمی نسخہ) ۱۲۵۹ھ کا لکھا ہوا اور دوسرا (سید ناصر حبیب نبیرہ مومن کی عطا کردہ مطبوعہ کلیات) ۱۲۷۵ھ کا چھپا ہوا تھا لیکن اس کا کیا علاج کہ کاتبوں کے تصرف سے یہ بھی محفوظ نہ پائے گئے۔ مجبوراً بیس نسخوں سے مقابلہ کرنے اور اختلاف کی صورت میں ذاتی فیصلہ سے کام لینے کے بعد موجودہ ایڈیشن مرتب کیا گیا۔ یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ یہ تمامتر اغلاط سے پاک ہے۔ البتہ تعلّی نہ ہوگی اگر کہا جائے کہ

سلہ طوالت کے خوف سے (جدید روش کے برخلاف) اختلاف نسخ کو فٹ نوٹ میں دکھانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ البتہ فہرست اغلاط (جنکی نسخہ موجودہ میں تصحیح کر دی گئی ہے) ایک جگہ دیدی ہے۔

متداول نسخوں میں اس سے صحیح تر نسخہ نہیں مل سکتا (بشرطیکہ کاتبوں کی قطع و برید سے محفوظ رہے)

تصحیح کے بعد دوسرا مرحلہ اضافۂ حواشی کا تھا۔ اغلاطِ کتابت سے قطع نظر مومن کا اسلوبِ ادا خود اس قدر پیچیدہ ہے کہ تقریباً ہر غزل کے نصف شعر محتاجِ شرح ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مومن کے یہاں تغزل کی رنگینی اور خیال کی نزاکت اس حد تک پہونچی ہوئی ہے کہ جو مومن کا نقطۂ آغاز ہے وہ دوسرے شعرا کا منتہائے رسائی ہے اور یقیناً غزل ہی وہ صنف ہے جہاں اُن کا آفتابِ کمال پوری درخشانی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ وہ اُردو تغزل میں ایک طرزِ خاص کے مالک ہیں جس کے خود ہی موجد ہیں خود ہی خاتم ہیں اور اپنے مطلب کو پیچ سے ادا کرنا اور بات کو پھیر سے کہنا اس طرزِ خاص کی خصوصیت ہے۔ یہی سبب ہے کہ عوام تو درکنار کبھی کبھی خواص بھی اُن کے مفہوم تک پہونچنے سے قاصر رہتے ہیں۔ میرے خیال میں تمام اُردو شعرا میں صرف غالب اور مومن ہی ایسے ہیں جن کا کلام شرح طلب ہے۔ فرق یہ ہے کہ غالب کے یہاں فلسفہ و تصوّف ہے اور مومن کے یہاں عشق و تغزّل۔ بلکہ یہ حیرت ہے کہ مومن نے تغزل جیسے محدود موضوع میں اس قدر تنوّعِ خیالات کیونکر پیدا کر دیا ہے۔ بہر حال مومن کے کلام کا اغلاق[ش۵] ایک کھلی ہوئی بات ہے۔ جس کو مومن کا ہر مطالعہ کرنے والا جانتا ہے۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لئے ضرورت تھی کہ ان کے طرز و انداز سے طبیعت کو

ش۵ کلامِ مومن کے اغلاق کے اسباب مقدمہ میں ملاحظہ ہوں۔

بخوبی آشنا کیا جائے۔ اس کا ذریعہ اُن کی سیرت کا غائر مطالعہ تھا یا اُن کے کلام پر کافی عبور۔ سیرت کے لئے گلشن بیخار۔ آب حیات۔ گل رعنا۔ شعر الہند اور دوسرے تذکروں کے علاوہ اپنے محب مکرم فنا فی المومن حضرت عرش گیاوی کی حیات مومن اور مخدوم معظم سید ناصر حبیب دہلوی نبیرہ مومن اور محترمہ کنیز فاطمہ بنت سید صاحب موصوف کے ارسال کردہ حالات سے استفادہ کیا اور اس کے بعد کلیات کو متعدد بار بالاستیعاب پڑھا۔ اس تمام تجسس اور تفحص کا نتیجہ یہ حواشی ذیلی ہیں جو اشعار کے نیچے دیدیے گئے ہیں۔ اکثر اشعار کی تحقیق میں بحث و تمحیص اور غور و فکر کی بیشمار قیمتی گھڑیاں صرف کی ہیں۔ تب کہیں یہ "تراوش خوننابہ" ظہور میں آئی ہے۔

خونناب آتشیں ز سر من گذشتہ است
ویں سیل آتش از جگرِ من گذشتہ است

اس تفصیل سے خودستائی مقصود نہیں۔ محض گذارش احوال واقعی منظور ہے۔ اسی کے ساتھ اس کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ بعض مقامات پر شاعر کے مفہوم کی تہ تک پہونچنے میں شاید خود میں بھی کامیاب نہ ہوسکا ہوں۔ اس جگہ نامناسب نہ ہوگا اگر اس شرح کی بعض خصوصیات بیان کردیجائیں۔

(۱) صرف مشکل اشعار کے مطالب لکھنے کی ضرورت سمجھی گئی۔ اشعار کے محاسن یا قبائح اور ہم معنی شعر محض ضمناً بیان کردئے گئے ہیں۔

(۲) اگر کوئی شعر محتمل الوجوہ ہے تو بیشتر ایک اور کمتر دو معنی پر اکتفا کی گئی ہے اور کثرت معانی کی صورت میں اُس معنی کو ترجیح دی گئی ہے جو طرز مومن سے اقرب ہے۔

(۳) اس مجموعہ کے مخاطب صحیح نہ مبتدی طلبا ہیں نہ منتہی علماء۔ اسی لئے حد سے زیادہ اطناب یا ایجاز سے پرہیز کیا گیا ہے۔

(۴) بعض مواقع پر حسب ضرورت ترتیب نثر یا خفیف تصرف پر اقتصار کیا گیا ہے۔

(۵) صنائع کے بیان میں ہر جگہ تفصیل کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ اکثر جگہ "رعایت یا مناسبت شاعرانہ" (غیر اصطلاحی مفہوم میں) لکھ کر چھوڑ دیا گیا ہے۔

بہر حال یہ خاکہ ہے میری ناچیز خدمت کا جس کی بنیاد ڈالدی گئی ہے۔ تکمیل عمارت دوسرے اہل فن کے ذمے ہے۔

تا نہال دوستی کے بر دہد
حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

اس التماس کے ختم کرنے سے پیشتر میرا فرض ہے کہ حضرۃ الاخ المعظم مولوی رضی احمد صاحب رضی مدظلہ الاقدس کی بزرگانہ شفقت اور علمی اعانت کا تہ دل سے اعتراف کروں۔ رسم پرستی اور تصنّع میرا شیوہ نہیں۔ ظاہر داری اور تکلّف کا میں قائل نہیں مگر باللہ العظیم نہ صرف میری جبین نیاز۔ بلکہ میرا دل عقیدت کیش ہر لحظہ آپ کے آستان کمال پر جھکنا معراج شرف سمجھتا ہے۔ کیونکہ میرا ذوق ادب اور مذاق شعر تمامتر آپ ہی کے فیض تربیت کا رہین کرم ہے۔ حضرت ممدوح فضل و تبحر۔ مذاق شعر گوئی و پایۂ شعر فہمی۔ وسعت نظر اور علوّ فکر کے اعتبار سے ہندوستان کے ان معدودے چند مایۂ ناز اساطین علم و شعر میں ہیں جن کو زمانہ مدتوں میں پیدا کرتا ہے۔ آپ کو "عرض متاع ہنر" سے اس قدر اجتناب ہے کہ مرزا غالب کا یہ شعر سر تا سر

آپ پر صادق آتا ہے۔

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

تاہم جن چند اصحاب کو آپ سے نیاز حاصل ہے وہ آپ کی بالغ نظری اور نکتہ رسی کے معترف و معتقد ہیں۔ غزلیات مومن کی شرح کے دوران جب ایسا اتفاق ہوا کہ بعض شعر باوجود سعی و فکر حل نہ ہو سکے۔ آخر ثقات ذی علم احباب سے مشورہ کیا گیا مگر پھر بھی عقدہ لاینحل رہا لیکن جب کبھی حضرت قبلہ سے رجوع کی گئی معاً آپ کے ناخن فکر نے اس آسانی سے گرہ کشائی کر دی کہ گویا سرے سے کوئی دشواری تھی ہی نہیں۔ یہ امر بالکل بدیہی ہے کہ اگر خدا کے فضل کے بعد آپ کی عنایت و اعانت شامل حال نہ ہوتی تو میں اس ناچیز خدمت کو منظر عام پر لانے کی جرأت ہرگز نہ کر سکتا۔

ممکن ہے کہ کوئی ناواقف فقیر کی اس درازنفسی کو بیجا مبالغہ یا بے محل عصبیت پر محمول کرے لیکن اگر اظہار حق میں بے باکی کوئی محمود صفت ہے تو ہر منصف مزاج شخص فقیر کو اس اعتراف میں معذور اور فیضی کی طرح اس اعلان میں حق بجانب سمجھے گا۔

در فضل مفتخر ز گرامی برادرم

اسی کے ساتھ حق ناشناسی اور ناسپاسی ہوگی اگر ان ذی علم اور لائق احترام بزرگوں اور عزیزوں کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جنہوں نے کمال نوازش و محبت سے اپنے مطبوعہ یا قلمی نسخے مستعار عنایت کئے یا ان کے کسی حصہ کی نقل عطا کی یا مومن کے سوانح حیات ارسال فرمائے۔ ان حضرات

میں عالی جناب نواب محمد اسمٰعیل خاں بالقابہ (میرٹھ) حافظ احمد علی خاں (رامپور)۔ حضرت اختر مینائی۔ جناب احسن مارہروی۔ ڈاکٹر محمد حفیظ سید (الہ آباد یونیورسٹی)۔ جناب سید یعقوب الحسن فرخ آبادی۔ مولوی مختار احمد بدایونی۔ حضرت عرش گیاوی۔ جناب سید ناصر حبیب دہلوی نبیرۂ مومن اور محترمہ کنیز فاطمہ دہلوی کے اسمائے سامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس موقع پر جب میں خیال کرتا ہوں کہ میرے عزیز اور دوست قاضی حضور الرحمٰن بدایونی آج دنیا میں موجود نہیں تو میرا قلب جذبات غم و الم سے لبریز ہو جاتا ہے۔ مرحوم (خدا اُن کی تربت کو عنبرین کرے) جوان صالح و سعید تھے اور خلوص و محبت میں بے نظیر۔ کلام مومن کو ایڈٹ کرنے کا خیال جب پہلے پہل اُن سے ظاہر کیا گیا تو انھوں نے نہایت سرگرمی سے اس تحریک کی تائید کی۔ اور بعد کو بھی برابر اپنی مستقل مزاجی سے میرا دل بڑھایا۔ کاش آج وہ جواں مرگ اپنی دیرینہ آرزو کو پورا ہوتے دیکھتے

دلم بر رنجِ نابرداریٔ فرہاد می سوزد
خداوندا بیامرز آں شہیدِ امتحانے را

آخر میں میں اپنی اس سبک مایہ خدمت کو پبلک کے سامنے پیش کرتے ہوئے حق تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ میری کوشش کو مقبول اور سعی کو مشکور فرمائے غزلیات کے بعد قطعات، رباعیات و مثنویات وغیرہ کا نمبر ہے۔ مگر وہ حصہ صحیح بھی ہے اور آسان بھی۔ اس لئے غالباً اُس کے اڈٹ کرنے کی ضرورت نہ پڑے

مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔ ۱۵ ؍ جون ۱۹۳۳ء

ضیاء احمد

فہرست اغلاطِ نسخ متداولہ

جو دیوان غزلیاتِ مومن کے تقریباً تمام متداولہ نسخوں میں کم وبیش موجود ہیں اور جن کی زیر نظر ایڈیشن میں فکر و مقابلہ کی کاوشوں کے بعد تصحیح کردی گئی ہے

حوالہ	غلط	صحیح
غزل ۱ شعر ۳	اعتراض	اعتراف
" " ۴	جیب جنوں کی شاں	جیبِ جنوں کی شاں
" " ۷	لکھتا ہے	لکھنا ہے
" " ۱۲	ہر جراحت سے	ہر جراحت ہو
" " ۱۲	عبادت	عیادت
" " ۱۵	اصحاب نفاق اہل بدعت	اصحاب نفاق و اہل بدعت
" " ۱۶	بنا ہے	بُلا ہے
غزل ۲ " ۳	خیرہ چشمہ	خیرہ چشمی
" ۴ " ۵	افسانہ سنانا	اتنا نہ ستانا
" " " ۸	کہہ سناتے ہو	کیا سناتے ہو
" " " ۸	احسان	آسان
" " " ۹	اُس کا	اُس کو
" ۵ " ۹	کوئی دن یہ	کوئی دن ہیں
" " " ۹	وہ کرے گا	میں کروں گا
" ۱۱ " ۷	اچھا	رسوا

صحیح	غلط	حوالہ
آپ نے	آپ کے	غزل ۶۔ شعر ۹
وہ حال۔ ارسے میرا کہ گاہ غیر سے بھی تمھارے سامنے یہ ماجرا بیاں نہ ہوا (یہ شعر اکثر نسخوں میں موجود نہیں)	—	” ۷
تو بھی نہ واں	تو بھی وہاں	غزل ۸۔ شعر ۲
صبح کہ	صبح کو	” ۹ ” ۳
سیہ روز	سیہ رونہ	” ۱۰ ” ۴
نعش پہ	نعش پر	” ” ” ۶
ایسا ہے	ایسا	” ۱۱ ” ۱۱
طعنہ	ہے طعنہ	” ۱۱ ” ۱۳
وقتِ جوشِ بحرِ گریہ میں جو گرم نالہ تھا حلقۂ گرداب رشکِ شعلۂ جوالہ تھا (یہ مطلع اکثر نسخوں میں نہیں)	—	” ۱۴
دیتے ہی	دیتے ہیں	غزل ۱۶۔ شعر ۳
پرکالہ	پرکالالہ	” ” ” ۶
دعوت فریاد	دعوت فرہاد	” ۱۷ ” ۵
داغہائے رشک	داغہائے اشک	” ۱۸ ” ۶
نہ کہنا	یہ کہنا	” ۱۹ ” ۴
نشئہ	تشنہ	” ۲۱ ” ۶

حوالہ	غلط	صحیح
غزل ۲۲ شعر ۱۱	دل کے قلق کے	دل کے قلق کا
" ۲۳ " ۲	ہو	ہوں
" " " ۱۱	پر وحشت	وحشت پر
" ۲۴ " ۴	دل آزار	دل زار
" " "	—	روزِ جزا خدا بہت جو اٰلادِ کو ملا گویا کہ خونِ ناحق، مومن صواب تھا (یہ مقطع اکثر نسخوں میں موجود نہیں)
غزل ۲۵ شعر ۱۱	نازک آرام	نازک اندام
" ۲۶ " ۲	خود آلود	خون آلود
" ۲۷ " ۴	خود چھپانے کو	خوں چھپانے کو
" " " ۶	بسمل	سائل
" ۲۸ " ۴	کہ کا ڈر ہے	کس کا در ہے
" ۳۰ " ۶	پُر ہو اب بھی	ہو ۔ پر اب بھی
" " " ۹	تمنے	ہمنے
" ۳۱ " ۵	جزا کے بعد	جزا کے دن
" ۳۱ " ۸	نگاہ خیر	نگاہ خیرہ
" ۳۲ " ۸	جستجوئے	جستجو سے
" ۳۴ " ۲	بہل جانا	پھسل جانا
" ۳۴ " ۴	نہیں	یہیں

حوالہ	غلط	صحیح
غزل ۳۴ شعر ۹	ہوں	ہو
″ ″ ″ ۱۲	بیمار محبت میں	بیمار محبت ہے
″ ۳۷ ″ ۷	پردہ نو پرتو	پردۂ تو پرتو
″ ۳۸ ″ ۹	تپ	تب
″ ۳۹ ″ ۴	ملجاتے ہی	ہلجاتے ہی
″ ۴۰ ۳	جو رحم آیا	تو رحم آئے
″ ″ ″ ۸	عدو کے	عدو کا
″ ۴۱ ″ ۲	در و دیوار	در دلدار
″ ″ ″ ۸	بولوں گا	لوگوں کا
″ ۴۲ ″ ۷	پر	پھر
″ ″ ″ ۱۵	استادوں کو	استادوں کا
″ ۴۶ ″ ۶	ہیں	تھے
″ ۴۷ ″ ۹	اسکو	ہمکو
″ ۵۰ ″ ۳	تازگی	تازگی
″ ۵۱ ″ ۱۰	آنکھو	دل کو
″ ۵۲ ″ ۱۱	انتیار	اعتبار
″ ″ ″ ۱۳	جاں پکڑتا	حیا پکڑتا
″ ۵۴ ″ ۴	جنگ میں	جنگ بن
″ ″ ″ ۹	طول عمل	طول امل

حوالہ	غلط	صحیح
غزل ۵۳ شعر ۱۲	رحم پر	رحم کر
″ ″ ″ ۱۶	عرض مضطرب مومن	عرض مضطرا سے مومن
″ ۵۶ ″ ۲	حال کہا	حال کیا
″ ″ ″ ۸	ہے جنگ	تھی جنگ
″ ۵۷ ″ ۹	وہاں جمال صنم کو نفرت	وہاں ترقی جمال کو ہے
″ ″ ″ ۱۰	خفت القلم	جفت القلم
″ ″ ″ ۱۱	خرام نازک قدم	خرام نازاکِ قدم
غزل ۵۸ ″ ۳ و ۴	۳ و ۴	۴ و ۳ (یہاں تقدم و تاخر ہوگیا ہے)
″ ۶۱ ″ ۳	رنگین ہیں	رنگین ہے
″ ″ ″ ۴	نالوں سے	تالو سے
″ ۶۲ ″ ۲	آہ و فغاں کے بے اثر	آہ و فغانِ بے اثر
″ ۶۳ ″ ۳	زرد چہرہ	زرد چیرہ
″ ″ ″ ۷	کہ یہ یرقان کا ہے طبیب	یرقان کا ہے اے طبیب
″ ۶۴ ″ ۵	سوتے نہیں اب وہ	سوئے نہیں آپ
″ ۶۷ ″ ۲	خاک پر	چرخ پر
″ ″ ″ ۹	کام کرتا ہے	کام آیا ہے
″ ″ ″ ۱۲	ہوئی	ہوا
″ ۶۸ ″ ۵	شعلہ مزاج	شعلہ عذار
″ ″ ″ ۷	انتظار اثر نالۂ شبگیر	انتظار اثر اے نالۂ شبگیر

حوالہ	غلط	صحیح
غزل ۶۸ شعر ۹	اب	آ
″ ۶۹ ″ ۵	بادہ نوبہار	باد نوبہار
″ ۷۰ ″ ۹	کسی طرح	نزی طرح
″ ۷۱ ″ ۳	خفا	خفہ
″ ″ ″ ۱۱	دوروز	ورود
″ ۷۳ ″ ۵	سنگ دل پر شکن	سنگ دل دلشکن
″ ۷۴ ″ ۷	اُڑ جائے گا	اُڑ جانے کا
″ ″ ″ ۸	رنگ گل	رگِ گل
″ ۷۵ ″ ۲	ہو زمزمہ پر خوب	ہو زمزمہ پرداز
″ ″ ″ ۵	یہ یہ کر	تہ تہ کر
″ ۷۷ ″ ۳	حیرت	حسرت
″ ″ ″ ۸	جو ہے	ہے ہے
″ ۷۸ ″ ۱	دکھاتی ہے	دلاتی ہے
″ ″ ″ ۱۶	زعفراں ہی	زعفراں کی
″ ۷۹ ″ ۱	ناتواں ہیں	ناتواں نہیں
″ ″ ″ ۲	خوش	غش
″ ″ ″ ۱۲	بکھڑ گئیں	پھر گئیں
″ ۸۱ ″ ۱	چشم پوشی	چشم بند
″ ۸۲ ″ ۴	جو رکیا	جو رہے کیا

حوالہ	غلط	صحیح
غزل ۸۵ شعر ۷	وفاکے سبب	وفا کا سبب
// ۸۶ // ۳	تفادل	تفتِ دل
// // // ۴	سیر دکھائیگا	سیر دکھلا-ئیگا
// // // ۶	پوچھے گہر جسکو	پوچھ گہر جسکو
// ۸۷ // ۲	غش آگیا	ہوش آگیا
// ۸۸ // ۱۱	ابتک	شب ہجر
// ۸۹ // ۶	غنچہ کے درسے	غنچہ کے زرسے
// // // ۸	ہوا	نہیں
// ۹۱ // ۷	ہے شوخ	اے شوخ
// ۹۲ // ۳	اب ذرا سُننے دے تو	اب ذرا جا رہی
// ۹۳ // ۸	زُبان شمع	زبان شمع
// ۹۵ // ۹	غم خامہ	غم خانہ
// ۹۷ // ۱۱	مست نگر	مست سکر
// ۹۸ // ۶	تجھے	مجھے
// ۱۰۲ // ۱	گرو ہاں کی	گرد وان کی
// ۱۰۵ // ۸	پیچ وتاب ہے دل	پیچ وتاب نپوچھ
// ۱۰۶ // ۲	شوخ نیلی قام	شوخ لیلیٰ نام
// ۱۱۰ // ۲	خجل ہیں	خجالت
// ۱۱۳ // ۴	شایہ	شاہد

حوالہ	غلط	صحیح
غزل ۱۱۴ شعر ۲	شرخی	شوخی
〃 〃 〃 ۹	اشک چشم یار	رشک چشم یار
〃 ۱۱۵ 〃 ۱۷	زنگ	رنگ
〃 ۱۱۷ 〃 ۹	چھیڑ تو دیکھئے	چھیڑ تو دیکھو
〃 ۱۲۲ 〃 ۲	بیقراری میں جفا	بیقراری بن جفا
〃 〃	—	قیس شوخ اب کیونکہ دعوی ملک وحشت کا کرے مہر محضر ہو گیا نقش سم آہو ہمیں (یہ شعر بعض نسخوں میں نہیں)
〃 ۱۲۳ 〃 ۱۰	وہی اسے چارہ گر	الٰہی چارہ گر
〃 ۱۲۴ 〃 ۲	جبئیں	جلیں
〃 〃 〃 ۸	گو ہو رسوائی	اس توقع پہ
〃 ۱۲۶ 〃 ۵	واں یہ حالت ہے	واں کبھی جیتی سے
〃 ۱۲۷ 〃 ۱۱	نگاہ	گناہ
〃 ۱۲۸ 〃 ۵	میں تری بزم سوز میں ہیں یہ قبا تنگیں	بن ترے بزم سوز میں ہیں یہ قبا تنگیں
〃 〃 〃 ۱۰	اب	آپ
〃 ۱۲۹ 〃 ۱۱	کیا گیا	کیا کیا
〃 〃 〃 ۱۵	بوالہوس نہیں	بوالہوس سہی
〃 ۱۳۰	—	درد بے درماں مراست کش مرہم نہیں داغ تو ہے چارۂ داغ کہن کی فکر میں (یہ شعر بعض نسخوں میں نہیں)

حوالہ	غلط	صحیح
غزل ۱۳۱ شعر ۴	کام ودہان یار	کام ودہانِ مار
〃 〃 〃 ۱۰	بھیجتے ہیں	بھیجتے ہیں
〃 ۱۳۳ 〃 ۲	زو جان کبھی جو کچھ	ہو جان کبھی جاسکے کچھ
〃 〃 〃 ۴	ہر وقت	بے وقت
〃 〃		کیونکر کہ پڑے دل اُس سے کہیں فرق و عادت ناصح و یا نہ تھا کہ میں عواتِ دل کروں (یہ شعر کئی نسخوں میں غائب ہے)
〃 ۱۳۹ 〃 ۲	آتشِ تن	آتش زنِ تن
〃 ۱۴۰ 〃 ۶	داغِ زخم	داغ و زخم
〃 ۱۴۱ 〃 ۳	دل کا کیا حال کوئی دیکھے کہ یہ گرمیِ حسن	دل کا کیا حال کرے دیکھئے یہ گرمیِ حسن
〃 ۱۴۲ 〃 ۱۵	اتنے سبک نظر ہیں یا وضاعِ روزگار	اتنے سبک نظر میں ہیں اوضاعِ روزگار
〃 ۱۴۳ 〃 ۳	فتحیاب	فتحِ باب
〃 〃 〃 ۱۰	ابھی	تو ہے
〃 ۱۴۴ 〃 ۱	شوقِ شراب	شوقِ ثواب
〃 〃 ۱۴	اُس کو	اُس نے
〃 ۱۴۷ 〃 ۹	بجا ہے	بجائے
〃 ۱۴۸ 〃 ۳	مر کے اوپر	مر کے مُنہ پر
〃 〃 〃 ۹	روزِ ہجراں	روزِ ہجراں ست
〃 ۱۴۵ 〃 ۸	بیداد	بیدرد

حوالہ	غلط	صحیح
غزل ۱۵۱ شعر ۳	ہے	ہیں
〃 ۱۵۳ 〃 ۶	بھیجیو تم	بھیجو جو تم
〃 ۱۵۵ 〃 ۱	ہم کو کہتے تھے	ہم کو تو کہتے تھے
〃 ۵۵ 〃 ۴	یستگان دام	رستگان دام
〃 〃 〃 ۸	سوے دام	سو دے دام
〃 ۱۵۶ 〃 ۹	سرمشق تو	سرمشق تُو
〃 ۱۵۷ 〃 ۷	نالہ اندیشہ کام	نالہ اندیشہ کام
〃 ۱۵۹ 〃 ۷	ہو خانماں خراب	ہوں خانماں خراب
〃 〃 ۱۳	ہے	ہیں
〃 〃 ۱۶	ہم بھی	ہم ابھی
〃 ۱۶۱ 〃 ۷	یار نے	یار سے
〃 ۱۶۶ 〃 ۹	زار ہو	زار ہوں
〃 ۱۶۷ 〃 ۱	کو	مست
〃 〃 〃 ۶	آئینہ خانہ میں گیا	آئینہ خانہ بن گیا
〃 〃 〃 ۷	اے یاد دست دامن مژگاں نچھوڑ دیکھ	اے یاد دست دامن مژگاں نچوڑ دیکھ
〃 ۱۶۸ 〃 ۱۳	کی	کیں
〃 ۱۷۲ 〃 ۴	پھوڑ چل	پھوڑ چلا
〃 〃 〃 ۱۴	ثابت کیا	ثابت ہے کیا
〃 〃 〃 ۱۶	عشق کے آزار سے	عشق کے اظہار سے

حوالہ	غلط	صحیح
غزل ۱۸۱ شعر ۱	کہ یہ جتنا زمیں کے نیچے ہے اتنا زمین پر ہے	کہ یہ اتنا زمیں کے نیچے ہے جتنا زمین پر ہے
" ۱۸۳ " ۱	گردوں	گردن
" ۱۸۴ " ۸	انجس	بے حس
" ۱۸۵ " ۸	تماشا دکھائے	تماشے دکھائے
" ۱۸۶ " ۴	آئیں	آمین
" ۱۸۷ " ۱۱	آج	کہ آج
" ۱۸۸ " ۱	اشک غماز بھی آنکھوں میں جو گھر کرتا ہے	اشک غماز بھی کیا آنکھوں میں گھر کرتا ہے
" ۱۸۹ " ۳	پڑی جھریں	پڑیں جھریں
" " " ۷	بگڑتا	بگڑتا
" ۱۹۰ " ۲	رم جانباز	رم جانانہ
" " " ۱۲	کہتے ہیں حال	کہتی ہے حال
" ۱۹۲ " ۴	جو اور کو تو ہدایت	ہو اور کو تو ہدایت
" ۱۹۳ " ۷	روز وصل میں اور	روز وصل میں لو!
" " ۹	کینہ زور	کینہ ورز (اس غزل کی ترتیب اشعار اکثر غزل میں غلط ہے)
" ۱۹۵ " ۱۲	تار سبحہ زنار کے لئے	تار سبحہ کے زنار کے لئے
" ۱۹۶ " ۳	نکتہ	نقطہ
" " " ۴	بزم غیر	بزم عیش
" ۱۹۷ " ۶	امید انفعال تو ہے	اُمید انفعال تو ہے
" ۲۰۱ " ۲	نہ کہیں	یہ کہیں

حوالہ	غلط	صحیح
غزل ۲۰۱ شعر ۴	دلِ وابستہ احوال	دلِ وابستہ کا احوال
〃 ۲۰۲ 〃 ۹	حُسن گلہ سوز	حُسن گلو سوز
〃 ۲۰۳ 〃 ۵	اُس تو تے شکستہ پائی کی	اُس ٹوٹی شکستہ پائی کی
〃 ۲۰۴ 〃 ۱۱	ذکر و مہر قیامت	ذکر مہر قیامت
〃 ۲۰۵ 〃 ۴	یاد آگیا ز بس کہ مہر وسے مہر وش	یاد آگیا ز بس کوئی مہر و کے مہر وش
〃 〃 〃 ۶	اشک ریزہ	اشک ریز
〃 〃 〃 ۸	کیونکر نجات عاشق ہجراں کو ہو	کیونکر نجات آتشِ ہجراں سے ہو
〃 ۲۰۶ 〃 ۶	اسکی یہ یاد دلاتے ہیں مجھے	اُسکی خود یاد دلاتے ہیں مجھے
〃 ۲۰۷ 〃 ۱۰	اُس دہن کو غنچہ دل کیا کہوں	اُس دہن کو غنچہ اسے دل کیا کہوں
〃 ۲۰۸ 〃 ۲	مہر بیا	مہر نو
〃 〃 〃 ۵	رو کردہ یار کردہ	رم کردہ
〃 ۲۰۹ 〃 ۱۰	صدا	سدا
〃 ۲۱۰ 〃 ۱۰	ویرانہ ہو	ویراں ہوا
〃 ۲۱۱ 〃 ۸	احتراق سہر	احتراق سہرہ
〃 〃 〃 ۱۲	تقدیر	تقریر
〃 ۲۱۲ 〃 ۶	پاس مجبور راز ہے اور شوق بیتابی تو آہ	پاس مجھ قطع آہ اور شوق بیتاب ہے جواب
〃 〃 〃 ۱۳	غیر کے لکھنے کو تو نے کیا	غیر کے خط لکھنے کو تم نے
〃 ۲۱۶ 〃 ۱۹	ستاتے ہو	سُناتے ہو
〃 ۲۱۷ 〃 ۳	قتل آسماں	سیر آسماں

حوالہ	غلط	صحیح
غزل ۱۷ شعر ۲	ہوئے ہو	ہوئے وہ
〃 〃 〃 ۸	زباں کیلئے	زیاں کیلئے
〃 〃 〃 ۱۱	دام قفس	امن قفس
〃 〃 〃 ۱۲	جنون عشق ازل	جنون عشق ازلی
〃 〃 〃 ۱۴	ویرانہ	ویرانی
〃 〃 〃 ۱۸	آغاز کا بد	آغاز بد کا
فردیات - الف	یہ کیونکر چارۂ پند خردمندان ہوش آیا	یہ کیونکر چارۂ پند خردمندان کا ہوش آیا
ن	مضمون قتل ... عتاب میں	مضمون بسمل ... عتاب میں
〃	بے داور ہم دیکھیں	بہ طور ہم دیکھیں
ہ	مری نظروں میں پھرتا ہے وہ شاہ آباد کا نقشہ	مری نظروں میں ہے شاہ جہان آباد کا نقشہ
ی	دیکھ اثر ہو جائے	کچھ اثر ہو جائے



نوٹ - جزوی اغلاط یا معمولی اختلافات نسخ جن سے معنی یا وزن میں فرق نہیں آتا یہاں درج نہیں کئے گئے۔

مقدمہ

تمہید

مایۂ مہر و محبت از رواج افتادہ بود
صحبتِ ما روز بازارِ وفا را گرم ساخت

یہ بات نفسیاتِ انسانی میں داخل ہے کہ جب ہم محفل میں کسی واعظ یا خطیب کا بیان سنتے ہیں تو ہماری خواہش یہ ہوتی ہے کہ اُس کے چہرے مہرے، خد و خال اعضاء کی حرکات و سکنات کو بھی دیکھتے رہیں جس سے بیان میں دلچسپی پیدا ہو اور مطالب کے سمجھنے میں مدد ملے۔ یہی حال تصانیف کا ہے۔ تصنیف کو پڑھ کر قصداً صاحبِ تصنیف کے حالات دریافت کرنے کا جذبہ بروے کار آتا ہے جب تک اس جذبۂ شوق کی تسکین نہیں ہوتی ہمارا مطالعہ ناقص رہتا ہے۔ مصنف کون تھا۔ کس عہد اور کس مقام سے تعلق رکھتا تھا۔ کس ماحول میں پرورش پائی تھی اور کن معمولات و معتقدات سے متاثر تھا۔ یہ اور اسی قبیل کے سوالات لامحالہ اس موقع پر پیدا ہوتے ہیں جن کا حل تصنیف کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اسی نقطۂ خیال کو مدنظر رکھ کر ضروری معلوم ہوا کہ کلام مومن کی خصوصیات بیان کرنے سے پیشتر خود مومن کے سوانحِ زندگی اجمالاً عرض کر دیے جائیں۔

حکیم مومن خاں

سرگذشتِ عہدِ گل را از نظیری بشنوید + عندلیبِ آشفتہ تر گفت است ایں افسانہ را

خاندان۔ ولادت۔ نام۔ مومن کے والد حکیم غلام نبی خاں ولد حکیم نامدار خاں جن کی اصل نجبائے کشمیر سے تھی شہر دہلی کے شرفا میں سے تھے۔ حکیم نامدار خاں اور حکیم کامدار خاں دو بھائی سلطنتِ مغلیہ کے آخری دور میں شاہی طبیبوں میں داخل ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تیموری

حکومت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا مگر پھر بھی بڈھوں کی بڑی باتیں۔ چنانچہ شاہ عالم کی سرکار سے پرگنہ نارنول میں جاگیر عطا ہوئی لیکن آخر میں نواب فیض طلب خاں نے ان کی جاگیر ضبط کر کے ہزار روپیہ سالانہ پنشن حکیم نامدار خاں کے وارثوں کے نام مقرر کر دی۔ زمانہ کی بوالعجبی اور دہر کی نیرنگی میں عقل کام نہیں کرتی۔ عین اسوقت جبکہ حکومت مغلیہ کے گلزار پر خزاں آ رہی تھی۔ اردو شاعری کا گلشن بہار پہ تھا۔ اس پُر آشوب دور میں بلبل گلستان شیوا بیانی طوطی بوستانِ سخندانی فخر شعرائے دوراں امام الشعراء حکیم محمد مومن خاں نے اس "جہانِ خراب" میں قدم رکھا اور اپنے ترانوں سے دلی کے "اجڑے دیار" کو نغمہ زار بنا دیا۔

(ان کی ولادت کوچہ چیلان میں ۱۲۱۵ھ میں واقع ہوئی۔ جب یہ پیدا ہوئے تو انکے والد جو رئیس المحدثین حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی سے کمال عقیدت رکھتے تھے شاہ صاحب کو لے آئے۔ انھوں نے ان کے کان میں اذان دی اور محمد مومن نام رکھا۔ اسی اعتبار سے بعد کو مومن تخلص ہوا۔ گھر والوں نے حبیب اللہ نام رکھا مگر شاہ صاحب کا تجویز کردہ نام ہی مقبول ہوا۔

تعلیم: بچپن کی تعلیم کے بعد حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے۔ حافظہ اور ذہن خداداد تھا۔ اکثر حضرت شاہ عبدالعزیز کی مجلس وعظ میں حاضر ہوتے اور تمام مطالب و نکات از بر سنا دیتے۔ فہم و ذہانت[1] میں وہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور اپنے خسر خواجہ محمد نصیر نبیسہ میر درد کے سوا کسی ہم عصر کو اپنا مد مقابل نہ مانتے تھے۔ عربی میں کامل استعداد حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اپنے والد اور چچا حکیم غلام حیدر خاں اور غلام حسن خاں سے طب پڑھی اور انھیں کے مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے۔ نجوم اہل فن[2] سے سیکھا اور اس میں اسقدر دستگاہ بہم پہنچائی کہ ان کے احکام سے لوگ حیران رہ جاتے

[1] ملاحظہ ہو آب حیات مولی بخش قلق کا واقعہ۔ [2] آب حیات۔

تھے۔ ایک شعر میں اپنی نجوم دانی کو عجیب اسلوب سے ظاہر کرتے ہیں۔

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

رمل[۵۳] میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے اور شہر کے متعدد شرفا اس فن میں اُن کے شاگرد تھے علاوہ بریں ریاضی[۵۴] میں بھی اُن کو مہارت تامّہ حاصل تھی اور خواجہ محمد نصیر کے سوا اس میں کوئی اُن کا ہم پلّہ نہ تھا۔

علمی اور دیگر مشاغل۔ نجوم و رمل میں اُن کے توغّل اور مہارت کے واقعات برابر تذکروں میں ملتے ہیں۔ شطرنج سے ان کو کمال مناسبت تھی اور نہایت انہماک سے کھیلتے تھے، آزاد نے لکھا ہے کہ وہ دلّی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے اور شہر کے ایک دو شاطروں کے سوا کسی سے کم نہ تھے۔ وہ اکثر مولانا فضل حق کو شطرنج میں مات دیتے تھے۔ مرزا غالب نے مولانا سے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے کہا کہ مومن بھیڑیا ہے جسے اپنی قوت کی خبر نہیں۔ اگر وہ عشق و عاشقی کے قصّوں کو چھوڑ کر علمی مشغلے میں پڑتا تو اُس کے ذہن کی حقیقت معلوم ہوتی (ارواح ثلٰثہ) محترمہ کنیز فاطمہ صاحبہ اپنے والد سید ناصر حبیب صاحب ناصر دہلوی نبیرۂ مومن کے حوالہ سے بیان کرتی ہیں کہ مومن مرحوم کی رنگین مزاجی نے موسیقی کے فن لطیف کی طرف توجہ کی تو وہ نام پیدا کیا کہ لوگ اُن کے کمال کے معترف ہو گئے۔ نظیر[۵۵] بین باز نے جو اُس زمانہ میں اُستاد تھا اُن کے انتقال پر بین اُٹھا کر رکھ دی کہ اب دلّی میں کوئی اس کا قدر دان نہیں رہا۔ بعض تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ فن عملیات میں بھی دخل تھا۔ اُن[۵۶] کے

---

۵۳ ملاحظہ ہو رسالہ اُردو بابت اکتوبر ۱۹۳۶ء حکیم سکھانند شاگرد مومن کا قصّہ۔

۵۴ منقول از گرامی نامہ سید ناصر حبیب صاحب دہلوی بنام راقم الحروف۔

۵۵ غالباً صحیح نام میر ناصر احمد ہے جو مشہور بین باز اور خواجہ محمد نصیر کے مرید تھے۔ (میخانۂ درد) ۵۶ ملاحظہ ہو قصیدۂ نعت۔

کلام سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

شاعری[۴] اور تلامذہ ۔ اگرچہ انھوں نے دوسرے علوم و فنون کی طرح شاعری کو بھی پیشہ یا کسبِ معاش کا ذریعہ نہیں بنایا تاہم شاعری جس سے اُن کی عاشق مزاج طبیعت کو خاص لگاؤ تھا اُن کے کمالات پر غالب آگئی ۔ شروع میں شاہ نصیر کو کلام دکھایا مگر پھر اصلاح لینی چھوڑ دی ۔ ان کے مشہور شاگرد نواب محمد مصطفٰے خاں شیفتہ نواب محمد اکبر خاں اکبر ۔ نواب اصغر علی خاں نسیم امیر حسین تسکین ۔ میر عبدالرحمن آہی ۔ حکیم منور علی آشفتہ ۔ مرزا قربان علی بیگ سالک ۔ شاہزادہ مرزا خدا بخش قیصر ۔ غلام علی خاں وحشت ۔ امۃ الفاطمہ بیگم المتخلصہ صاحب ۔ اور خیرالدین یاس تھے ۔ "غزل دردناک آواز سے دلپذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے" اُردو کے باکمال اُستاد اور صاحبِ طرز ہونے کے علاوہ فارسی نظم و نثر پر بھی یکساں قدرت رکھتے تھے ۔ اُن کی تصانیف میں کلیات اُردو کلیات فارسی ۔ انشائے فارسی ۔ اس وقت تک موجود اور اربابِ سخن کے لیے شمع راہ ہیں بعض رسائل طب وغیرہ پر بھی لکھے تھے مگر اب نایاب ہیں ۔

معاش[۵] ۔ جو پنشن حکیم نامدار خاں کے وارثوں کے نام ہوئی تھی اس میں سے مومن خاں نے بھی اپنا حصہ پایا تھا ۔ اُس کے علاوہ کچھ پنشن سرکار انگریزی سے بھی ملتی تھی ۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اُن کی آزاد اور مستغنی طبیعت نے شاعری یا طبابت وغیرہ کو ذریعہ معاش کبھی نہیں بنایا جو دلّی میں میسر تھا ہمیشہ اُسی پر قناعت کی اگرچہ بعض ضرورتوں سے چار پانچ مرتبہ دلّی سے باہر نکلے اور جہانگیر آباد ۔ بدایوں ۔ سہسوان[۶] ۔ رامپور اور سہارنپور گئے ۔ اس استغنا کے باوجود امیرانہ انداز سے بسر کرتے تھے ۔

تاہل[۷] اور اولاد ۔ مومن کی شادی دہلی کے نامور خاندانِ ارشاد و ہدایت یعنی خواجہ

ﮯ۵ از حیات مومن مرتبہ عرش گیاوی ۔ ﮯ۶ حکیم مومن خاں بغرض ملاقات نواب محمد سعید خاں بہادر ڈپٹی کلکٹر سہسوان بعدہ والی رامپور وارد سہسوان (ضلع بدایوں) ہوئے تھے اور وہیں مولانا سید شاہ آل حسین نقوی کی خدمت میں بھی حاضر ہو کر معتقدانہ مستفید ہوئے (حیات العلماء)

میر درد کے گھرانے میں ہوئی تھی۔ اُن کے خسر خواجہ محمد نصیر خواجہ میر درد کے نواسے اور اُنکی خوشدامن میر درد کی پوتی تھیں۔ خواجہ محمد نصیر رنج ولد میر کلّو اکبر آبادی)۔ زینت النساء بیگم بنت خواجہ میر درد کے بطن سے ہیں)۔ موسیقی و ریاضی وغیرہ میں کامل تھے اور مومن اُنکے کمال کے معترف تھے۔ خواجہ محمد نصیر کی دوسری بیوی سے دو صاحبزادیاں) ہوئیں۔ انجمن النساء بیگم (انجم النساء بیگم ؟) اور اشرف النساء بیگم۔ اول الذکر بڑی لڑکی، مومن کے عقد نکاح میں آئیں (ماخوذ از میخانۂ درد) اُن کی اولاد میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی یادگار رہے۔ بیٹے کا نام احمد نصیر خاں تھا اُن کے فرزند محمد نصیر اور صاحبزادی عزیز بیگم موجود ہیں)۔ مومن مرحوم کی بیٹی محمدی بیگم کا عقد مولوی عبدالغنی وکیل سیتا پور سے ہوا غالباً یہ وہی صاحبزادی ہیں جن کی تاریخ ولادت مومن نے اس طرح کہی تھی۔

سال گھٹنے کے ساتھ ہاتف نے
کہی تاریخ دخترِ مومن

۱۳۴۰ - ۸۱ = ۱۲۵۹ھ

اُن کا انتقال سنہ ۱۲۹۲ھ میں ہوا۔ اُن کی اولاد میں سید ناصر حبیب صاحب ہیں جنھوں نے اور جن کی دختر نیک اختر کنیز فاطمہ بیگم صاحبہ نے حالات مومن کے فراہم کرنے میں راقم الحروف کی گرانقدر امداد فرمائی۔

وضعِ و انداز۔ مومن کا طرزِ بود و باند، شکل و صورت۔ وضع و لباس معلوم کرنا ہو تو اُن کی وہ تصویر دیکھئے جو مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے قلم جادو رقم سے الفاظ میں کھینچی ہے۔ پڑھئے اور لطف اُٹھائیے "حکیم آغا خاں کے چھتے کے سامنے خاں صاحب کا مکان تھا۔ بڑا دروازہ ہے۔ اندر بہت وسیع صحن اور اسکے چاروں طرف عمارت ہے۔ دو طرف دو صحنچیاں ہیں اور سامنے بڑے بڑے دالان در دالان پہلے دالان کے اوپر کمرہ ہے۔ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرے کا صحن کر دیا ہے

لیکن مونڈھیر بہت چھوٹی رکھی ہے۔ دالانوں میں چاندنی کا فرش ہے۔ اندر کے
دالان میں بیچوں بیچ قالین بچھا ہوا۔ قالین پر گاؤ تکیے سے لگے حکیم صاحب بیٹھے
ہیں۔ سامنے حکیم سکھانند المتخلص بہ رقم اور مرزا رحیم الدین حیا مؤدب دو زانو
بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار ہو رہا ہے کہ کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور
اور بلا ضرورت بولنے کا یارا نہیں۔ حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً چالیس سال
کی تھی۔ کشیدہ قامت۔ سرخ و سفید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی۔ بڑی بڑی
روشن آنکھیں۔ لمبی لمبی پلکیں۔ کھنچی ہوئی بھویں۔ لمبی ستواں ناک۔ پتلے پتلے ہونٹ
ان پر پان کا لاکھا جما ہوا۔ مسی آلودہ دانت۔ ہلکی ہلکی مونچھیں۔ خشخشی داڑھی
بھرے بھرے ڈنڈ۔ پتلی کمر۔ چوڑا سینہ۔ اور لمبی انگلیاں۔ سر پر گھونگھر والے لمبے
لمبے بال کاکلوں کی شکل میں کچھ تو پشت پر اور کچھ کندھوں پر پڑے ہوئے۔
کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیا تھا۔ بدن پر شربتی
ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا۔ لیکن اس کے نیچے کرتہ نہ تھا۔ اور جسم کا بیشتر حصہ
انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ اس میں
چھوٹا سا سنہری تعویذ۔ کاکریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا
تھا اور اس کے دونوں کونے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا [illegible]
پاؤں میں سرخ گلبدن کا پاجامہ۔ مہریوں پر سے تنگ۔ اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا
کبھی کبھی ایک برکا پاجامہ بھی پہنتے تھے۔ مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ [illegible]
قیمتی ہوتا تھا۔ چوڑا سرخ نیفہ۔ انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئی [illegible]
رہتی تھیں کبھی پلٹ کر چڑھا لیتے تھے۔ سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی [illegible]
کنارے پر باریک لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آتی تھی۔
اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔ غرض [illegible]

خوش پوشاک اور جامہ زیب آدمی تھے۔

عادات و اخلاق۔ مومن رنگین طبع اور رنگین مزاج تھے۔ شباب کی جنون انگیزیاں اور ولولہ خیزیاں کون نہیں جانتا۔ ایک مرتبہ میرے ایک ذی علم دوست نے اکبر مرحوم سے اُن کی لائف مرتب کرنے کے لیے کچھ حالات مانگے جس پر انھوں نے بیساختہ یہ جواب دیا۔

میری لائف لکھو ایام جوانی کے سوا
سب بتادونگا تمھیں افتدوائی کے سوا

مومن جیسی طبیعت والے انسان کو بھی افتدوائی والے واقعات سے کام پڑنا ناگزیر تھا مگر جوانی ہی میں سید احمد صاحب بریلوی سے بیعت کرلی اور اس کے بعد صلاح و تقویٰ میں زندگی گزار دی۔ تاہم بقول ناصر صاحب بہت خوش اخلاق اور نہایت ظریف تھے۔ زاہد خشک نہ تھے۔

خودداری اور استغنا کا یہ حال تھا کہ کسی سے طلب کرنا یا احسان لینا گوارا نہ تھا۔ مدح کو ہمیشہ گداگری اور ہجو کو دنی الطبعی سمجھا کئے۔ فارسی اور اردو میں متعدد قصیدے لکھے مگر حمد و نعت و منقبت کے سوا اہل دنیا کی تعریف سے اپنی زبان کو ملوث نہیں کیا۔ مدح تو درکنار وہ کسی کو ہجو کا اہل بھی نہ سمجھتے تھے۔ اسی بے نیازی اور آزادہ روی کی بدولت انھوں نے رامپور۔ ٹونک۔ بھوپال۔ جہانگیر آباد۔ کپورتھلا[1] کی ریاستوں کی دعوت قبول نہ کی اور ملازمت کے علائق میں پھنسنا گوارا نہ کیا۔ سر ٹامسن نے چاہا کہ انکو سررشتہ تعلیم میں سو روپئے مقرر کرکے اپنے ساتھ لیجائیں مگر اُن کے دل نے

---

[1] آب حیات میں مہاراجہ کپورتھلا کی دعوت اور مومن کے استغنا کے سلسلے میں جس روپئے کا حوالہ ہے اُس سے مراد میر ناصر احمد ہیں کہ مہاراجہ تھا لی سو روپئے کے مشاہرے پر دہلی سے اپنے یہاں لیگئے تھے۔ (احتشام دہ)

نہ مانا کہ دلی کو اتنا سستا نہ بیچ ڈالیں"۔ طبیعت میں نازک خیالی کے ساتھ نازک مزاجی غالب تھی۔

مذہب: جس ماحول میں انھوں نے پرورش پائی اُس کا اقتضا یہ تھا کہ انکو مذہب سے خاص شغف ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ شاہ صاحب کے علمی اور مذہبی خاندان سے اُن کے تعلقات رہے۔ خود مولوی محمد اسمٰعیل اُن کے ہم صحبت و ہم جلیسہ تھے۔ اس لئے اگر مومن اُن کے ہم خیال تھے تو تعجب کی بات نہیں۔ تاہم اُن کی طرح متشدد اور متقشف نہ تھے۔ متعدد تذکرے متفق ہیں اور خود اُن کے اشعار مؤید ہیں کہ وہ ہمیشہ عمل بالحدیث کے قائل اور کتاب و سنت پر عامل رہے۔ اب اختیار ہے کہ اُن کو جو چاہو کہو۔ مقلدین اور شیعہ پر اکثر اشعار میں چوٹ بھی کر گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

یہ کچھ رہ سنت نہ طریق توحید — پھر کیا ہے ضرور سب کی یکساں تمہید
ہم سمجھے ہیں معنی حقیقی یعنی — حیواں ہیں حقیقت میں یہ اہل تقلید

اور شیعہ: منہ کو مومن سے چھپانا کافر — یہ تقیہ تو نہ بھایا مجھ کو

صوفیوں کی تردید میں ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

مومن ہے اگرچہ سب اُسی کا یہ ظہور — توحید وجودی کا نہ کرنا مذکور
یعنی کہ بنائے ہیں خدا نے بندے — بندے کو خدا بنائے کس کا مقدور

سید احمد صاحب رائے بریلوی ایک بزرگ تھے جو اتقی محض مگر پابند شریعت تھے مولوی محمد اسمٰعیل نے اُن کی امامت تسلیم کی اور اُن کی سرکردگی میں کفار سے جہاد کیا مومن نے بھی[ملحقہ] سید صاحب سے بیعت جہاد کی تھی اور مثنوی جہادیہ لکھی تھی۔ اگرچہ عملی شرکت کا کوئی موقع نہ ملا تاہم مومن خاں آخر وقت تک انھیں کے معتقد رہے۔

ملحقہ: صاحب سوانح احمدی کا بیان ہے کہ مومن نے مولوی ولایت علی عظیم آبادی خلیفہ سید صاحب سے بیعت کی تھی۔

مولانا فضل حق خیرآبادی سے مراسم تھے۔ تاہم اختلاف عقائد کی بنا پر بحث ہو جاتی تھی۔ ایک بار دونوں میں مناظرہ ہوا۔ مومن غالب رہے۔ چونکہ مزاج مکدر ہو گیا تھا اس لئے یہ شعر کہہ کر چل دئے۔

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں :: مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

(مولانا فرقتی اور آرزو تخلص کرتے تھے) پھر مولانا خود منانے کو گئے اور بالآخر صلح ہو گئی جس پر مومن نے یہ شعر پڑھا۔

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم :: پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

(اردوئے معلیٰ)

اسی کے ساتھ یہ ملحوظ رہے کہ بزرگان دین کی عقیدت و محبت کو وہ ہمیشہ جزو ایمان سمجھتے تھے اگر ان کے والہانہ جوش مذہب کا نمونہ دیکھنا ہو تو ان کے قصائد نعت و منقبت ملاحظہ ہوں۔

وفات و مدفن۔ حکیم صاحب نے ۱۲۶۸ھ میں کوٹھے سے گر کر مہینے کے بعد انتقال کیا جیسا کہ خود حکم لگایا تھا۔ ۵۳ سال کی عمر پائی۔ گرنے کی تاریخ خود کہی تھی۔ "بشکست دست و بازو"۔ انتقال کی تاریخ ان کے شاگرد آہی نے کہی "ماتم مومن خاں"۔ مزار زیر احاطہ دیوار مقبرہ شاہ عبد العزیز باہر کی سمت بجانب ... واقع ہے۔ مرزا غالب نے ان کے انتقال پر یہ رباعی کہی۔

شرطست کہ روے دل خراشم ہمہ عمر   خونابہ بہ رخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگ مومن   چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

؎ حال میں پروفیسر سید احمد علی دہلوی کے اہتمام سے مومن کی قبر پختہ بن گئی اور کتبہ نصب ہو گیا ہے۔

کلام مومن

تصنیفِ عشق معنی و ترکیب دیگر است
ما شرحِ نکتۂ زصد افسانہ می کنیم

مومن کی جامعیت علوم و فنون اور قدرت نظم و نثر اردو و فارسی کا اقتضا تو یہ تھا کہ ملک کے اہل قلم اس باکمال استاد فن کے کمالات کو تمام دل و عرض ہند میں ادا کرتے مگر بعض وجوہ[1] سے ایسا نہ ہوسکا اور مومن کی روح آج بھی زبان حال سے اس طرح شکوہ سنج نظر آتی ہے کہ یوسف درنگ[؟]را بہ کلاوۂ پیرزال نمی خرند واز چاہ کنعانی بسیم قلب ہم نمی برند۔ با اعجاز ید بیضا تہی دستم و با دم عیسوی آزار پرستم۔[2] بارے بعض دردمند خادمان اردو کی مساعی قدرے بار آور ہوئیں اور ملک کے جمود میں کمی آئی۔ اگرچہ ایسی اوس سے پیاس نہیں بجھتی تاہم غنیمت ہے کہ اب ارباب قلم اس طرف اعتنا کرنے لگے ہیں۔

فقیر کو خدمت اردو کا دعویٰ نہیں۔ پھر بھی اپنی بساط کے موافق لکھتا[3] لکھاتا اور اساطین ادب کو توجہ دلاتا رہا ہے۔ آج کی صحبت میں قصد ہے کہ مومن کے تمام اصناف شعر پر اجمالاً اور غزل پر تفصیلاً روشنی ڈالی جائے۔

مومن کی کلیات اردو جو اس وقت مابہ البحث ہے۔ تمام اصناف سخن پر

---

[1] ملاحظہ ہو مومن کی عدم مقبولیت کے اسباب۔ [2] انشائے فارسی مومن۔ [3] ملاحظہ ہوں قصائد مومن و تبصرۂ راقم۔ در رسائل اردو والناظر و ہمایوں وغیرہ۔ اس مقدمے میں اپنے سابق مقالات مطبوعہ رسائل مذکورہ سے بھی بعد تلخیص

مشتمل ہے۔ موضوع کے اعتبار سے دیکھو تو مدح - تغزل - واسوخت - مرثیہ - داستان - اور ساخت کے لحاظ سے غور کرو تو قصیدہ غزل - فرد - قطعہ - رباعی - مستزاد - مسمط - ترجیع بند - ترکیب بند - مثنوی - غرض کون رنگ ہے جو اس چمن میں نہیں - اُن کے معاصرین تو درکنار تمام اساتذہ اُردو میں صرف گنتی کے افراد نکلیں گے جن کے یہاں قدرت کلام کے ساتھ اس قدر ہمہ گیری ہو - البتہ اس کا افسوس ہے کہ ذوق و غالب کی طرح ان کے کلام پر کاٹ چھانٹ کا عمل نہ کیا گیا ورنہ یہ چند خار بھی جو اس گلزار پر بہار میں کہیں کہیں دامن سے اُلجھتے ہیں ہرگز نظر نہ آتے۔ موجودہ مجموعہ اشعار جو اس وقت دستیاب ہوتا ہے وہ ہے جو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے مرتبہ نسخہ سے مومن کے شاگرد اور عزیز عبدالرحمٰن آہی خلف میر حسین تسکین نے صاف کرکے اور بعد کا کلام شامل کرکے مومن کے مرض الموت میں اُن کو سنایا تھا ظاہر ہے کہ اس بے اطمینانی کے عالم میں ترتیب و تہذیب اشعار پر کما حقہ توجہ کیونکر ممکن تھی - پھر بھی یہ اُنکی قدرت کلام اور زور کمال کا نتیجہ ہے کہ آج دوسرے ہمعصر اساتذہ کے برخلاف وہ صاحب طرز اُستاد تسلیم کئے جاتے ہیں - اسکی مفصل بحث تو غزل کے عنوان کے ماتحت آئے گی - سردست اُن کی ہر صنف شعر کی بابت جس ترتیب سے کہ کلیات میں پائی جاتی ہے چند خیالات ظاہر کئے جاتے ہیں

الف - خصوصیات اصناف کلام

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

(۱) قصائد

اُردو کی مطبوعہ کلیات میں ۹ قصیدے ہیں اگرچہ بعض مطبوعہ دیوانوں

اور ریاست رامپور کے قلمی نسخے میں سرے سے کوئی قصیدہ نہیں۔ اس اختلاف کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آخر الذکر اُن کی صحت کے زمانہ میں مرتب کیے گئے ہیں۔ جبکہ ہنوز آں قلزم فیض در روانی وآں ابر رحمت در گہر فشانی بود" یا اُن کی نقل در نقل ہیں۔ اس کے برخلاف اول الذکر کی ترتیب و تدوین اُن کے مرض وفات میں ہوئی۔ قصائد کی بابت یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ان میں سے کوئی ارباب دُنیا کی مدح میں بہ اُمید صلہ نہیں لکھا گیا۔ آج کل جبکہ ہر خورد وکلاں کم وبیش نشۂ حریت سے سرشار ہے اور قصیدہ نگاری کا افادی پہلو بھی تقریباً مفقود ہے اگر کوئی شخص اپنی خودداری کی آن قائم رکھے تو تعجب نہیں۔ مگر غدر سے پہلے کہ قلعہ دہلی میں تیموری و بابری خاندان کی آخری شمع ٹمٹما رہی تھی صورت حالات مختلف تھی اُن حالات میں مومن کا استغنا دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ذوق غریب سے جن کی تمام عمر لابہ گری اور یاد خوانی میں بسر ہوئی کوئی کیا توقع کرے کہ غلامانہ ذہنیت ہمیشہ ایسے ہی نتائج پیدا کرتی ہے۔ افسوس تو غالب پر ہے جو نسبتاً خوددار و غیور تھے۔ مگر عمر بھر نہ صرف اُمرائے اسلام بلکہ انگریز حکام کی چاپلوسی کو طغرائے امتیاز سمجھتے رہے۔ اگر ایک "الہامی کتاب" کا سرمایہ کمال یہی مضامین ہیں تو وائے برجان شاعری۔ اس سے بڑھکر تاسف اُن اہل قلم پر ہے جو اس قسم کی متاع کاسد کے ہوتے ہوئے مرزا صاحب کے کلام کو سرمایہ حریت وطن اور صحیفہ آزادی ملک قرار دیتے ہیں۔[۶۴]

اس کے برخلاف مومن کے یہاں ایسے خیالات کی کمی نہیں جو اُن کے

---

[۶۴] دیباچہ ڈاکٹر محمود بر دیوان غالب دیکھیے۔

ورد قوم و ملت کے یقیناً آئینہ دار ہیں۔ جو شخص اُردو میں مثنوی جہادیہ اس طرح لکھ سکتا ہو کہ

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب   یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں   مری جاں فدا ہو تری راہ میں
میں گنجِ شہیداں میں مسرور ہوں   اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

اور فارسی کے قصیدہ نعت یوں استغاثہ کر سکتا ہو کہ

ایں عیسویاں بلب رسانند   جان من و جان آفرینش
نکشود گرہ زکار و فرسود   ناخن کہ بنان آفرینش
تا چند بہ خواب ناز باشی   فارغ ز فغان آفرینش
برخیز کہ شور کفر برخاست   اے فتنہ نشان آفرینش

اُس کے یہاں جذبات حریت کی فراوانی نہ ہو گی تو کس کے یہاں ہو گی۔ تاہم اُن کے قصائد اُردو میں یہ خیالات مستقلاً نہیں ملتے۔ البتہ ایک چیز جو قصائد کا امتیازی وصف ہے ہر جگہ نمایاں ہے یعنی حُسن عقیدت و جوش محبت جس سے ایمان تازہ اور دل شگفتہ ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوش اعتقاد کا دریا ہے کہ اُمڈا چلا آرہا ہے۔ اُنھوں نے جس مذہبی ماحول میں تربیت پائی تھی اُس کا نتیجہ حتماً یہی ہونا چاہئے تھا۔ اوپر عرض کیا گیا کہ اُن میں زاہدان خشک کی سی سختی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام و اہلبیت عظام رضی اللہ عنہم کی نعت و منقبت میں فرط عقیدت اور جوش محبت کا اوقیانوس لہریں مارتا نظر آتا ہے۔ البتہ اسی کے ساتھ بعض جگہ وہ دوسروں پر مذہبی نوک جھوک بھی کر جاتے ہیں جو اُن کی شایان شان نہیں معلوم ہوتی

نعت و منقبت کے علاوہ صرف دو قصیدے ہیں جو ارباب دنیا کی مدح کہے جا سکتے ہیں لیکن اُن کی حقیقت یہ ہے کہ اُن میں سے ایک نواب وزیرالدولہ رئیس ٹونک کی شان میں (جن سے مومن کو روحانی نسبت بھی تھی) تحریر کیا ہے اور حاضری دربار سے معذرت کی ہے۔ دوسرا راجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ (مقیم دہلی کے شکریہ میں لکھا ہے جنھوں نے ان کو خود بلا کر انعام و اکرام سے سرفراز کیا تھا۔

قصائد کی ترتیب حسب ذیل ہے۔(۱) حمد۔(۲) نعت۔(۳) منقبت حضرت ابوبکر صدیقؓ (۴) منقبت حضرت عمرؓ فاروق (۵) منقبت حضرت عثمان ذی النورینؓ (۶) منقبت حضرت علی مرتضیٰؓ (۷) منقبت حضرت حسن مجتبیٰؓ (۸) مدح وزیرالدولہ امیرالملک نواب محمد وزیر خاں نصرت جنگ والی ریاست ٹونک۔ (۹) مدح راجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ۔

مومن سے پہلے جس قدر شعرا گذرے ہیں قصیدہ میں (بہ استثنائے سودا) اُن کا کوئی ہمسر نہیں۔ اگرچہ پختگی اور صفائی میں قصائد ذوق کا پایہ کہیں برتر ہے تاہم زور اور ندرت میں مومن کا جواب نہیں۔ اُن کی تشبیب عموماً نادر اور پرلطف ہوتی ہے۔ تشبیب میں شعرائے سلف بالعموم بہاریہ مضامین یا مناظرے وغیرہ سے ابتدا کرتے تھے۔ مومن نے تشبیب کو اس کے حقیقی معنی میں منحصر کر دیا۔ گویا اُن کی تشبیب میں سرتاپا تغزل کی شان نظر آتی ہے۔

مثلاً قصیدہ (۴) میں لکھتے ہیں۔ دل ابکی بار ہوا ایسی بت جگر مائل + کہ جان کو بھی ٹھکانے لگا گئے کا دل

فغاں کہ دلبر خود کام سے پڑا مجھے کام + حصول کار ہے بیکار سعی ہے باطل

یا قصیدہ (۵) میں۔ نیکنامی نہ سہی مجھکو ہے تم سے سرکار + چھوڑ دوں آج وفا گر ہو وفا سے بیزار

یا قصیدہ (۷) میں - چاہتا خلق کو صہبا و صنم سے محروم + ایسی نیت پہ بہشت آپ کو وا شدہ حرام

اسی کے ساتھ ہر قصیدہ میں تعلّی اور شکایت زمانہ کہ سنت الشعراء ہے اس شکوہ و زور کے ساتھ پائی جاتی ہے کہ عرفی کا دھوکا ہوتا ہے۔ ایک آدھ قصیدے کے سوا کوئی اس رنگ سے خالی نہیں۔ چند شعر مثال میں لکھے جاتے ہیں۔

ملے ہیں خاک میں کیا کیا مرے علوم و فنون ۔۔۔ خدا کسی کو نہ دے ایسے طالعِ منکوس

شہا کسی نے نہ دی یاں مرے ہنر کی داد ۔۔۔ کہ نکتہ فہم نہ تھا ایک سرو باذل

وحید عصر ہوں میں عقل اولیں ہے گواہ ۔۔۔ فرید دہر ہوں میں صفحۂ زماں ہے سجل

یہی صلہ یہی ممدوح مجھکو زیبا تھا ۔۔۔ یہی سخن یہی مداح تھا ترے قابل

نہ ہنر کی مرے پرسش نہ سخن کی مرے قدر ۔۔۔ نہ گہر کی مرے ارزش نہ طلا کی معیار

کٹتی ہے میری تیغ زباں سے زبانِ تیغ ۔۔۔ کیونکر سخن فروش ہوں سوداگرانِ تیغ

مہرِ افلاک عقل و دانش ہوں ۔۔۔ فطرتی ہے مری درخشانی

نسرِ طائر کو سمجھے ہے بے پر ۔۔۔ مرغِ فکرت کی بال جنبانی

میرے گوہر تمام ناسفتہ ۔۔۔ میرے یاقوت سب بدخشانی

البتہ تخلص یا گریز کہیں کہیں کمزور ہے۔ جس سے تکلف و تصنع ٹپکتا ہے اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بات میں بات نکل آئی ہے۔ مثلاً

قصیدہ (۵) اے صنم چاہیئے مومن کی فراست سے حذر + کیا نہیں تو نے سنا قصہ شاہ ابرار

قصیدہ (۷) سبزہ رنگی نے تری قتل کیا ہے ظالم + یاد آتا ہے مجھے حال امام مسموم

بزرگان دین کے ساتھ والہانہ عقیدت کے پہلو بہ پہلو مخالفوں پر طعن بھی کر جاتے ہیں جو ایک ایسے شاعر کے لئے نازیبا ہے جس کا کلام پبلک کے سامنے پیش ہو مثلاً قصیدہ (۴) میں

وہ شوخ بے سبب آزار و بیگنہ خونریز ۔۔۔ کہ جرم قاتلِ عثمانؓ کا نہ ہو قائل

وہ نکتہ داں کہ تقیہ کو اصلِ دیں کہتا — وہم شکایتِ عاشق نہ ہو جفا سے خجل
وہ دور بیں کہ خدا پر کرے بدا ثابت — نہیں ہے غیر زبس اعتماد کے قابل
وہ فتنہ گر بہ حقِ ناشناس نا انصاف — جو فرضِ عین گنے کینِ داورِ عادل

مومن کو متعدد علوم میں دستگاہ حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں بلا قصد علمی اصطلاحات آجاتی ہیں جو قصیدہ کے شکوہ کے لئے تو مناسب ہیں مگر اغلاقِ کلام کی بڑے حد تک ذمہ دار ہیں۔ قصیدہ نعت کے آخر میں فرماتے ہیں

حکیم وہ ہوں کہ جاتے رہیں حواس اگر — کرے معارضۂ سرِ دفترِ عقول و نفوس
طبیب وہ ہوں کہ ہو سوزِ سینۂ بلبل — نظارۂ رخِ گلفام سے مجھے محسوس
جو ہوں معالجِ سیلوں تو قابضِ ارواح — کرے دعائے رواجِ طریقِ جالینوس
درم ہو چارہ گرِ قبض تا بدستِ لئیم — کیا ہو میں نے جو تجویز وزنِ مقرِ فلوس
کروں جو گردشِ انجم کی میں رصد بندی — فدا ہو وجد میں آ کر روانِ بطلیموس
گواہ عصمتِ مریم ہو کثرتِ اولاد — عقیمہ مجھ سے سنے گر بیانِ شکلِ عروس
طلسم ماہ لکھوں گر پئے زباں بستن — بنائے مہرِ دہن ہیچ نکتۂ جاسوس
یقیں کہ زہرہ و خورشید میں مقابلہ ہو — پڑھوں جو میں پئے دوری عطارد ابلیوس
(قصیدہ ۴) جو شمسہ قصر اس کا ہو تو ہندسہ داں — کریں نہ مدخلِ ظل سے تمیزِ مخرجِ ظل
رواجِ حسنِ عمل تیرے دور میں یہ ہوا — کہ گفتگو میں بھی مرفوع ہو گیا فاعل
وہ اوجِ حشم ترا صوفیوں نے دیکھا ہے — جبھی تجددِ امثال کے ہوئے قائل
(قصیدہ ۵) میرے اقبال کا آ جائے اگر دور قریب — تو ثوابت سے گراں تر ہوں نجومِ سیار
ذروۂ اوج سے برجیس کو رجعت ہو جائے — ثور میں زہرہ کرے سعد کے قراں سے انکار
نحوست اپنی ہے تو تربیع و تقابل کے سوا — بھول جائیں گے منجم جو ہیں باقی انظار

کہیں کہیں تلمیحات یا آیات واحادیث کی طرف اشارات بھی ہیں جن
بعض ضمنی ہونے کی وجہ سے بعید الفہم ہوگئے ہیں مثلاً

ترے عدو کی خرابی کا کچھ علاج نہیں — نہ ہو قبول دعا سے بھی رجعت نحوس
اگر کہے مددے یا محمد عربی — سفیر مرگ ہو رستم کو نعرۂ الکوس
ہیں گدا پر غرور شیر دہ — ہے گرسنہ جو کیا ہے خون پدر
جب اولو الفضل منکم اے حاسد — اُس کے حق میں کہے جہان داور
سُن کے لا یحتسب کا مژدہ ہوا — کافروں کو بھی گو نہ گو نہ خطر

(۲) غزلیات

چونکہ اس حصہ میں غزلیات ہی کو ایڈیٹ کیا گیا ہے۔ اسلئے غزلیات کے محاسن پر مفصل بحث علیحدہ ہوگی۔ اس وقت صرف اتنا یاد رکھنا کافی ہے کہ غزل ہی مومن کی معراج الکمال ہے اور اسی کے بدولت وہ صاحب طرز مانے گئے۔

(۳) فردیات

اس موضوع میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں۔ جو اُن کا عام رنگ ہے فردیات میں بھی موجود ہے۔ چند مستزاد بھی لکھے ہیں جو نہایت دلچسپ اور شوخ طبائع کے

(۴) قطعات

اُنھوں نے ۲۳ قطعے لکھے ہیں جن میں سے بعض کافی طویل الذیل اور عشقیہ انداز میں ہیں۔ ہر قطعہ دلکش اور اُن کی اُستادی فن کا شاہد عدل ہے

جو قطعات تاریخی ہیں وہ بھی اپنے رنگ میں لاجواب ہیں۔ ان کی نادرہ کار طبیعت نے تعمیہ و تخرجہ میں وہ وہ باریکیاں پیدا کی ہیں کہ باید و شاید چند مثالیں ملاحظہ ہوں

شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات کی تاریخ

دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہوگئے فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

مصرعہ ثانی کے الفاظ کے سر و پا (اول و آخر) دور کرنے سے ق۔ ی۔ ض۔ ن۔ ط۔ ر۔ ل۔ م حاصل ہوتے ہیں جن کے اعداد ۱۲۳۹ھ ہوتے۔

اپنے والد کے مرنے کی تاریخ

جنازہ اُٹھایا فرشتوں نے آ تو قد فاز فوزاً عظیما کہا

قد فاز فوزاً عظیما کے عدد ۱۳۰۷ ہیں اُن میں سے جنازہ کے اعداد (۶۶) خارج کرنے پر ۱۲۴۱ھ باقی رہتے ہیں جو مطلوب ہیں۔

بیٹی کی ولادت کی تاریخ

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے کہی تاریخ دخترِ مومن

دخترِ مومن (۱۳۴۰) سے نال کے اعداد (۸۱) دور کر دو۔ سنہ مطلوب (۱۲۵۹) برآمد ہونگے۔ سادہ تاریخیں بھی اپنی سادگی میں بے مثل ہیں۔ جیسے اپنی جدّہ کی وفات کی تاریخ۔ دخلت بالنعیم۔ گلشن بیخار کی تاریخ۔ گلدستۂ گلستانِ معنی

قطعات کے عنوان کے تحت بعض چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی ہیں جن میں کسی واقعہ کی تاریخ ہے اور سہولت کے خیال سے اُس عنوان کے ذیل میں درج کی گئی ہیں۔

(۵) رباعیات

رباعیاں لکھنا بظاہر بہت آسان ہے مگر درحقیقت نہایت دشوار

ایک اچھے رباعی نگار کا فرض ہے کہ ایک منفرد خیال کو چار مصرعوں میں اس قدر موثر اور لطیف انداز میں بیان کرے کہ اس سے بہتر پیرایہ متصور نہ ہو سکے۔ چوتھا مصرع عموماً حاصل رباعی اور زبان کے اعتبار سے چست تر ہونا چاہئے مومن کی رباعیاں اس معیار پر پوری اترتی ہیں اور اگرچہ اردو کے مشہور رباعی نگاروں یعنی انیس و دبیر و حالی کی رباعیات کی طرح بلند نہیں تاہم ہماری زبان کی عمدہ رباعیوں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ یہ عشق و محبت۔ توبہ و مناجات تولائے اہلبیتؑ۔ مذہبی مطاعن کے مضامین پر مشتمل ہیں اور ردیف وار مندرج ہیں۔ تعداد ۱۳۱ ہے چند مثالوں سے رنگ کا اندازہ ہوگا۔

رباعی

کیا گوشہ خفا میں انجمن میں بھی تو تھا
کیا وحشت کہ تنگدل چمن میں بھی تو تھا
کچھ اور نہیں سفر میں ایذا لیکن
اک درد ہے دل میں جو وطن میں بھی تو تھا

دیگر

اے خواجۂ خواجگاں دم خشم و عتاب
کیا تاب کہ دے سکے کوئی تجھکو جواب
گر جرم کا میرے وزن کرنا ٹھہرا
انصاف سے کر اپنے کرم کا بھی حساب

دیگر

تابندگی عذار سے فرق امامؑ
تھا جلوہ نما سناں پہ جوں ماہ تمام
یہ حجت ساطع کرامات حسینؑ
افزوں ہوئی تیرہ روزی لشکر شام

دیگر

خالص ہوں محمدی مرا دین اسلام
گو رافضی ہو صواب ہو نہیں مجھکو کام
تقلید کی ٹھہری تو ہونگا شیعہ
کس واسطے چھوڑ دیجئے افضل تر امام

بعض رباعیاں مستزاد کی شکل میں بھی لکھی ہیں۔ اور اپنے رنگ میں خاصی ہیں"

(۶) مستزادات

ذکر اوپر گذرا۔

(۷) مسمّطات

اس عنوان کے تحت مثلث۔ مخمس۔ مسدس۔ مثمن سبھی کچھ ہیں اور خوب ہیں۔ یہ سب تعداد میں ۱۹ ہیں۔ بعض میں دوسروں کے اشعار کی تضمین کی ہے اور بعض خود اُن کی مستقل نظمیں ہیں۔ تضمین کی خوبی یہ ہے کہ مصرعے اس طرح دست و گریبان ہوں کہ اُن میں اور اصل اشعار میں مشکل سے امتیاز ہو سکے ہر شخص بلا خوف تردید کہہ سکتا ہے کہ مومن کی اکثر تضمینیں اس معیار کی مصداق ہیں۔ ایک آدھ بند سے صحیح اندازہ تو دشوار ہے۔ تاہم بخوف طوالت صرف دو مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

یا رائہ بتاں پہ بھلا اعتماد کیا یا تو کسی کو دخل نہ تھا واں ترے سوا
یا اس قدر وہ شکل سے بیزار ہو گیا گر بیم سرگرانی او نیست غیر را

منعم چرا ز ہمرہی خویشتن کند

دیگر

ناصح ذلیل کہنے لگے مجھکو شیخ و شاب لطف نے میرے تیری تلی تلق ابتدا
اب تو خوشی ہوئی تری اُخا تماں ترا رسوا شدیم رسید بجائے لراز حجاب

دیگر بہ پیش او نتوانم گذر کنم

ہماری رائے میں مصرعوں کے تسلسل اور زبان کی صفائی کے اعتبار سے مومن کا کلام اس قدر بلند ہے کہ اُس کو تضمین کا ذروۃ الکمال کہنا چاہئے۔

اس عنوان کی جو مستقل نظمیں ہیں وہ سب کی سب واسوخت ہیں۔ واسوخت یا واسوز اُس نظم کو کہتے ہیں جس میں شاعر جل کر معشوق کو ترک محبت کی دھمکی دے یا دوسرے سے عشق کا ارادہ ظاہر کرے۔ مومن کو جو قدرۃً عاشق مزاج واقع ہوئے تھے واسوخت سے لازمی طور پر مناسبت ہونی چاہیے تھی چنانچہ اُن کے واسوخت صحیح معنی میں "جلی کٹی" سُنانے اور چھیڑ چھاڑ کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اور ہر ایک میں ملامت۔ گلہ۔ طعن اور جوش کی وہ افراط ہے کہ داد نہ دینا ظلم ہے۔ ذرا سُننا وہ اپنے محبوب (بلکہ محبوبہ) کو کیسی صاف صاف سُنا رہے ہیں۔

وہ جو ہمدم ہے تیری مہ پارہ　　شوخ جیسے نجوم سیّارہ
وہ بھی ہوتی چلی ہے آوارہ　　تازہ تازہ ہے شوق نظارہ

مژہ سے شوخیاں ٹپکتی ہیں
آنکھیں زہرہ نمط جھپکتی ہیں

بسکہ ہے ولولہ جوانی کا　　لطف ڈھونڈے ہے زندگانی کا
قصہ سُن میری جانفشانی کا　　شیوہ سیکھا ہے مہربانی کا

گم شدہ دل کی جستجو ہے بہت
مجھ سے عاشق کی آرزو ہے بہت

ڈھب پہ اپنے اُسے لگا لونگا　　حسرت و آرزو نکالوں گا
تجھ سے بے باک تر بنا لوں گا　　تازہ انداز سب سکھا لوں گا

چاہیے جو آفتِ زمانہ بنے
غیر نا آشنا یگانہ بنے

ایک بند اور سُنیئے اور لطف اُٹھایئے۔

چھوڑ دینا تھا تمھیں جھوٹ قسم کو نہ مجھے | دل سے کھونا تھا اس انداز ستم کو نہ مجھے
بھول جانا تھا جفائے پئے ہم کو نہ مجھے | نیست کر دینا تھا اندوہ والم کو نہ مجھے

قابلِ ترک تھی تو سے ستم آرا نہ کریں
لائق سہو تھی یہ رنجش بیجا نہ کریں

(۸) ترجیع بند

تمام کلیات میں ایک ترجیع بند ہے جس میں ۱۴ بند ہیں اور اپنے انداز میں بے مثل۔ مضمون عاشقانہ ہے اور رنگ متغزلانہ۔

(۹) ترکیب بند

ترکیب بند بھی صرف ایک ہے اور زور کمال کے اعتبار سے یکتا۔ عنوان ملاحظہ ہو۔

ترکیب بند بہ مضمون مرثیہ معشوقہ حور ملک شیم مصطفی وصالہا فی جنت النعیم۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اُس قسم کا مرثیہ" اردو میں مشکل سے ملیگا۔ جو ایک طرف نازکخیالی اور بدیع الاسلوبی کا مکمل مرقع ہو اور دوسری طرف سوز وگداز کی سچی تصویر۔ مرزا غالب نے بھی ایک آدھ مرثیہ لکھا ہے مگر مومن کے یہاں درد واثر زیادہ ہے۔ یوں تو کل ۱۲ بند ہیں مگر کہیں کہیں سے صرف چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

سر پیٹتا ہے شانہ پڑا دونوں ہاتھ سے | کیا جانے اُس کی زلف پریشاں کو کیا ہوا
شبنم کو پھر رہے جاتے خورشید التفات | شرمندہ ساز مہر درخشاں کو کیا ہوا
دل میں شکن ہے زلف مسلسل کدھر گئی | برہم ہے حال کاکل پیچاں کو کیا ہوا
لذت فزا نہیں الم اُس لب پہ کیا بنی | کچھ زخم بے مزہ ہیں نمکداں کو کیا ہوا

بوے قباے یوسف گل ہے نسیم میں — اُس کی شمیم عطر گریباں کو کیا ہوا
گردش پہ اپنی ناز ہے پھر روزگار کو — اُس چشم رشک فتنۂ دوراں کو کیا ہوا

بند دیگر

افسوس کوئی پردہ نشیں پردہ در نہیں — وہ حسن جس سے عشق ہو رسوا نہیں رہا
دل میں جگہ نہ ہونے کا کس سے گلہ کروں — وہ قدردان شکوۂ بیجا نہیں رہا
اب کس کو دیکھیے کہ کسی کو نہ دیکھیے — وہ پردہ سوز چشم تماشا نہیں رہا

غرض کہاں تک لکھا جاے۔ ہر ایک شعر تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے

از دل می خیزد بر دل می ریزد

(۱۰) مثنویات

اس عنوان کے تحت دو منظوم خط اور چند مستقل مثنویاں ہیں جنکی تفصیل حسب ذیل ہے۔ (۱) شکایت ستم۔ (۲) قصہ غم۔ (۳) قول غمیں۔ (ذکر عشق مومن با امۃ الفاطمہ بیگم معروف بہ صاحب جی)۔ (۴) تف آتشیں۔ (۵) حنین مغموم۔ (۶) آہ وزاری مظلوم (۷) مثنوی ناتمام (۸) مثنوی دیگر (۹) مثنوی دیگر (۱۰) مثنوی جہادیہ۔ ان مثنویوں کو پڑھ کر اُن کی اُستادی و قادر کلامی کا کلمہ پڑھنا پڑتا ہے۔ ان میں سے شروع کی چھ مثنویاں جن کے تمام تاریخی ہیں۔ عشقیہ ہیں اور جگ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی ہیں۔ مومن کی شاعری میں عام طور پر داخلی رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مثنوی بھی جو عموماً خارجی مضامین کے لئے مخصوص ہوتی ہے اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ دقت پسندی۔ مضمون آفرینی۔ نکات۔ معاملہ بندی۔ بدیع الاسلوبی جو اُن کی غزلیات کا وصف ہیں مثنویات میں بھی علی وجہ الکمال نظر آتی ہیں۔ اکثر موقعوں پر زبان کی سلاست اور

جدید تراکیب کی لطافت دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے - البتہ بیان میں کہیں کہیں عریانی پیدا ہو گئی ہے جس سے بقول شمس العلما امداد امام اثر کوچہ گردی کی بو آتی ہے - یہ صحیح ہے کہ اُن کا "عشق" مجازی ہی نہیں - بوالہوسانہ بھی ہے - مگر پرداز داستان لطف سے خالی نہیں - جب تک کوئی مثنوی بالاستیعاب نہ پڑھی جائے اُس کی نسبت صحیح رائے قائم کرنا - یا اُس سے پورے طور پر محظوظ ہونا مشکل ہے تاہم بہ فحوائے مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ چند شعر نقل کئے جاتے ہیں -

تمہید - اب عشق ہوا ہے مہرباں پھر
بے تاب ہے جاں ناتواں پھر

پھر دل کو تپش سی ہو رہی ہے
سینے میں خلش سی ہو رہی ہے

پھر داغ کہن ہے تازہ و تر
پھر زخم جگر ہنسے ہے گل پر

پھر ناوک درد دل شکن ہے
پھر سینہ کا زخم خندہ زن ہے

معاملہ بندی - آئینہ کو رکھتی آگے لاکر
اور کہتی یہ منہ سے منہ ملا کر

لو دیکھو ذرا کرو خود انصاف
ہم دونوں میں کس کا رنگ ہے صاف

ہے دونوں میں کون خوبصورت
ہے دونوں میں کون ماہ طلعت

پھر اپنے غرور میں جو آتی
خاطر میں کسی کو بھی نہ لاتی

خود بینی سے ہوش میں نہ رہتی
آئینہ کو پھینک مجھ سے کہتی

دیکھو تو بغور چشم بد دور
یوسف کہ وہ ہے جہاں میں مشہور

کیا اُس کی بھی صورت ایسی ہی تھی
کیا اُس کی بھی طلعت ایسی ہی تھی

بارا کبھی کہ یہ ہی رنگ رو تھا
ایسا ہی وہ چہرہ نکو تھا

یہ چشم سیاہ تو نہ ہو گی
یہ شوخ نگاہ تو نہ ہو گی

یہ فتنہ فسانہ چلن نہ ہو گا
ہر بات میں بانکپن نہ ہو گا

کیفیت عاشق۔ گرمیِ شوق سوز پنہانی — آہ سحر کی شعلہ فشانی
چشم سحر آلودہ کا شکوہ — بخت بخواب آسودہ کا شکوہ
قوت فزائی غصہ و غم کی — آب دہی خونناب ستم کی
ہجر قیامت زا کی شکایت — مرگ قدم فرسا کی شکایت
عرض حجاب رسوا کردن — عذر امید بیجا کردن
حرف زباں زد ہجر کی کاوش — عرض مکرر وصل کی خواہش

عشقیہ مثنویوں میں بھی ہیں کہیں دوسرے فرق اسلامیہ پر طعن کر جاتے ہیں ممکن ہے کہ یہ ناسخ کے مذہبی مطاعن کا جواب ہو۔ تاہم ایک پبلک شاعر کے شایان شان نہیں معلوم ہوتا۔

باقی مثنویوں میں حمد۔ نعت۔ مناجات اور جہاد کے مضامین ہیں۔ یہ سب تلاش مضمون اور جوش اعتقاد کے لحاظ سے ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ مضمون طویل ہوا جاتا ہے مگر جی نہیں مانتا کہ قارئین کرام کو اپنے ساتھ اس لطف میں شریک نہ کیا جائے اس لئے مشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ ہو۔

حمد۔ وہ حافظ کہ آتش سے خس کو بچائے — تپ عشق سے بوالہوس کو بچائے
وہ ناصر کہ گر اس کی امداد ہو — فغاں سے مری چرخ برباد ہو
وہ جاذل کہ دے زلف کو پیچ و تاب — اگر جان عاشق کو ہو پیچ و تاب
وہ قادر کہ گر چاہے اس کا کرم — مٹا دے مرے دل سے عشق صنم

نعت۔ وہ اُمی و لے نقشبند علوم — کلام اس کے سب دلپسند علوم
کہاں ایسا علامہ روزگار — کہ حکم کواکب ہو تقویم پار
نہیں عقل اول کو بھی یہ مجال — اسی کو ہے معلوم آخر کا حال

زبس ساتھ تھا ہم شمار گناہ ۔ نہ حاصل ہوا قرب عصمت پناہ

مناجات عشقیہ: الٰہی مجھے دل دے اور دلکو داغ ۔ جلے صبح محشر تلک جس چراغ

مری چشم دریا بہاتی رہے ۔ مری آگ عالم جلاتی رہے

مرا ولولہ خوں تراوی کرے ۔ نہانی خلش سینہ کاوی کرے

سلاسل پہ زور آزماتا رہوں ۔ سدا بیڑیاں تیں تڑاتا رہوں

کبھی ہرزہ گردی کھٹکانے لگے ۔ کسی شوخ کو رحم آنے لگے

انصاف سے کہنا یہ مضمون - یہ بندش - یہ زور بیان یہ لطف ادا کسی اور کے یہاں بھی ہے - کون کافر ہے جو اس قادر الکلامی کو دیکھ کر بھی مومن کے کمال پر ایمان نہ لائے -

(ب) غزل

آمدم بر سر مطلب

دلم از پردہ بشد حافظ خوش لہجہ کجاست

تا بہ قول و غزلش ساز و نوائے بکنیم

اوپر آپ پڑھ آئے ہیں کہ غزل مومن کا سرمایہ کمال ہے اور اسی کی بدولت آج وہ صاحب طرز اور مجتہد فن مانے جاتے ہیں - اب ذرا اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو -

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مومن ہمیشہ روش عام سے علیحدہ رہتے تھے - اُن کی مشکل پسند اور جدت طراز طبیعت کسی شعبہ میں بھی تقلید کرنا عار سمجھتی تھی -

---

نوٹ: مثنوی جہادیہ کے اشعار اوپر منقول ہوئے - اسلئے اعادہ بیکار -

پھر شاعری اس کلیہ سے کیونکر مستثنیٰ رہتی۔ اسی لئے انھوں نے اس میں نئی طرز ایجاد کی۔ جو معاملہ بندی کے باوجود جرات کے انداز سے بلند تر ہے اور مضمون آفرینی کے باوصف غالب کی طرز سے نازک تر۔ مومن نے چند روز شاہ نصیر کو جو بقول صاحب شعر الہند دہلی کے ناسخ تھے اپنا کلام دکھایا تھا پھر جب ناسخ کا دیوان لکھنؤ سے دہلی پہونچا تو مومن و غالب دونوں نے اُن کا تتبع کرنے کی کوشش کی مگر شکر ہے کہ یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ ورنہ اُردو کو مومن کا انفرادی رنگ کیونکر نصیب ہوتا اور غالب کے فلسفیانہ حقائق کیسے عالم وجود میں آتے۔

چند شعر نصیر و ناسخ کے پڑھئے اور غالب و مومن کے ابتدائی کلام سے موازنہ کیجئے۔ بہت کم تفاوت ہوگا۔

نصیر۔ لو لگ رہی ہے جس سے وہ شمع رو نہ آیا
بل بے تری شرارت یاں تک کبھو نہ آیا

ہو اُس دہن سے روکش سیلی صبا کی کھائی
غنچہ کے آہ مُنہ سے کس دن لہو نہ آیا

دنداں دکھا کے مست ہنس لے بخیہ گریباں
چاکِ جگر کا ہم کو طورِ رفو نہ آیا

اپنی بھی بعد مجنوں یارو ہوا بندھی ہے
لے گرد بادِ خیمہ کب کو بکو نہ آیا

ناسخ۔ مُنہ کو دامن سے چھپا کر جو وہ رقصاں ہوتا
شعلۂ حسن چراغِ تہِ داماں ہوتا

نکہتِ کاکلِ پیچاں سے جو دیتے تشبیہ
عطرِ مجموعہ کا ہر جزو پریشاں ہوتا

خوں رُلاتا وہیں ناسور بنا کر دل
زخم بھی گر مرے تن پہ کبھی خنداں ہوتا

کون ہے جو نہیں مرتا ہے ترے قامت پہ
کیوں نہ ہر قد میں قالب بیجاں ہوتا

غالب۔ نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

فروغِ حسن سے ہوتی ہے حل مشکل عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے بیداد کاوش ہائے مژگاں کا — کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

مومن۔ لے اڑی لاشہ ہوا لاغر بس تن ہوگیا — ذرۂ ریگ بیاباں اپنا مدفن ہوگیا

بن ترے اے شعلہ رو آتشکدہ تن ہوگیا — شمع قد پر میرے پروانہ برہمن ہوگیا

تاش کا ہمدم کفن لانا کہ بس میں مرگیا — چلوؤں سے جلوۂ خورشید سیما دیکھکر

یاد آیا سوے دشمن اس کا جانا گرم گرم — پانی پانی ہوگیا میں موج دریا دیکھکر

یہ طرز جس کی بڑی خصوصیت آورد تھی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہی اور دونوں استادوں (غالب و مومن) کے ذوق سلیم نے اس کو نباہنے سے ابا کیا۔ آخر غالب نے رنگ میر اختیار کیا اور مومن اپنے ذاتی طرز پر آگئے۔ اس سلسلہ میں یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ ان کے ہم عصروں میں ذوق و غالب دونوں مقلد ہیں یعنی ایک[1] کے کلام میں سودا۔ نصیر۔ معروف مصحفی۔ انشا۔ جرات کا تتبع پایا جاتا ہے اور دوسرے کے یہاں بیدل و میر کا۔ صرف ایک مومن ہیں جنکو مجتہد فن کہا جا سکتا ہے۔ ابتداے مشق میں ضرور ان کے کلام میں بھی ناسخ و نصیر کا رنگ جھلکتا تھا۔ علاوہ بریں کہیں کہیں بیدل کا انداز بھی نظر آتا تھا۔ راقم الحروف کے کرم فرما جناب سید یعقوب الحسن نے جو شعر فہمی اور نکتہ شناسی میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں مومن کی شاعری کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان کے کلام کے بیحد معترف ہیں۔ راقم نے ان کا ذاتی نسخۂ دیوان مومن دیکھا اور ان کے استقصاے مطالعہ اور وسعت نظر کی داد دی۔ غزلیات میں ہر شعر پر نشان لگا ہوا تھا اور اس امر کی صراحت تھی کہ یہ شعر سودا۔ میر۔ ناسخ۔ جرات۔ امانت۔ غالب کے رنگ میں

[1] آب حیات۔

لکھا گیا ہے یا مومن کی خاص طرز ہے اور یہ تقسیم ہے بھی درست - کیونکہ اُن کے یہاں ان اساتذہ کے طرز میں بھی کافی اشعار ملتے ہیں - اگرچہ زیادہ نہیں - تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود اُن کی غزلیات ایک خاص طرز کی حامل ہیں - اب سوال یہ ہے کہ یہ طرز ہے کیا - اس کا جواب آگے آتا ہے -

اس طرز کی خصوصیات حسب ذیل ہیں -

(۱) **تغزل** :- اُردو شعرا میں مومن نفس تغزل کے اعتبار سے جس نقطۂ عروج تک پہونچ گئے ہیں دوسروں کو اُس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں یہ صحیح ہے کہ فارسی کے شعرائے متاخرین کی غزلوں میں تغزل کے علاوہ فلسفہ - اخلاق - تصوف - سبھی کچھ ہے اور اُردو غزل میں بھی یہی کیفیت عام طور پر پائی جاتی ہے - بلکہ جس طرح امام رازی کی تفسیر کی نسبت کسی نے کہا ہے کہ فیہ کل شئیً الا التفسیر - یہی بعض اساتذہ اُردو وفارسی کا حال ہے کہ اُن کی غزل میں سب کچھ ہے تغزل ہی نہیں - مگر سوال یہ ہے کہ ایسا کرنا حدود تغزل سے متجاوز ہوتا ہے یا نہیں - ہمارے خیال میں ایک غزل نگار کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ غزل کی بنیاد صرف اُن واردات پر رکھے جن کا تعلق جذبات عشق ومحبت سے ہے - دوسرے مضامین بھی ضمناً آجائیں تو مضائقہ نہیں صرف خشک فلسفہ نظم کر دینا یا **مسائل تصوف** کو موزوں کر دینا تغزل کیونکر کہا جا سکتا ہے اس کے لئے غزل کو چھوڑ کر دوسری اصناف شعر سے کام لیا جائے تو بہتر ہے - غزل لکھتے وقت ان مضامین کی آڑ میں پناہ لینا عجز شاعرانہ تو کہا جا سکتا ہے - قدرت کلام کی دلیل ہرگز نہیں ہو سکتا - مومن کا وصف یہ ہے کہ اُنھوں نے غزل کو اُس کے حقیقی مفہوم میں منحصر کر دیا - مانا کہ ایسا کرنے سے شاعری کا میدان تنگ تر ہو گیا - لیکن یہ عیب نہیں بلکہ ہنر ہے کہ اُن کی دقیقہ سنج طبیعت

نے "ظرفِ تنگنائے غزل" میں ان قیود کے باوجود وہ جولانیاں دکھائیں اور اس محدود موضوع میں وہ تنوعات پیدا کئے کہ تمام معاصرین پر سبقت لے گئے اور نفس تغزل کے لحاظ سے "بہترین غزل گو" کہے جانے کے مستحق ٹھہرے۔ غزل تو غزل دوسری اصناف میں بھی اُن کے یہاں یہی رنگ چڑھا ہے۔ قصائد کی تشبیب۔ مثنویات۔ قطعات۔ رباعیات وغیرہ وغیرہ سب کی تان اسی پر آکر ٹوٹتی ہے) الا ماشاء اللہ۔ ممکن ہے کہ کوئی خردہ بین اس کو وضع الشئی فی غیر محلہ سے تعبیر کرے مگر مومن اپنی رنگینیٔ طبیعت سے مجبور ہیں تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مومن دنیا کو اپنی نسبت مغالطہ میں رکھنا نہیں چاہتے۔ کہ عشق کے جذبہ سے ناآشنا ہوں اور "بہ ضرورت شعر" خود کو عاشق ظاہر کریں۔ یا عشق مجاز کی منزل میں ہوں اور متصوف بنیں۔ مومن کی شاعری اکثر اساتذہ دہلی کی شاعری کی طرح تقریباً تمامتر داخلی ہے۔ لکھنؤ کے شعرا خارجی متعلقات حسن وعشق پر زیادہ زور دیتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کا کلام پھیکا اور بے اثر ہو کر رہ گیا۔ اس رنگ کے چند شعر سنئے۔

(ناسخ) نہ میرے پاؤں ہوں زنجیر کے کبھی شایاں کی — جو اُس کی کاکل پیچاں کی ہاتھ میں لٹ ہو

کبود رنگ ہے مسی کا تیرے ہونٹھ ہیں لال — ملیں جو دونوں تو پیدا نہ کیوں اودا ہٹ ہو

نسیم آہ کے جھونکے سے کھول دوں دم میں — بھڑا ہوا ترے دروازے کا اگر پٹ ہو

ہجوم رکھتے ہیں جانباز یوں ترے آگے — جواریوں کا دوالی کو جیسے جمگھٹ ہو

اس کے برخلاف مومن کے یہاں مضامین وصل۔ ہجر۔ رشک۔ رندی۔ جنون۔ راز نالہ سب میں داخلی انداز نمایاں ہے۔ مثالوں اور اُن کی تشریح میں طوالت کا اندیشہ ہے زیر نظر ایڈیشن آپ کے روبرو ہے۔ پڑھئے اور لطف اُٹھایئے۔ اگر مثالوں ہی پر

اصرار ہو تو تین چار شعر سن لیجئے۔

یارب وصال یار میں کیونکر ہو زندگی ۔۔۔ نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ
شب ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے ۔۔۔ زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے
سمجھتا کیونکہ دیوانے کی باتیں ۔۔۔ نہ پایا محرم اپنے رازداں کو
عیش میں بھی کبھی جاگے نہیں تم کیا جانو ۔۔۔ کہ شب غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے
چھوٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی ۔۔۔ ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے

اس قسم کے اشعار پڑھ کر (جن کی تعداد کلیات میں بہت کافی ہے) ان کے صدق جذبات - جوش قلب - سوز و گداز درد و اثر کی بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔

مومن کی شاعری کے بحث میں یہ سوال اکثر اُٹھایا جاتا ہے کہ اُن کے عشق کی نوعیت کیا ہے اور اُن کا مخاطب صحیح کون ہے - جو شخص اُن کے کلام کا مطالعہ کریگا وہ بیک نظر بتا دیگا کہ ان کا "عشق" نہ صرف مجازی بلکہ گونہ ہوسناکی کا انداز لئے ہوئے ہے اور اُن کا روئے سخن بیشتر کسی "پردہ نشین" کی طرف ہوتا ہے اُن کا عشق وصل ہجر کی کشمکش میں مبتلا ہے اور ان کا دل امید و بیم کے دوراہے پر حیران اُن کے معشوق کو گلہ رقیب" کا بھی خیال ہے اور "طعن اقربا" کا بھی اندیشہ۔ ملاحظہ ہو

اے پردہ نشین چلوں اُٹھا دے کہ نہ چلیے ۔۔۔ کرتا ہوں میں سوز غم ہجراں کی شکایت
کیسے گلے رقیب کے کیا طعن اقربا ۔۔۔ تیرا ہی دل نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں
عشق پردہ نشیں میں مرتے ہیں ۔۔۔ زندگی پردہ در نہ ہو جائے
یارب کوئی معشوقہ دلجو نہ ملے آپ ۔۔۔ جو اُن کی دعا ہے وہی اپنی بھی دعا ہے

پردہ نشین کا لفظ جس تکرار سے اُنھوں نے استعمال کیا ہے کسی دوسرے استاد نے نہیں کیا اس حقیقت پر نظر کرتے ہوئے ان کی صحت مذاق اور صدق جذبات میں

کسی شبہہ کی گنجایش نہیں رہتی۔ البتہ یہ کہنا درست نہیں کہ اُن کا محبوب ہمیشہ جنس لطیف سے ہوتا ہے۔ ملک کی پست مذاقی اور بے اصولی کے اثر سے وہ کہیں کہیں "بُت پردہ نشیں" کو چھوڑ کر "طفل برہمن" سے بھی چھیڑ چھاڑ کرنے لگتے ہیں مثلاً

دلِ مومن آتشکدہ کیوں بنے — لگاوٹ یہ طفلِ برہمن سے ہے

رقیبوں پر ہوئی کیا آج فرمایش جواہر کی — کہ میرا عاشق خط زمرد فام لیتا تھا

یاد خطِ نگار میں ہم زہر کھا موئے — کیا آبِ زندگی کا ہوا ہے خضر سے فیض

غم خط میں ترے مرجائیں تو کچھ کیا ہے عجب — زہر کو جو کوئی کھاتا ہے ضرر کرتا ہے

مگر یہ اُن کا عام رنگ نہیں۔

یہاں ایک نکتہ قابل لحاظ ہے۔ اکثر ارباب فن کسی شعر کو اس بنا پر کہ اُسمیں محبت مجازی کی کوئی ایسی واردات بیان کی گئی ہے جس سے کوچہ گردی کی بو آتی ہے قطعاً مسترد کر دیتے ہیں۔ یہ طریق نقد صحیح نہیں معلوم ہوتا شعر اور اخلاق کو ملا دینا غلط مبحث نہیں تو اور کیا ہے اگر محقق دوانی شعر گوئی سے عاری ہوں یا حافظ شیرازی اخلاق پر مقالہ نہ لکھ سکیں تو دونوں کے کمال فن میں کیا فرق آتا ہے کسی شعر میں عشق کی روداد ہے یا اخلاق و تصوف کا فقدان ہے تو اس سے شعر میں کوئی نقص نہیں۔ دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ عشق یا حُسن کی نسبت جو خیال ظاہر کیا گیا ہے سلیقہ سے ظاہر کیا گیا ہے یا نہیں۔ اگر بیان میں رکاکت ابتذال یا خامی ہے تو بیشک شعر ناقابل قبول ہے۔ یہ امر موجب اطمینان ہے کہ مومن کے مضامین عشقیہ میں جرات کی سی پستی اور ابتذال نادرالوقوع ہے

۵۲ برخلاف صراحتِ نگار (مومن نمبر) جنوری ۲۸ء

(۲) **نازک خیالی اور مضمون آفرینی** - متاخرین شعرائے فارسی کی شاعری کا یہ مابہ الامتیاز وصف ہے کہ وہ ذرا سی بنیاد پر تخیل کی سر بہ فلک عمارت قائم کر دیتے ہیں۔ فغانی اس طرز تازہ گوئی کا بانی گذرا ہے جس کے مقلد ایران میں محتشم کاشی اور شفائی اور ہندوستان میں عرفی و نظیری تھے اس رنگ کو ظہوری جلال۔ طالب۔ کلیم نے ترقی دی اور علی و بیدل نے انتہا کو پہونچا دیا۔ ان لوگوں کے کلام میں عموماً اغلاق اور دقت پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ یا مبالغہ کا دوراز کار ہونا ہے یا ایہام و رعایت پر شعر کا مبنی ہونا۔ یا استعارہ در استعارہ کا استعمال یا بڑے خیال کو مختصر عبارت میں ادا کرنا۔ مومن بھی فارسی کے شاعر تھے اس لیے اس رنگ سے اُن کا آشنا ہونا ناگزیر تھا۔ تاہم اُردو میں سب سے پہلے اور سب سے آخر اُنھوں نے ہی اس کو برتا اور اپنی دوسری خصوصیات کلام سے اسکو اپنا لیا۔ اس لئے یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ وہ اُردو میں اس طرز کے موجد اور اس انداز میں منفرد ہیں۔ غالب بھی یقیناً ایک نازک خیال اُستاد ہیں مگر مومن شریک غالب ہیں۔ مثال کے طور پر چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔ جن سے مومن کی خلاق المعانی طبیعت کا اندازہ ہوگا۔ مثلاً وہ ایک شعر میں شام وعدہ اپنے تھک کر سو رہنے کو کس خوبی سے "شکوہ" قرار دیتے ہیں۔

آرام شکوہ ستم اضطراب تھا
پھرنے سے شام وعدہ تھکے یہ کہ سو رہے

یا معشوق کے نہ دیکھنے کو کس شوخی سے "نگہ التفات" ثابت کرتے ہیں۔

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اُس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے

اور سنیئے۔

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو
کرۂ خاک ہے گردش میں طپش سے میری

یعنی مجھے حالت اسیری میں بھی آزادی میسر ہے۔ اس واسطے کہ جب میں زنداں

میں تڑپتا ہوں تو میری تپش کے اثر سے تمام کرہ زمین گردش کرنے لگتا ہے اور اُس کے ساتھ میں بھی گردش کرتا ہوں اب آزادی کے لئے اور کیا چاہئے۔

دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب　　تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

منجم نے شاعر کا حالِ زار دیکھا اور تاثیر نجوم کے حساب سے اُس کی ناکامی عشق کا پتہ لگا لیا۔ اور خود اُس کا رقیب بن بیٹھا۔ کیونکہ عاشق کی ناکامی دریافت کرکے اُس کو اپنی کامرانی کی توقعات پیدا ہوئیں۔ اس طرح اُس کا طالع ناساز دیکھنا منجم کے حق میں سازگار ہوا۔

اب چند شعر بغیر تشریح نقل کئے جاتے ہیں ورنہ مضمون طویل ہو جائے گا۔ واضح رہے کہ اُن کے خیالات کا دوسرے اساتذہ سے متوارد نہ ہونا اُن کی ندرت فکر کی برہان قاطع ہے۔

واعظ بتوں کو خلد میں لیجائینگے کہیں　　ہے وعدہ کافروں سے عذابِ الیم کا
بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے　　شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم
لذتِ جور کشی نے مجھے شرمندہ کیا　　طعنے کیا کیا اُسے اربابِ ستم دینے میں
مرگ ہے انتہائے عشق۔ یاں رہی ابتدائے شوق　　زندگی اپنی ہو گئی رنجشِ بار بار میں
عدو اس اوج پر شاکی ہے شاید غصہ کھا جاؤ　　ملا دے خاک میں یہ تو بھی شکر آسمان کیجئے
تھا مقدر میں اُس سے کم ملنا　　کیوں ملاقات گاہ گاہ نہ کی

(۳) **ندرتِ اسلوب اور شوخیٔ ادا** ۔ صاحب مرآۃ الشعر کہتے ہیں کہ اچھا شعر حُسنِ خیال، حُسنِ الفاظ، حُسنِ ادا کا مجموعہ ہے۔ مومن کا کلام بڑی حد تک اس وصف کا مصداق ہے۔ اکثر[1] اساتذہ کے کلام کے "تیر و نشتر" ہونے کا راز اسی میں مضمر ہے

[1] میرزا کا کلام اس کی بہترین مثال ہے۔

کہ وہ سیدھے اور فرسودہ خیال کو ایسے دلکش اسلوب سے ادا کرتے ہیں کہ سننے والے دل تھام کر رہ جاتے ہیں۔ پھر خیال میں بھی ندرت ہو تو نورٌ علی نور۔ صرف اس قدر احتیاط چاہیئے کہ کلام میں اغلاق اور زبان میں خامی نہ رہ جائے۔

مومن کے یہاں ندرت اسلوب کی اس قدر فراوانی ہے کہ ایک ایک قدم پر دل کھنچتا ہے اور لاریب کہ اس میں اُن کا نظیر محال نہیں تو قریب محال ضرور ہے مثلاً یہ کہنا ہے کہ محبوب کی گالی بُری نہیں معلوم ہوتی۔ اس کو وہ یوں ادا کرتے ہیں۔

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں — اے ہم نفس نزاکتِ آوازِ دیکھنا

ایک جگہ فرماتے ہیں۔ محفل میں مرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ — بدنامیٔ عشاق کا اعزاز تو دیکھو

یہ طفل تسلّی ہو یا طنز یہ شوخی۔ بہرحال خوب ہے۔

معشوق قتل عام کرتا ہے۔ شاعر کو اسکی عاشق کشی پر کوئی اعتراض نہیں۔ شکایت ہے تو یہ ہے کہ اگر ایک کو دوسرے کے سامنے قتل کیا جاتا تو جذبۂ سفّاکی کی تکمیل زیادہ خوبصورتی کے ساتھ ہوتی۔

کیا تم نے قتل جہاں اک نظر میں — کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا

کس قدر بے پناہ شعر کہا ہے! الاماں۔

حرم کی شان یہ ہے کہ اُس کا دروازہ ہر خاص و عام کے لئے کھلا ہے۔ نیز یہ کہ وہاں کشت و خون ممنوع ہے اُس سے یوں مضمون پیدا کرتے ہیں۔

درباں کو آنے دینے پہ پیہم نہ کیجئے قتل — ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

اور سنیئے۔ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اسی شعر کے متعلق حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے کہ غالب نے اسکو سنکر بیحد تعریف کی اور کہا "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھکو دیدیتا" اس شعر میں

لطف ادا کے علاوہ نفسیات کا ایسا گہرا مسئلہ حل کیا گیا ہے کہ داد نہ دینا ظلم ہے۔ چند شعر اور نقل کئے جاتے ہیں۔

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

میرے کوچہ میں عدو مضطر و ناشاد رہا
شب خدا جانے کہاں وہ ستم ایجاد رہا

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

تفریح نہ کیونکر ہو ہوا آ نہیں سکتی
گویا در دلدار نشیمن ہے ہمارا

بجلی گری فغاں سے مری آسماں پر
جو حادثہ کبھی نہ ہوا تھا سو اب ہوا

فکر مآل سے مے و شاہد رہے عزیز
پیری میں موت یاد تھی پیری شباب میں

کثرت سجدہ سے وہ نقش قدم
کہیں پامال سر نہ ہو جائے

پامال سر کی ترکیب جس قدر نادر اور دلکش ہے ارباب فن سے مخفی نہیں۔ شوخی ادا کی تمثیل کے لئے ذیل کے اشعار پر اکتفا کی جاتی ہے۔ کلیات مومن سے مذاق سلیم اس قسم کی بیشمار مثالیں اخذ کر سکتا ہے۔

نہ جاؤنگا کبھی جنت کو میں نہ جاؤنگا
اگر نہ ہوئیگا نقشہ تمہارے گھر کا سا

ہم چارہ گر کو یونہیں پہنائینگے بیڑیاں
قابو میں اپنے گر وہ پریزاد آگیا

کس دن تھی اسکے دل میں محبت جواب ہے
سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

ہم حال کہے جائینگے سنئے کہ نہ سنئے
اتنا ہی تو یاں صحبت ناصح کا اثر ہے

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فراق
ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

توبہ گنہ عشق سے فرمائے ہے واعظ
یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

بعض جگہ کسی امر کو پہلے سے مسلم مانکر اس کی طرف خفیف سا اشارہ کر دیتے ہیں اور اس سے شعر کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ یہ طرز بیان منطقی نہ سہی۔ شاعرانہ ضرور ہے۔ مثلاً

واعظ بتوں کو خلد میں لیجائینگے کہیں ہے وعدہ کافروں سے عذابِ الیم کا

یعنی یہ امر طے شدہ ہے کہ اگر بت بھی کافروں کے ساتھ دوزخ میں رہنے تو کافروں کو عذاب کیسا۔ راحت ہوگی۔

رازِ نہاں زبانِ اغیار تک نہ پہونچا کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہنچا

یعنی اگر ہمارا خط اس تک پہونچتا تو وہ اغیار کو ضرور آگاہ کر دیتا۔ یا

شبِ ہجر میں کیا ہجومِ بلا ہے زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

نہ ربط اُس سے نہ یاری آسماں سے جفا بہرِ عدو لاؤں کہاں سے

کلام میں کہیں کہیں تشبیہات کی ندرت سے خاص لُطف پیدا کر دیتے ہیں۔ جیسے

چھوٹنا دامِ شکستہ سے بھی آساں نہیں میں گرفتارِ خمِ گیسوئے صیاد رہا

کیا کیا شکن دئے ہیں دلِ زار کو مگر اُس کے خیال میں ورقِ انتخاب تھا

از بسکہ ثبت نامہ ہے سوزِ تپِ دردِ دل قاصد کا ہاتھ ہے یدِ بیضا کلیم کا

آتشِ آہ بے اثر سے مری آسماں گلشنِ خلیل ہوا

آسمان کو گلشنِ خلیل سے تشبیہ دینا بالکل نئی بات ہے۔

داغِ خوں سے میرے وہ حیراں ہوا
دامن اُلجھا ہے گُلِ بے خار سے

(۴) مکرِ شاعرانہ۔ ندرتِ اسلوب کے تحت میں ایک اہم نکتہ قابلِ گذارش ہے۔ جس کو ہم بغرضِ سہولت مستقلاً علیحدہ بیان کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ مومن اپنے مطلب کو اس خوبی سے ادا کرتے ہیں کہ مخاطب اس میں اپنا فائدہ تصور کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہنا ہے کہ دشمن کی طرف نہ دیکھو۔ اس کے لئے یہ پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

ذیل کے شعر میں محبوب کو رقیب کے خط کی تعظیم سے روکتے ہیں۔

سر مگیں آنکھوں سے تم نامہ لگاتے کیوں ہو　　خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو

مسلہ اصول ہے کہ عادت کے خلاف ہر بات تکلیف دیتی ہے۔ غور کرو اس سے کیونکر فائدہ اٹھاتے ہیں۔

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں　　اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

اسی رنگ کے اور چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مت رکھیو گرد تارک عشاق پر قدم　　پامال ہو نہ جائے سرافراز دیکھنا

خواہش مرگ ہوا تنا نہ ستا ورنہ　　دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

درباں کو آنے دینے پہ میرے نہ کیجئے قتل　　ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

لذت جورکشی نے مجھے شرمندہ کیا　　طعنے کیا کیا مجھے ارباب ستم دیتے ہیں

وہ بدخواہ مجھ سا تو میرا نہیں　　عبث دوستی تم کو دشمن سے ہے

گر ذکر وفا سے یہی غصہ ہے تو اب سے　　گو قتل کا وعدہ ہو تقاضا نہ کرینگے

میں اس وصف کو مکر شاعرانہ سے تعبیر کرتا ہوں اور میرے خیال میں یہ مومن کی ملک خاص ہے دراصل وہی اس رنگ کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔

(۵) معاملہ بندی۔ فارسی میں مرزا شرف جہاں قزوینی معاملہ بندی (وقوعہ گوئی) کا مستقل موجد کہا جاتا ہے اگرچہ اس کی بنا سعدی و خسرو کے زمانہ ہی میں پڑ چکی تھی (عشق مجازی کی حقیقی واردات کا بیان کرنا اس طرز کا مقصد تھا) اس کے مقلد وحشی یزدی علی قلی میلی۔ علی نقی کمرہ تھے۔ یہ وحشی وہی ہے جو فارسی میں واسوخت کا بانی بھی تھا اور خاتم بھی (حکیم مومن خاں جو مدتوں عشق کی گلیوں کی خاک پھان چکے تھے

لہ شعر العجم۔

ممکن نہ تھا کہ اس طرف مائل نہ ہوتے۔ اُن سے پہلے جرأت نے بھی اس رنگ میں بہت کچھ لکھا تھا مگر بہ سبب[۵۶] کم علمی کے بہت کھل گئے تھے" اس کے برخلاف مومن نے ہر جگہ دہلی[۵۷] کی متانت کو نباہا ہے اور دائرہ تہذیب میں رہکر جذبات عشق کو ادا کیا ہے۔ اشعار ذیل اس دعوی کی تصدیق کرینگے۔

ہر چند اضطراب میں میں نے کمی کی — تو بھی نہ واں تغافلِ بسیار کم ہوا
ہر ایک سے اس بزم میں شب پوچھتے تھے نام — تھا لطف جو کوئی مرا ہمنام نکلتا
وصل کی شب شام سے میں سو گیا — جاگنا ہجر ان کا بلا ہو گیا
مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم — بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ کچھ نہیں کہتا
کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں — سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
چینِ جبیں کو دیکھ کے دل بستہ تر ہوا — کیسی کشود کار کشادِ نقاب میں
محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے — منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو
بیوفائی کا عدو کی ہے گلہ — لطف میں بھی وہ ستاتے ہیں مجھے
گلہ ہرزہ گردی کا بیجا نہ تھا کچھ — وہ کیوں مسکرا کے بجا کہتے کہتے

(۶) طنز۔ تغزل کے اجزائے ترکیبی میں ایک چیز طنز و تعریض بھی ہے۔ جو اُردو شعرا کے یہاں مومن کی برابر شاذ و نادر ہی کہیں نظر آتی ہے۔ طنز (طعنہ دینا) اور تعریض (کنایہ میں بات کہنا) کا مقصد کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کو جلی کٹی سنا کر دل کا بخار نکالا جائے اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ اشتعال دلا کر اپنی مطلب برآری کی جائے۔ کلام میں تعریض سے کام لینا ایک طرف تو شاعر کی ذکاوت حس اور ذہانت طبع کی دلیل ہے دوسری طرف اُس کی قدرت زبان کا ثبوت۔ جہانتک

[۵۶] تذکرہ جلوۂ خضر - [۵۷] شعر الہند

ہمارا خیال ہے اساتذۂ اُردو میں مومن سے زیادہ طنز کا استعمال کسی نے نہیں کیا۔ ہجو طنز سے پست تر ہے اس لیئے اُن کی مشکل پسند اور بلند فطرت نے اس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ہاں طنز میں اُن کے جوہر دیکھتا ہوں تو اشعار ذیل ملاحظہ ہوں۔ یہ ملحوظ رہے کہ طنز میں کبھی متکلم حقیقت کو مستہزیانہ انداز میں بطریق شکایت پیش کرتا ہے اور کبھی امرِ غیر حقیقی کو غیرت دلانے کی نیت سے بطورِ حقیقت بیان کرتا ہے۔ مثلاً محبوب نے آکر عاشق بیمار کو قتل کر دیا ہے۔ شاعر اس پر یوں چٹکی لیتا ہے۔

غیر عیادت سے برا مانتے — قتل کیا آن کے اچھا کیا

معشوق نے عاشق پر اتنے ستم کیئے کہ اب آسمان کو بھی رحم آنے لگا۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر تم اس قدر ظلم نہ کرتے تو چرخ بے مہر کو ہرگز رحم نہ آتا۔

رحم فلک اور مرے حال پر — تو نے کرم اے ستم آرا کیا

اور سُنئے۔ مٹی نہ دی مزار تک آ کے اس پہ بھی — کہتے ہیں لوگ خاک میں اُس نے ملا دیا

فرماتے ہیں وصال ہے انجام کارِ عشق — کیا ناصحِ شفیق نے مژدہ سُنا دیا

عمرِ دراز کی ہے رقیبوں کو آرزو — دیکھو زمان ہجر کے امیدوار ہیں

سُنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں — کہ سخت چاہیئے دل اپنے رازداں کے لئے

کر علاجِ جوشِ وحشت چارہ گر — لا دے اِک جنگل مجھے بازار سے

رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے — میں نے ہی تم سے بیوفائی کی

کیا پسند آئی اپنی جور کشی — چرخ کے انتخاب نے مارا

دیکھ مضطر کیوں نہ پھیرے دشنہ پھر — یار ہے وہ کچھ تماشائی نہیں

شبِ ہجر میں کیا ہجومِ بلا ہے — زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شبِ فراق | ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں
ہم حال کہے جائینگے سُنئے کہ نہ سُنئے | اتنا ہی تو یاں صحبتِ ناصح کا اثر ہے

اس قسم کے تیر و نشتر اُن کے کلام میں بہت ہیں اور ادنیٰ تفحص سے مل سکتے ہیں۔ نوک جھوک کرنے اور جلی کٹی سُنانے کے لئے شعرائے واسوخت کا میدان تلاش کیا ہے۔ فارسی والوں کی طرح اساتذۂ اُردو نے بھی اس رنگ میں بہت کچھ دادِ سخن دی ہے اور طعن و تشنیع کی قوت اسی محدود موضوع پر صرف کردی ہے۔ مومن کیونکر پیچھے رہتے بلکہ سچ پوچھئے تو اُن کے واسوختوں نے اصلاً واسوخت کے منشائے ایجاد کو پورا کردیا۔ واسوخت تو درکنار۔ اُن کی بعض غزلوں پر بھی واسوخت کا گمان ہوتا ہے مثلاً وہ غزلیں جنکے مطلع حسبِ ذیل ہیں

اب اور سے لو لگائیں گے ہم | جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم
تو یہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کرینگے | وہ کرنے میں اب جو نہ کیا تھا نہ کرینگے

(۷) علمیت۔ حکیم صاحب کی مستجمع الصفات ذات متعدد علوم و فنون کی سرمایہ دار تھی۔ اس لئے کلام میں علمی اصطلاحات کا بلا قصد آجانا ناگزیر تھا۔ قصائد میں تو اس سے چارہ نہیں۔ اُن کی غزلیات میں بھی کہیں کہیں یہ رنگ جھلکتا ہے۔ مگر خوبی یہ ہے کہ تغزل کی شان بدستور قائم رہتی ہے اور ان علمی مسائل کی حیثیت محض ثانوی رہجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علمی تبحر کے باوجود خشک فلسفہ یا سادہ اخلاق پر قلم نہیں اُٹھاتے۔ رہی تصوف کی سے سرجوش۔ اُس کے تو قریب جانا بھی وہ اعتقاداً برا جانتے ہیں۔ علمیت کی مثالیں ملاحظہ ہوں

آتشِ سینۂ تفسیدہ کو کیا میں رُوؤں | اشک جانب کرۂ آب کی مائل نہ ہوا
صبحدم آنے کو تھا وہ کہ گواہی دے ہے | رجعتِ قہقری شمس و قمر آخر شب

دشمن سگ ہے کوچہ نہ ہوا شوخ اثر چشم کا — نادم ہوں کہ سب گرگ آیا نامہ بے باندھ کر

اتنی بھی تاب دوری خورشید طلعتاں — نقصان کیا کمال سے آیا ہے ماہ میں

اپنے سودے کی نہ پوچھو کہ خریدار کے ساتھ — جنس میں تو ہے دل اور بیچ سلام کرتے گیا

قران انجم سیارہ برج آبی میں — ڈبوئیگی مری چشم ستارہ بار مجھے

کیوں نہ سمجھے ستم وہ عدو شب یاد فکر — بدگماں ہے سبب سیارہ کی تسخیر سے

(۸) مذہبیت۔ مومن خاں کی مذہبیت کا ذکر اُن کی سیرت میں گزر چکا ہے۔ وہ موحد اور عامل بالحدیث تھے اور بیعت کے بعد تو ان کا ہر لمحہ مذہبی چرچوں میں گزرتا تھا۔ غزل میں بظاہر حمایت دین و عصبیت مذہب کے اظہار کا کوئی موقع نہ تھا۔ تاہم وہ کہیں نہیں چوکتے۔ ملاحظہ ہو۔

خیالِ خواب راحت ہے علاج اس بدگمانی کا — وہ کافر گور میں مومن مرا شانہ ہلاتا ہے

ہم اور یہ بدعت تپش دل کے سبب سے — مومن مرے بیٹھنے پہ رستے بعد فنا تھا

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں — مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

ہے کفر و بدعت آیا نہیں تار سبحہ سے — زنار مومن آسے ہنگام دل برہمن کی

مومن حسد سے کرتے ہیں سامان جہاد کا — ترسا صنم کو دیکھ کے نصرانیوں میں ہم

ہم بندگی بت سے ہوتے نہ کبھی کافر — ہر جا سے اگر مومن موجود خدا ہوتا

بعض اشعار میں آیات و احادیث کی طرف تلمیحات بھی پائی جاتی ہیں جن میں سے اکثر بعید الفہم ہیں جیسے۔

ساتھ نہ چلنے کا بہانہ تو دیکھ — آکے مری نعش پہ وہ رو گیا

حدیث شریف میں نوحہ کرنیوالوں کو مشایعت جنازہ سے منع کرنے کی تاکید ہے۔

ڈرتا ہوں اہل نار کی تبدیل جلد سے — مومن غضب ہے آتش لذت فزائے داغ

اس میں آیۂ کریمہ بدّلنا ہم جلوداً غیرہا کی طرف اشارہ ہے۔

واعظ بتوں کو خلد میں لیجائینگے کہیں ہے وعدہ کافروں سے عذاب الیم کا

قرآن پاک میں ہے کہ انسان اور بت دوزخ کا ایندھن ہونگے۔ جب تک یہ آیت ذہن میں نہ ہو مطلب صاف نہیں ہوتا۔

(۹) تراکیب جدیدہ۔ دہلی کے دوسرے اساتذہ کی طرح مومن فارسی کے اُستاد تھے۔ اسی فارسیت کا نتیجہ ہے کہ اُن کے اُردو کلام میں فارسی کی دلپذیر ترکیبیں اور دلنشین بندشیں قدم قدم پر نظر آتی ہیں۔ جو انگوٹھی پر نگینے کا حکم رکھتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض ترکیب بقول آزاد اُردو کی سلاست میں اشکال پیدا کر دیتی ہیں تاہم مجموعی طور پر یہ ترکیبیں نہایت دلکش اور مفید ہیں۔ بلکہ انصاف یہ ہے کہ اکثر غالب کی بندشوں سے شوخ تر ہیں۔ اُن کی مجتہدانہ اختراعوں میں ذیل کی تراکیب خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنھیں توسیع زبان کی طرف ایک مبارک اقدام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان تراکیب میں لطافت کے علاوہ ایک وصف یہ ہے کہ بڑا خیال عموماً دو لفظوں میں ادا ہو جاتا ہے۔

مثلاً خموشی اثر۔ اجل چارہ۔ آشوب گاہ حشر غم۔ جراحت زار۔ رند حکدہ کش۔ زبان بیہدہ سائل۔ رقیب آفرینی۔ اشک واژونہ اثر۔ بیگانہ آشنا۔ چشم ستارہ بار۔ گوشۂ رخ طراز۔ آہوئے نیمخواب۔ نالہ رخنہ ساز۔ رام نزاکت۔ نالہ ہائے عزا بار۔ سکروح تجرد۔ سیہ کار زلف۔ تیرہ روز چشم جادو۔ پامال سر۔ زہر نوش غم شیریں۔ تلخکام عشق شیریں لب۔ بان غم مانوس وغیرہ وغیرہ۔

(۱۰) مقطع۔ مومن مقطع میں ہمیشہ اپنے تخلص سے فائدہ لیتے ہیں اور

خاص لطف پیدا کر لیتے ہیں چند مثالیں اوپر مذکور ہوئیں۔ کچھ شعر اور سنئے

دشمنِ مومن ہی رہے بت سدا　　مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا
ہجرِ بتاں میں تجھ کو ہے مومن تلاشِ مہر　　غم پر حرام خوار توکل نہ ہو سکا
ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے　　مومن غمِ مآل کا آغاز دیکھنا
جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے　　جورِ اجل تفرقہ پرداز تو دیکھو

ج۔ تصویر کا دوسرا رُخ

ساقی مئے ناب دارد اما　　در خورد خمار ما ندارد

اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ مومن کا کلام کیف و لطافت میں جواب نہیں رکھتا تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہمارے موجودہ زمانہ کے معیار کی رو سے اُس میں کہیں کہیں بعض خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ایک ناقد کا یہ فرض ہے کہ تصویر کے روشن رخ کی طرح اُس کے تاریک رخ کو بھی منظرِ عام پر لائے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کلامِ مومن کے نقائص پر بھی مختصر بحث کی جائے۔ اصل یہ ہے کہ عرفی کی طرح مومن کی اُٹھان بھی خوب ہوئی۔ مگر اسے پوری ترقی کا موقع نہ ملا۔ اگر اُن کی عمر وفا کرتی اور اُن کی جدت انداز پسندی اور لاابالیانہ وارستہ مزاجی اتنی مہلت دیتی تو اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری میں اُن کا جواب نہ ہوتا۔ انہوں نے شاعری کو پیشہ کی حیثیت سے کبھی اختیار نہیں کیا۔ البتہ تفریح کی حیثیت سے پسند کیا اور اپنے دوسرے مشاغل کی طرح سامانِ دل لگی سمجھا۔ یہی سبب تھا کہ اُن کے کلام میں چند نقائص رہ گئے۔ یہاں اپنی ذاتی رائے عرض کرنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے

باخبر اور بالغ نظر دوست سبطین احمد صاحب بی۔اے۔ بدایونی کے خیالات مومن کی نسبت بیان کر دیے جائیں۔ موصوف شدت سے مومن کے منکر اور غالب کے معتقد واقع ہوئے ہیں۔ انھوں نے کلام مومن کے مطالعہ کے بعد جو فرد جرم مومن پر لگائی ہے حسب ذیل ہے۔

(۱) مومن کے یہاں تصنع آمیز پیچیدگی اور دقت نظر ہے۔ علو تخیل اور بلندی فکر نہیں۔

(۲) ان کا میدان محدود ہے۔ وہ مناظر و مظاہر عالم سے غیر متاثر نظر آتے ہیں اور معشوق خود اور رقیب کے سوا سب سے بے تعلق۔

(۳) ان کا عشق پست اور بے لگام شہوانیت کا مظاہرہ ہے۔ جس میں پردہ۔ چلون۔ روزن اور دوپٹہ کے سوا اور کسی کی گنجایش نہیں۔

(۴) زبان میں خامیاں ہیں اور متروکات کا جو اسی زمانہ میں ترک ہو رہے تھے استعمال زیادہ ہے۔ مثلاً افغاں (فغاں)۔ جاے (جا) کبھو (کبھی) مُوا (مرا) ہو (ہوکر)۔ اظہار نون مضاف الیہ وغیرہ۔

(۵) تعقیدات سے شعر اکثر معما بنکر رہ جاتا ہے

(۶) رعایات و صنائع کی بھرمار سے کلام میں بے لطفی آگئی ہے۔

(۷) مترادفات اکثر بے ضرورت استعمال کئے ہیں اور انتخاب الفاظ اچھا نہیں

اگرچہ راقم کے خیال میں ان میں سے کئی اعتراضات صحیح ہیں۔ تاہم انصاف کے معنی یہ ہیں کہ کسی شاعر یا ادیب کو اسی کے زمانہ کے مسلمہ معیار سے جانچا جاے متانت و ثقاہت کا معیار ہمارے زمانہ میں بلند سہی لیکن مومن کے زمانہ میں عام طور پر اس قدر تشدد نہ تھا۔ یہی حال زبان کا ہے۔ ان کے جو الفاظ و محاورا

آج ہمارے مذاقِ سماعت پر گراں گذر رہے ہیں۔ دوسرے اساتذہ مثلاً غالب و ذوق وغیرہ کے یہاں بے تکلف پائے جاتے ہیں۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد ہم ہر اعتراض کو فرداً فرداً لیتے ہیں۔ اولاً یہ بالکل صحیح ہے کہ مومن نے اپنی ندرت پسندی اور روشِ عام سے علٰحدگی کی بنا پر اپنی راہ دنیا سے الگ نکالی نتیجہ یہ ہوا کہ خیالات کی پرواز اور اسلوب بیان کی جدت میں غالب جیسا باکمال بھی اُن سے پیچھے رہ گیا۔ یہی نازک خیالی جب حد اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو شعر چیستاں بنکر رہجاتا ہے۔ اس اغلاق و تکلف کی چند صورتیں ہیں کہیں وہ مسلمات عام سے انحراف کرتے ہیں۔ اسی لئے خیال بعید از فہم ہوجاتا ہے۔ مثلاً

اُن سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی ۔ مجھکو میری شرم نے رسوا کیا

جَور کا شکوہ نہ کروں ظلم ہے ۔ راز مرا صبر نے افشا کیا

ہر چند اضطراب میں میں نے کمی کی ۔ تو بھی نہ واں تغافل بسیار کم ہوا

یا کہیں محتمل الوجوہ اشعار سے کلام کی دِقت بڑھا دیتے ہیں۔ جیسے۔

نقدِ جاں تھا نہ سزائے دیتِ عاشق حیف ۔ خونِ فرہاد سرِ گردنِ فرہاد رہا

گر پاس ہے لوگوں کا تو آجا کہ قلق سے ۔ ہے لاش کہیں اور کہیں دفن ہے ہمارا

یا کسی غیر مشہور واقعہ یا نقص یا جزیہ یا رسم پر شعر کی بنیاد رکھتے ہیں۔ مثلاً

تیشہ کچھ دشنۂ شیریں یہ نہیں اے غیرت ۔ اپنے ہی خوں سے مگر دامنِ فرہاد بھر

جلتا ہوں اہل نار کی تبدیل جلد سے ۔ مومن غضب ہے آتش لذت فزائے داغ

خیالِ خواب راحت ہے علاج اس بدگمانی کا ۔ وہ کافر گور میں مومن مرا شانہ ہلاتا ہے

گر نگاہِ ناز کو مشقِ ستم منظور ہے ۔ دشمن اپنی نرگسِ تربت قلم کیونکر کرے

یا مضمون کی درمیانی کڑیاں حذف کردیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ سامع بھی اس

خلا کو پُر کرے گا۔ وسیع خیال کو یوں مختصر عبارت میں ادا کرنے سے شعر دقیق ہو جاتا ہے۔

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا — میں الزام اُن کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا
عدو اس اوجِ پرشاکی ہے شاید غصہ آجاوے — ملا دے خاک میں یہ تو بھی شکرِ آسماں کیجے

یا ضمائر کے فقدان یا ابہام سے شعر کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنا دیتے ہیں۔

کیا شاد شاد ہوں کہ وہ ہے تلخ کام تر — میری جو شور شوں نے عدو کو مزا دیا
شبِ وصل اُسکے تغافل کی نہیں تاب نہیں — تلخیِ مرگ ہے آنکھوں میں شکر خواب نہیں

مثالیں بالقصد غزلیات سے لی گئی ہیں۔ ورنہ اُن کے تمام کلام کا یہی حال ہے۔ چونکہ اس ایڈیشن میں غزلیات کی شرح موجود ہے اس لئے مثالوں کی تشریح غیر ضروری سمجھی گئی۔ رہا علوِ تخیل۔ اگر اس سے مراد حقائق فلسفہ و تصوف کا بیان ہے۔ تو درحقیقت کلام مومن اس سے خالی ہے۔

ثانیاً یہ درست ہے کہ اُنھوں نے غزل کو "حکایت با معشوق" کے دائرہ میں محدود رکھا۔ مگر یہ کوئی عیب نہیں۔ تفصیل تغزل کے بیان میں اوپر آپ پڑھ آئے ہیں۔

ثالثاً ابتذال کے داغ سے اُن کا دامن عموماً پاک ہے۔ مزید بحث موازنہ جرأت و مومن میں آئے گی۔

رابعاً اُن کی زبان میں چند خامیاں ضرور ہیں مگر دوسرے ہم عصر اساتذہ سے زیادہ نہیں۔ مثلاً چند شعر غالب کے ملاحظہ ہوں۔

تاک نے جی میں کیوں رہے ارمان — آئے یہ گوے اور یہ میداں (بجائے گو)
کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے — یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی (کسی)

عارضِ گُل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے (دیکھا)

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے (انغانون صحیح)

ذوق کی زبان دونوں سے زیادہ صاف و شستہ ہے۔ مگر اُن کا کلام بھی ایسے اسقام سے پاک نہیں۔ مثلاً

فلک کا رنگ جو ابتک سیاہ ہے اُسپر
پڑا تھا سایۂ بختِ سیہ کبھو میرا (کبھی)

سرِ وقتِ ذبح میرا اُس کے زیرِ پا ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جا ہے (پا۔جا)

تھا تو بہا میں بیش پر اُس لب کے سامنے
سب مول تیرا لعلِ بدخشاں ہوگیا (انغانون صحیح)

لغزشوں کا استقصا مقصود نہیں۔ جو مثالیں یاد آئیں نقل کر دی گئیں۔ درحقیقت مومن اپنی وارستہ مزاجی سے صحت زبان اور صفائی بندش کی پروا نہیں کرتے تاہم چھوٹی بحروں میں اکثر اُن کی زبان اس قدر پاکیزہ اور سلیس ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ خاصاً اُن کے کلام میں تعقید زیادہ ہے۔ جس سے ناہمواری اور اشکال پیدا ہوگیا ہے۔ اس باب میں وہ یقیناً بے احتیاط اور غالب سے بھی زیادہ بدنام ہیں۔

غریقِ گریۂ خونیں رہا نہ کر مومن
لباس یعنی پہنتے نہیں مسلماں سرخ

ہے کفر و بدعت ایک نہیں تار سبحہ سے
زنار مومن آئے ہے کیوں برہمن کی یاں

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے
منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

میں احوال دل مرگیا کہتے کہتے
تجھے تم نہ بس بس سُنا کہتے کہتے

اُن کی عادت ہے کہ جملے کا ایک ٹکڑا ایک مصرع میں اور دوسرا ٹکڑا دوسرے میں لاتے ہیں۔

بے حجابی کا گلہ کیجے تو کہتا ہے ترے
پردۂ چشم کی تقصیر کہ حائل نہ ہوا

غم خانہ تنگ و تار ہے اور ہم سیاہ روز
جلتے ہیں اپنی چاہیے آنکھوں میں پھر چراغ

سادساً یہ اعتراض کہ اُن کے یہاں صنائع کی بھرمار ہے نادرست ہے۔ صنائع کا استعمال اہل لکھنؤ کے یہاں سکہ رائج کی طرح ہے۔ دہلی کے اساتذہ عموماً ان تکلفات سے پرہیز کرتے ہیں۔ مومن کے ابتدائی کلام میں جہاں ناسخ کا تتبع پایا جاتا ہے۔ رعایات ضرور ہیں۔ مگر یہ اُن کا عام رنگ نہیں۔ ایک زمانہ میں رعایات کو سرمایہ آرائش کلام سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب ارباب ذوق صحیح ان باتوں کو معیوب جانتے ہیں۔ اس بارے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ رعایت اگر بے ساختہ ہو تو معیوب نہیں بلکہ محمود ہے۔ رہا رعایت کی نوعیت کا فیصلہ یہ مذاق سلیم کے ذمہ ہے۔

سابعاً چند شعروں میں کسی عیب یا حُسن کو دیکھکر کلام کے عام رنگ پر رائے قائم کرنا صحیح نہیں۔ استعمال مترادفات و انتخاب الفاظ کی بابتہ جو فیصلہ قائم کیا گیا ہے اسی قبیل سے ہے۔ جو الفاظ مثالاً دیئے گئے ہیں مثلاً کھسکنا آنکھ دکھانا۔ جی سنسنانا۔ ٹھیک بتانا چنداں معیوب نہیں جبکہ اور ہمعصر اساتذہ کے یہاں بھی یہی حال ہے۔

د۔ معاصرین سے موازنہ

قمریاں پاس غلط کردہ خود می دارند ورنہ یک سرو درین باغ بہ بالائے تو نیست

تنقید نگاروں کا طریقہ ہے کہ جب کسی شاعر پر تنقید کرتے ہیں تو اس کے اور اسکے ہمعصروں کے کثیر ہم مضمون اشعار اور بیشتر ہم قافیہ اشعار نقل کرتے ہیں اور اس کے بعد محاکمہ کرتے ہیں جس کا فیصلہ عموماً اُن کے ہیرو ہی کے حق میں ہوتا ہے ہمارے خیال میں یہ طریقہ اُن سائنٹفک بھی ہے اور نادرست بھی۔ ہم مضمون اشعار میں تو رائے قائم کرنا ایک حد تک ممکن بھی ہے گو وہ انھیں اشعار تک محدود

ہو سکتی ہے۔ ہم طرح غزلوں اور ہم قافیہ شعروں میں جو شے مشترک ہے وہ محض بحر یا قافیہ ہے۔ اس لئے وجہ ترجیح قائم کرنا اور زیادہ مشکل اور عمل محاکمہ بالکل ہی سطحی ہوتا ہے۔ یہ مشکل اُس وقت اور بھی کھلتی ہے جبکہ وہ اساتذہ جنکے اشعار زیر موازنہ ہیں قطعی جداگانہ طرز کے مالک ہوں۔

یہ ممکن ہے کہ دس بارہ شعر میں فرداً فرداً مومن اپنے معاصروں سے یا اُن کے معاصر اُن سے اظہار خیال و انداز بیان میں قادر تر ثابت ہوں لیکن کیا وہ فیصلہ انکے مجموعی طرز اور باقی کلام کو دیکھتے ہوئے بھی صادق اور صحیح ٹھہرے گا۔ ہرگز نہیں اسی طرح یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعض غزلیات جن میں مومن۔ ذوق و غالب تینوں کے ہم طرح اشعار ملتے ہیں نقل کی جائیں اور ہم قافیہ اشعار کا موازنہ کرکے کسی ایک کے حق میں منفرداً منفرداً فیصلہ کیا جائے مگر اس سے بڑھکر سطحی اور محدود طریقۂ تنقید اور کیا ہوگا۔ سب پر مستزاد یہ کہ ان تینوں باکمال اساتذہ فن میں ہر ایک کی طرز جدا۔ اسلوب جدا۔ ماحول جدا۔ ذہنیت جدا۔ افتاد مزاج جدا۔ وللناس فی مایعشقون مذاہب۔ مومن کے معاصر اساتذہ میں یوں تو آزردہ۔ احسان۔ ممنون وغیرہ کتنے خوشگو ارباب فن ہیں مگر جو مقبولیت و شہرت ذوق و غالب کو نصیب ہوئی کسی کو نہیں ہوئی لیکن جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا۔ ہر ایک کا انداز الگ ہے اس لئے صحیح موازنہ ناممکن ہے۔ ہمارے نزدیک اگر کوئی شخص ان تینوں نامور اساتذہ کے بارے میں درحقیقت کسی صحیح فیصلہ پر پہنچنے کا خواہشمند ہے تو اُس کے لئے ضروری ہے کہ اُن کی کلیات کا بالاستیعاب مطالعہ کرے اور ہر ایک کے انداز سے اپنی طبیعت کو مانوس کرے۔ اسکے بعد یہ ممکن ہوگا کہ وہ کسی صحیح نتیجہ پر پہونچ جائے۔ اگرچہ طرزوں کے تباین کی بنا پر کوئی وجہ ترجیح تلاش کرنا جب بھی بےسود ہوگا

اس طریقہ پر تینوں کے کلیات کا مطالعہ کرنے کے بعد راقم جس نتیجہ پر پہونچا ہے وہ یہ ہے کہ اُردو شاعری کی کائنات کے یہ موالید ثلثہ اپنے اپنے رنگ میں بے نظیر ہیں اور اصلاً قدر مشترک ان میں بہت کم ہے۔ تاہم اس قدر کہا جاسکتا ہے کہ مومن مثنوی[۱] کے بادشاہ ہیں اور ذوق قصیدے کے۔ رہی غزل اس میں تینوں کا رنگ جداگانہ اور اپنی جگہ بے مثل ہے۔ غزل میں نازک خیالی۔ معاملہ بندی اور سوز و گداز میں مومن اپنے تمام معاصرین سے فائق ہیں۔ اسی طرح صفائی زبان اور محاورہ بندی میں ذوق اور فلسفہ[۲] و تصوّف کے بیان میں غالب سب ہم عصروں سے برتر ہیں۔

یہاں محض بغرض "تفنن" ذوق و غالب و مومن کی ایک ہم طرح غزل کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ موازنہ یا محاکمہ منظور نہیں۔

ذوق

نہیں ثبات بلندیِ عز و شاں کے لئے ۔۔۔ کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے
نگاہِ ناز نے کی دیر ورنہ مَیں تیار ۔۔۔ ہوں کب سے بیٹھا ہوا مرگِ ناگہاں کے لئے
حجر کے چومنے ہی پر ہے حج کعبہ اگر ۔۔۔ تو بوسے ہم نے بھی اُس سنگِ آستاں کے لئے
نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے ۔۔۔ عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لئے
بنایا آدمی کو ذوق ایک جزو ضعیف ۔۔۔ اور اُس ضعیف سے کُل کام دو جہاں کے لئے

غالب

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لئے ۔۔۔ رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے

[۱] ذوق و غالب کے یہاں مثنوی کا وجود نہ ہونے کی برابر ہے۔ غزل و قصیدہ کے علاوہ اور اصناف بھی ان دونوں کے کلام میں زیادہ نہیں اور جو ہیں اُن میں کوئی خاص نُدرت نہیں۔ [۲] غالب کے مقابلہ میں بعض اہل قلم (مثلاً جناب معجز سہسوانی) نے کھینچ تان کر فلسفہ و تصوف کے مضامین مومن کے یہاں تلاش کئے ہیں مگر یہ سعی مشکور نہیں معلوم ہوتی۔

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے — رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کے لئے
فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں — دراز دستیِ قاتل کے امتحاں کے لئے
رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک — بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے
ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا — صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

مومن

دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لئے — سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لئے
خلافِ وعدۂ فردا کی ہم کو تاب کہاں — امید یک شبہ ہے پاس جاوداں کے لئے
سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں — کہ سخت چاہیئے دل اپنے رازداں کے لئے
حجاب چرخ بلا ہے ہوا کرے بیتاب — فغاں اثر کے لئے اور اثر فغاں کے لئے
رواں فزائی سحرِ حلال مومنؔ سے — رہا نہ معجزہ باقی لبِ بتاں کے لئے

ان تمام باتوں کے باوجود اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ اوصاف جو نفس تغزل کے لئے ضروری ہیں مومن کے برابر کسی کے کلام میں نہیں ملتے ذوق کا تو انداز بالکل ہی جدا ہے۔ غالب کے یہاں نازک خیالی کی صفت ضرور ایسی ہے جس میں وہ مومن کے شریک ہیں لیکن شریک غالب نہیں۔ اس کے علاوہ اکثر ایک ہی بات کو دونوں ادا کرتے ہیں مگر مومن غزلیت کی رنگینی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور غالب کے یہاں وہی مضمون خشک فلسفہ بنکر رہ جاتا ہے۔ مثلاً

غالب۔ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
مومن۔ چھوٹنا کہاں اسیرِ محبت کی زندگی — ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے
غالب۔ خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ — کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

مومن۔ مانگا کرینگے اب سے دعا ہجر یار کی　　آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

غالب۔ بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالب　　کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

مومن۔ مومن نہ سہی بوسہ پا سجدہ کرینگے　　وہ بُت ہے جو اوروں کا تو اپنا بھی خدا ہے

شعر کا حُسن و قبح ایک وجدانی شے ہے اور امور وجدانی میں دو رائیں ہونا تعجب نہیں۔ اس لئے مومن و غالب کے کلام و طرز کی نسبت ناقدین میں اختلاف رائے ہوسکتا ہے۔ البتہ اس سے ہرگز اختلاف نہیں ہوسکتا کہ جامعیت علوم و فنون۔ قدرت نثر و نظم فارسی ہمہ گیری اصناف شعر۔ جوش مذہب۔ مدح میں خودداری غزل میں طرز خاص کے اوصاف "مجموعی طور پر" مومن کے سوا اُردو کے کسی اُستاد کے یہاں نظر نہیں آتے۔

۵ - جرات و مومن

خوش بود گر محک تجربہ آید بمیاں　　تا سیہ روے بود ہر کہ درو غش باشد

جرات و مومن میں صرف ایک وصف ہے جو باہم مشترک نظر آتا ہے۔ یعنی معاملہ بندی۔ اسی لئے دونوں میں موازنہ کرنے کی ہمیں جرات ہوئی۔ مگر موازنہ میں ہم اپنی ناچیز راے بیان کرنے کے بجاے صفیر بلگرامی کی قابل قدر فیصلے کے نقل کرنے پر اکتفا کرینگے۔ وہ فرماتے ہیں۔

جُرات اس رنگ کے موجد تھے۔ مگر بہ سبب کم علمی کے بہت کُھل گئے تھے مومن خاں کے علم نے ان واقعات کو مشکل بندش اور نرالی ترکیبوں سے ایسے پردے میں رکھا کہ اداشناس ہی اُسکے مزے کو جانتا ہے (جلوۂ خضر) اس دعوے کے اثبات کیلئے دونوں کے چند شعر لکھے جاتے ہیں۔

جرات

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا　　چمپئی رنگ اُس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا

بات ہی اول تو وہ کرتا نہیں مجھ سے کبھی | اور جو بولے ہے کچھ منہ سے تو شرمایا ہوا
بے سبب جو مجھ سے ہے وہ شعلہ خو سرگرم جنگ | مَیں تو ہوں حیراں کہ یہ کس کا ہے بھڑکایا ہوا
جاؤں جاؤں کیا لگایا ہے ابھی بیٹھے رہو | ہوں مَیں اپنی زیست آگے ہی سے اُکتایا ہوا
حکم بار مجلس اب جرات کو بھی ہو جائے جی | یہ بچارہ کب سے دروازے پہ ہے آیا ہوا

مومن

کیا قہر طعن بوالہوس بے ادب ہوا | جرم رقیب قتل کا میرے سبب ہوا
بوسے دم غضب لئے اَلٹی سمجھ تو دیکھ | بل جو پڑا جبیں پہ تمنا کو لب ہوا
کس دن تھی اُسکے دل میں محبت جو اَب نہیں | سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا
جی طعن وصل حور سے کیسا جلا دیا | روزِ جزا کا ذکر جو محفل میں شب ہوا
رابطِ بتان دشمنِ دیں اتہام ہے | ایسا گناہ حضرتِ مومن سے کب ہوا

ان اشعار ہی پر موقوف نہیں۔ تمام کلام کا یہی حال ہے۔

و۔ فارسی کلام مومن

اینکہ می گویند آں بہتر ز حسن | یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

دہلی کے اکثر اساتذہ اُردو کی طرح فارسی میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ غالب۔ رخشاں۔ حسرتی۔ آزردہ کے کمالات کو کون نہیں جانتا۔ مومن کی جامعیت دیکھیے کہ اُنھوں نے فارسی[1] کی طرف توجہ کی تو اُس میں بھی وہ رتبہ پایا کہ غالب سا بلند پایہ ادیب بھی اعتراف کرنے پر مجبور ہوا۔

ہمدم را خوش نفسانند سخنور کہ بود | باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دم شاں

---

[1] فارسی کلام مومن پر مفصل تبصرہ اسی عنوان سے ۶ صد ہوا تو راقم نے الناظر (لکھنؤ) میں شائع کرایا تھا۔

مومن و نیر و صہبائی و علوی آگاہ — حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں
غالب سوختہ جاں گرچہ نیرزد بشمار — ہست در بزم سخن ہم نفس و ہمدم شاں

مومن کا مجموعہ فارسی نثر و نظم دونوں پر مشتمل ہے اور ۱۲۷۱ھ میں اُن کے عزیز حکیم محمد احسن اللہ خاں کے اہتمام سے مطبع سلطانی واقع قلعہ دہلی میں شائع ہوا۔

انشائے مومن - کلام نثر چند خطوط و مکتوبات اور تقاریظ و خطبات کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً خود یا دوسروں کی فرمایش سے لکھے گئے ہیں۔ اس طرح کُل مجموعہ تین قسم کی تحریروں پر مشتمل ہے (۱) وہ خطوط جو اُنھوں نے خود کسی دوست یا عزیز کو لکھے ہیں اور جو اُن کی طرز تحریر کا صحیح نمونہ ہیں (۲) وہ خطوط جو "مخاطب کی نافہمی" پر نظر کرتے ہوئے معمولی انداز میں لکھے ہیں یا کسی کی فرمایش سے تحریر کئے ہیں (۳) تقریظیں - خطبے اور دیباچے نثر کا انداز اُس زمانہ کی عام فارسی نثر سے ملتا ہوا ہے۔ ہر ہر قدم پر مقفیٰ فقرات۔ صنائع و رعایات تحریر کی رنگینی - تشبیہات و استعارات کی فراوانی - مبالغہ کی کثرت مضمون کی کمی اور عبارت کی طوالت نمایاں نظر آتی ہے - کہیں کہیں آیات قرآنی کی تضمین یا اصطلاحات علمیہ کا استعمال اس خوبی سے کیا ہے کہ اُن کے تبحر علمی کی داد دئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ اس کے ساتھ ہی اُن کی تصانیف ہر ہر قدم پر اُن کی طرز زندگی اور اُفتاد مزاج کی پردہ دری کرتی ہیں - وہی عاشقانہ چھیڑ چھاڑ - وہی شاعرانہ تعلّی و خودستائی جو نظم میں ہے نثر میں بھی موجود ہے بندشوں کی ندرت اور زبان پر قدرت کے ساتھ کہیں کہیں اپنی آشفتہ بیانی میں اظہار جوش اور ارباب زمانہ کی قدر ناشناسی پر تأسف اس خوبی سے کیا ہے کہ بے ساختہ دل سے داد نکلتی ہے - ذیل کے فقروں سے اُن کے رنگ کا

شاید کچھ اندازہ ہو۔ "از قدر ناشناسی و سخن نا فہمی ہیچکس خریدار نیست و جواہر زواہرم را بہ شہر نگی نیز رونق بازار نے گرد کساد آنقدر نشستہ کہ طوفان نوح از متاع تختہ بندم نتواند بردن و زنگار ناروائی آں چناں نہ بستہ کہ غبار صرصر عاد آئینہ ام را صیقلا خواہد آوردن۔ یوسفم را بہ کلاوۂ پیرزال ہمی نخرند و از چاہ کنعانی بسیم قلب ہم نمی برند۔ با اعجاز ید بیضا ہیچ دستم و با دم عیسوی آزار پذیر۔۔۔"

دیوان مومن (فارسی)۔ کلام نظم فارسی ۱۱ قصائد۔ مثنوی و غزلیات۔ قطعات۔ تواریخ۔ رباعیات اور ایک مختصر مثنوی پر مشتمل ہے۔ مومن کی غیرت نے کبھی اہل دنیا کی مدح کرنی گوارا نہ کی۔ چنانچہ فارسی قصائد میں بھی چار نعت شریف میں اور دو اپنے مرشد (امام) سید احمد صاحب رائے بریلوی کی منقبت میں لکھے ہیں۔ قصائد کو پڑھ کر پہلی نظر میں جو امر متبادر ہوتا ہے وہ ان کا حسن عقیدت اور جوش مذہب ہے جو ان کے مذہبی ماحول کا نتیجہ ہے۔ دوسری چیز ان کا جذبہ ملی ہے جو ایک ایک قدم پر نمایاں رہتا ہے۔ سب پر مستزاد وہ استغنائے طبعی ہے جس نے ان کی انفرادیت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ یہ تو قصائد کا اخلاقی پہلو تھا۔ ادبی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو بھی تشبیب میں مضامین عشقیہ کی افراط۔ زار نالی و شکایت روزگار کا جوش۔ زور بیان اصطلاحات علمیہ۔ تراکیب جدیدہ ان سب امور کو دیکھتے ہوئے ہم بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ غالب کے فارسی قصائد کے بعد ہی ان کا نمبر ہے۔

غزلیات فارسی کا وہی انداز ہے جو اردو غزل کا۔ نازک خیالی اور بدایع الاسلوبی واردات عشق کا بیان اور طرز ادا کی لطافت اس قدر ہے کہ ان کی غزل تغزل کی پوری ترجمان کہی جا سکتی ہے۔ رہے فلسفہ و تصوف ان کو کوئی غزل کی حدود میں شامل جانے یا نہ جانے مومن حدود غزل سے خارج مانتے ہیں۔ یہاں قارئین کرام

کی ضیافت طبع کی خاطر چند شعر منتخب کئے جاتے ہیں۔

خواہم از درد فراق تو بہ فردا مُردم   خوش کنم خاطر از وعدہ پشیمانِ ترا
آرزو زماں زماں بہ درت درد انتظار   صد وعدۂ نہ کردہ وفا می کنیم ما
ناصح کہ چاک خرقۂ من بخیہ می زند   یارب نہ بیند آں صنم جامہ زیب را
رحمے چہ می کنی بہ گمانِ جنونِ شوق   پیراہنِ رقیب قبا کردہ ایم ما
بیکسی بنگر کہ بر تابوت من   چشم گریانست خاص و عام را
محتسب را نگلی خوئے تو شستم مومن   کاش دریا بدو تا بہ سوئے میخانہ ما
باز گر دید ز کوئے تو بجائے قاصد   کہ غلط کردہ بہ پرسش رہِ غم خانۂ ما
روزِ جزا از قتل من انکار می کند   گویا کہ طرز خندۂ او ہم گواہ نیست
مرا کہ بندہ نوازی ہم از صنم دیدم   چہ بیم روز جزا کار با خداوند است
دلم ربودی و دانم چہ مشکل افتاد ست   مرا معاملہ عمرے بایں دل افتاد ست
مومن آہنگ حرم کرد ز بیداد بتاں   بس بجاں آمدہ شاید دو سہ منزل برود
مُردم و مشکلش آساں کردم   رحم بر بازوئے جاناں کردم
ایں قدر فتنہ ہا بکار مبر   مایۂ آسماں تباہ مکن
گر با چنیں کسے سرو کارے فتد ترا   ناصح بمرگ من کہ چہ تدبیر میکنی

قطعات و رباعیات وغیرہ بھی اپنے رنگ میں خوب ہیں۔ اور اُن کی پختہ مشقی کا ثبوت۔ غرض یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ شاعری کے داخلی پہلو اور تغزل کے اعتبار سے ایک بلند پایہ شاعر اور فارسی ادبیت کے لحاظ سے بھی ایک ممتاز اُستاد ہیں اور اُن کے معاصرین میں صرف مرزا غالب ہی ایک شاعر ہیں جو فارسی غزل گوئی میں اُن کے ہمسر بلکہ بعض اعتبارات سے اُن سے

بہتر ہیں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مرزا کو فارسی سے فطری ذوق تھا اور مشق کامل تھی۔ رہے مومن انھوں نے فارسی و اُردو شاعری کو دل کی امنگ سے اختیار کیا اور کبھی ذریعہ معاش نہیں بنایا۔

ز۔ مومن کی عدم مقبولیت

اور اُس کے اسباب

عمر یست در عدم کدۂ وضع محاشی   از نالہ انتقام اثر می کشیم ما

مومن کے معاصرین میں ذوق کی مقبولیت کا سکہ تقریباً پچاس برس بعد تک چلتا رہا۔ جس کا بڑا سبب اُن کے ذاتی کمال اور قلعہ کی حمایت کے علاوہ یہ ہوا کہ آزاد کی تصانیف نے اُن کے نام اور داغ کی شاعری نے اُن کے رنگ کلام کو ملک بھر میں روشن کر دیا۔ ذوق کے بعد جب نئی نسلیں جدید تعلیم کے اثر سے حقائق کی طرف متوجہ ہوئیں تو کلام غالب کی قدر شروع ہوئی۔ اُدھر حالی اور اُن کے بعد ڈاکٹر بجنوری نے غالب کے حقیقی کمالات کو نمایاں کیا اِدھر نظامی پریس بدایوں نے سب سے پہلے دیوان غالب کا صحیح اور دیدہ زیب ایڈیشن شائع کیا۔ پھر تو یہ نوبت ہوئی کہ ایڈیشن پر ایڈیشن اور شرح پر شرح طبع ہونے لگیں جن کا سلسلہ ابتک جاری ہے اور نہ جانے کب تک رہے۔

رہے مومن۔ اُن غریب کے ساتھ شروع سے حق تلفی اور ناانصافی برتی گئی اور ہنوز روز اول سمجھنا چاہئے۔ حد یہ ہے کہ ابتک اُن کے کلام کا عمدہ اور صحیح ایڈیشن یا اُن کا کوئی مفصّل و مستند تذکرہ شائع نہ ہو سکا۔ ہمارے خیال میں اُن کی عدم مقبولیت کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

(۱) مصنف آب حیات اور صاحب گلستان بیخزاں نے شروع سے اُن کے کمالات پر پردہ ڈالا۔

(۲) بقول صاحبِ گلِ رعنا اُن کو کوئی حالی سا نقاد نہیں ملا۔ اُن کے تلامذہ میں سے کسی نے (حتیٰ کہ شیفتہ نے بھی) جیساکہ چاہیے اُن کے محاسن کو اجاگر نہیں کیا۔

(۳) اُن کو تصوف و فلسفہ سے مناسبت نہ تھی۔ یہی سبب ہے کہ ہندوستان کی موجودہ ذہنیت کو اُن کے رنگ سے تباین کلی ہے۔

(۴) اُن کے خیالات کی پیچیدگی اور زبان کی ناہمواری بھی بڑی حد تک اس کی ذمہ دار ہیں۔

(۵) اُن کی غیور طبیعت ہمیشہ درباری تعلقات سے نفور رہی۔ اسوجہ سے بھی اُن کو شہرت کے کافی مواقع نہ ملے۔

(۶) اُن کے کلام میں مذہبیت کا عنصر کافی ہے اور اُسی کے ساتھ وہ مذہبی نوک جھونک سے بھی نہیں چوکتے۔ شاید اس وجہ سے بھی وہ ایک مقبول شاعر نہ ہو سکے۔

(۷) وہ اپنے سامنے کسی اُستاد کی۔ (قدیم ہو یا معاصر) کوئی حقیقت نہ سمجھتے تھے بلکہ ہر ایک کو حقارت سے یاد کرتے تھے۔ حق یہ ہے کہ اس میں وہ غالب سے بھی بڑھ گئے تھے۔

ج - دورِ جدید اور مومن

کشتۂ کہ عشق دار و نگذارد بہ بنیاں　　بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

راقم سطور کو عرصہ سے خیال تھا کہ اس ادبی ناانصافی کی طرف مشاہیر اہل قلم کو

متوجہ کیا جائے جو درحقیقت اس موضوع پر قلم اٹھانے کے اہل ہیں۔ مگر کسی طرف سے صدائے لبیک نہ سنکر اپنی بضاعت مزجاۃ کے موافق خود کام شروع کر دیا۔ جس کی پہلی قسط مجموعۂ قصائد مومن ہے جو عرصہ ہوا شائع ہو چکا اور دوسری قسط زیر نظر غزلیات کا ایڈیشن ہے۔ توقیع قبول زورنیش باد۔ اس کے علاوہ رسائل اُردو۔ الناظر۔ ہمایوں کے ذریعہ سے کبھی کبھی بہی خواہان اُردو کو ادھر توجہ دلانے کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ مومن کی تصویر پہلی بار فقیر کے مقالے کے ساتھ رسالہ اُردو کی معرفت ملک سے روشناس کرائی گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ کوشش صدا بصحرا ثابت نہ ہوئی اور متعدد ارباب قلم اس جانب متوجہ ہوئے اور انھوں نے اس مبحث کو درخور اعتنا سمجھ کر اس پر مفید اور پُراز معلومات مقالات سپرد قلم کئے۔ اگرچہ گذشتہ بے اعتنائی کے کفارے میں ابھی بہت کچھ کرنا ہے اور پبلک کے ایک صدی کے جمود کو توڑنے کے لئے پوری قوت سے کام لینا ہے۔ تاہم حالات امید افزا ہیں جس کی شہادت میں نگار کا مومن نمبر اور عالمگیر وغیرہ کے مضامین کافی ہیں۔ حال میں دو مختصر کتابیں مومن و غالب (از معجز سہسوانی) اور مومن کی شاعری (از عارف ہسوی) شائع ہوئی ہیں جن میں مومن کے کمالات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حق تلفی ہوگی اگر محب محترم فنا فی المومن جناب عرش گیاوی کی مساعی جمیلہ کا ذکر نہ کیا جائے۔ موصوف نے نہایت دیدہ ریزی اور جانفشانی سے مومن کے حالات مہیا کر کے تھوڑا عرصہ ہوا حیات مومن کے نام سے طبع کرائے ہیں۔

اس طول کلام سے اپنی خودستائی اور تعلّی مقصود نہیں۔ عرض گزارش

احوال واقعی منظور ہے اور یہ عرض کرنا ہے کہ ان حالات پر نظر کرتے ہوئے یہ پیشگوئی کرنا بیجا نہیں کہ ملک جلد یا بدیر اس بادشاہ اقلیم سخن کے آستان جلال پر سر جھکائے گا۔

ط۔ ناقدین کی رائیں

بیا بہ بیں کہ چہ فتوی دہند در مستی ہماں گروہ کہ مے را حرام می گفتند

یہاں نامناسب نہ ہوگا اگر چند مشاہیر ارباب فن کی رائیں مومن کی نسبت نقل کر دیجائیں تاکہ اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہو سکے اور یہ متحقق ہو سکے کہ مومن واقعی اس اعتنا کے اہل بھی ہیں یا نہیں۔ رایوں کے لئے کسی تعارف و تشریح کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ اہل الرائے کا نام ہی اصابت رائے کی کافی ضمانت ہے

غالب ۔ "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر (تم مرے پاس ہوتے ہو گویا الخ) مجھکو دیدیتا"۔ (یادگار غالب)

شیفتہ ۔ "بزعم فقیر بقوت شاعری ایشان کم کسے برخاستہ ودر ہر جنس آن چناں مکانتے وافی دارد کہ کسے را در یک صنعت ہم میسّر نیامدہ" (گلشن بیخار)

حالی ۔ "مومن خاں مرحوم اس خصوصیت (نزاکت خیال) میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے ہیں" (یادگار غالب)

آزاد ۔ "ان کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں" (آب حیات)

مولوی کریم الدین ۔ "در باب فنون نظمیہ کے خدا نے ان کو وہ بہرہ دیا کہ اپنے استاد نصیر وغیرہ تمام اقران پر سبقت لے گئے" (تذکرہ شعرائے ہند)

صفیر بلگرامی ۔ "مومن خاں کے علم نے ان واقعات کو مشکل بندش اور نرالی ترکیبوں سے ایسے پردے میں رکھا کہ ادا شناس ہی اسکے مزے کو جانتا ہے" (جلوہ خضر)

سید علی حسن خاں - جہان استادست داناداندکہ پایہ ریختہ از پستی بہ اوج رسانیدہ اوست - غزلیات اولاجواب است و مثنویات او مغز انتخاب - (بزم سخن)

مولوی عبدالغفور خاں نساخ "جمیع اوصاف سخن پر قادر تھے اشعار اُن کے پر مضمون و شیریں و عاشقانہ و نمکین ہوتے ہیں - راقم کے زعم میں اس مزے کی طبیعت کا کوئی شاعر ریختہ گویوں میں گذرا نہیں" - (سخن شعرا)

نواب امداد امام اثر "مومن درد و میر سے مضامین قلبیہ میں کم سہی لیکن اُن کی غزل سرائی پر اہل دہلی بلکہ ہر دیار کے اہل مذاق کو ناز ہونا چاہئے" (کاشف الحقائق)

مولوی عبدالحئی "مومن نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت و لطافت پیدا کر دی ہے وہ اُن کی ذہانت اور جولانی طبیعت کا تماشا گاہ ہے انداز بیان کہیں کیفیت سے خالی نہیں" (گل رعنا)

مولوی عبدالسلام "اُن کی عاشق مزاجی نے اُن کو جرات کے رنگ کی طرف مائل کیا لیکن اُنھوں نے اس میں بھی دلی کی شان کو قائم رکھا اور نہایت متانت و تہذیب کے ساتھ عشق و ہوس کے جذبات ادا کئے" (شعر الہند)

نیاز "اگر میرے سامنے تمام شعرا کا کلام رکھ کر صرف ایک کے انتخاب کی اجازت دیجائے تو بلا تامل کلیات مومن اُٹھا لونگا" (نگار)

رام بابو سکسینہ "مومن کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لئے مشہور ہے اور وہ صاحب طرز ہیں" (تاریخ ادب اُردو)

ظہیر دہلوی - طرز مومن سے نہ آگاہ تھے جبتک کہ ظہیر سچ تو یہ ہے کہ کبھی لطف غزل نے ندیا

بیخود دہلوی۔ زباں ہو داغ کی بیخود تو ہو مضموں مومن کا + بیاں غالب کا ہو اشعار کی وہ شان پیدا کر

حسرت موہانی۔ مرحبا حسرت بنائی خوب تصویرِ سخن + رنگ مومن خوشنما کس درجہ اس پیکر میں تھے

ی - قول فیصل

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو   نفیِ حکمت مکن از بہرِ دلِ عامے چند

مانا کہ مومن کے کلام میں بعض ایسی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے اُن کا رنگ ملک میں رائج نہیں ہو سکتا تاہم اُن کے کمال سے چشم پوشی کرنا آفتاب کی درخشانی سے انکار کرنا ہے۔ قدیم اساتذہ کے کارناموں پر بحث و تمحیص کرنے کا مقصد نہیں کہ اہل فن اُن کے انداز و اسلوب کو ہر حیثیت سے اپنے لئے شمع راہ بنائیں۔ لیکن یہ روش بھی صحیح نہیں کہ اُن کے محاسن سے آنکھیں بند کر کے اُن کی نشر و اشاعت کو گناہ ٹھہرائیں۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ صدق جذبات اور ندرت اسلوب میں کوئی اُستاد مشکل سے مومن کا ہمسر ہو گا۔ نازک خیالی کی صفت میں البتہ غالب اُن کے شریک ہیں مگر دونوں کے کلام کے مطالعہ کرنے والوں پر یہ صداقت آشکار ہو گی کہ مومن اس میں ان سے سبقت لے گئے ہیں۔ پھر دونوں کی تخییل کا میدان مختلف ہے۔ سب پر مستزاد یہ کہ غالب کا کلام منتخب ہے اور مومن کو یہ موقع نہیں ملا۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ مومن کی شاعری میں جو ہمہ گیری ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ اُن کا کلام شعر کی تمام اصناف پر حاوی ہے اور اُس میں ایک طرف نازک خیالی کے جلوے نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف معاملہ بندی کے۔ گویا وہ فغانی کے انداز کے بھی مالک ہیں اور شرف جہاں کے طرز میں بھی ماہر ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اگر کوئی شخص تغزل میں نظیری کو

نازک خیالی میں عرفی کو اور وقوعہ گوئی میں وحشی کو دیکھنا چاہے تو مومن کو دیکھ لے جن کی شاعری بہ یک وقت تینوں کے طرز کی جامع ہے۔

اساتذہ اردو میں ذوق کو تو معرض بحث میں لانا ظلم ہے کیونکہ اُن کی شاعری (خصوصاً غزل) میں لوچ اور ملاحت بہت کم ہے۔ خود مرزا غالب بھی بعض اوصاف میں مومن سے پیچھے ہیں۔ جب یہ حال ہے تو کس قدر حق تلفی ہے کہ اُن کے کلام سے کلام غالب کی نصف بھی اعتنا دریغ کی جائے وقت آگیا ہے کہ ارباب قلم اس فقید المثال استاد کے ساتھ انصاف اور اُس کے محاسن کی قدر کریں۔

الحمد للہ کہ ملک کے مطلع پر جمود کی جو گھٹا چھائی ہوئی تھی اب بتدریج چھٹتی جارہی ہے اور اُمید کی شعاع اپنا چمکتا چہرہ دکھا رہی ہے۔ عجب نہیں کہ آفتاب حقیقت اپنی پوری ضیا پاشیوں کے ساتھ جلوہ دکھائے اور آفاق تمام مطلع انوار بنجائے۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چنانکہ حرف عصا گفت موسیٰ اندر طور

تمّت عشرۃٌ کاملہ

سیاہ نامہ ضیا بار

(۱) مصنف آب حیات اور صاحب گلستان بیخزاں نے شروع سے اُن کے کمالات پر پردہ ڈالا۔

(۲) بقول صاحب گلِ رعنا اُن کو کوئی حالی سا نقاد نہیں ملا۔ اُن کے تلامذہ میں سے کسی نے (حتیٰ کہ شیفتہ نے بھی) جیساکہ چاہئے اُن کے محاسن کو اجاگر نہیں کیا۔

(۳) اُن کو تصوف و فلسفہ سے مناسبت نہ تھی۔ یہی سبب ہے کہ ہندوستان کی موجودہ ذہنیت کو اُن کے رنگ سے تباین کلی ہے۔

(۴) اُن کے خیالات کی پیچیدگی اور زبان کی ناہمواری بھی بڑی حد تک اس کی ذمہ دار ہیں۔

(۵) اُن کی غیور طبیعت ہمیشہ درباری تعلقات سے نفور رہی۔ اسوجہ سے بھی اُن کو شہرت کے کافی مواقع نہ ملے۔

(۶) اُن کے کلام میں مذہبیت کا عنصر کافی ہے اور اُسی کے ساتھ وہ مذہبی نوک جھونک سے بھی نہیں چوکتے۔ شاید اس وجہ سے بھی وہ ایک مقبول شاعر نہ ہوسکے۔

(۷) وہ اپنے سامنے کسی اُستاد کی۔ (قدیم ہو یا معاصر) کوئی حقیقت نہ سمجھتے تھے بلکہ ہر ایک کو حقارت سے یاد کرتے تھے۔ حق یہ ہے کہ اس میں وہ غالب سے بھی بڑھ گئے تھے۔

ح - دورِ جدید اور مومن

کشتۂ کہ عشق دارد نگذارد ت بدینساں ۔ بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

راقم سطور کو عرصہ سے خیال تھا کہ اس ادبی ناانصافی کی طرف مشاہیر اہل قلم کو

متوجہ کیا جائے جو درحقیقت اس موضوع پر قلم اٹھانے کے اہل ہیں۔ مگر کسی طرف سے صدائے لبیک نہ سنکر اپنی بضاعت مزجاۃ کے موافق خود کام شروع کر دیا۔ جس کی پہلی قسط مجموعۂ قصائد مومن ہے جو عرصہ ہوا شائع ہو چکا اور دوسری قسط زیر نظر غزلیات کا ایڈیشن ہے۔ توقیع قبول روز افزوں باد۔ اس کے علاوہ رسائل اُردو۔ الناظر۔ ہمایوں کے ذریعہ سے کبھی کبھی بہی خواہان اُردو کو ادھر توجہ دلانے کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ مومن کی تصویر پہلی بار فقیر کے مقالے کے ساتھ رسالہ اُردو کی معرفت ملک سے روشناس کرائی گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ کوشش صدا بصحرا ثابت نہ ہوئی اور متعدد ارباب قلم اس جانب متوجہ ہوئے اور انھوں نے اس مبحث کو درخور اعتنا سمجھ کر اس پر مفید اور پُراز معلومات مقالات سپرد قلم کئے۔ اگرچہ گذشتہ بے اعتنائی کے کفارے میں ابھی بہت کچھ کرنا ہے اور پبلک کے ایک صدی کے جمود کو توڑنے کے لئے پوری قوت سے کام لینا ہے۔ تاہم حالات اُمید افزا ہیں جس کی شہادت میں نگار کا مومن نمبر اور عالمگیر وغیرہ کے مضامین کافی ہیں۔ حال میں دو مختصر کتابیں مومن و غالب (از معجز سہسوانی) اور مومن کی شاعری (از عارف ہسوی) شائع ہوئی ہیں جن میں مومن کے کمالات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حق تلفی ہوگی اگر محب محترم فنا فی المومن جناب عرش گیاوی کی مساعئ جمیلہ کا ذکر نہ کیا جائے۔ موصوف نے نہایت دیدہ ریزی اور جانفشانی سے مومن کے حالات مہیا کر کے تھوڑا عرصہ ہوا حیات مومن کے نام سے طبع کرائے ہیں۔

اس طول کلام سے اپنی خودستائی اور تعلّی مقصود نہیں۔ عرض گزار

احوال واقعی منظور ہے اور یہ عرض کرنا ہے کہ ان حالات پر نظر کرتے ہوئے یہ پیشگوئی کرنا بیجا نہیں کہ ملک جلد یا بدیر اس بادشاہ اقلیم سخن کے آستان جلال پر سر جھکائے گا۔

ط۔ ناقدین کی رائیں

بیا بہ بیں کہ چہ فتوی دہند در مستی ہماں گروہ کہ مے را حرام می گفتند

یہاں نامناسب نہ ہوگا اگر چند مشاہیر ارباب فن کی رائیں مومن کی نسبت نقل کر دی جائیں تاکہ اُس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہو سکے اور یہ متحقق ہو سکے کہ مومن واقعی اس اعتنا کے اہل بھی ہیں یا نہیں۔ رایوں کے لئے کسی تعارف و تشریح کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ اہل الرائے کا نام ہی اصابت رائے کی کافی ضمانت ہے

غالب :- "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر (تم مرے پاس ہوتے ہو گویا الخ) مجھکو دیدیتا"۔ (یادگار غالب)

شیفتہ :- "بہ زعم فقیر بقوت شاعری ایشاں کم کسے برخاستہ و در ہر جنس آں چناں مکانتے وافی دارد کہ کسے را دریک صنعت ہم میسر نیامدہ" (گلشن بیخار)

حالی :- "مومن خاں مرحوم اس خصوصیت (نزاکت خیال) میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے ہیں" (یادگار غالب)

آزاد :- "اُن کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں" (آب حیات)

مولوی کریم الدین :- "در باب فنون نظمیہ کے خدا نے اُن کو وہ بہرہ دیا کہ اپنے اُستاد نصیر وغیرہ تمام اقران پر سبقت لے گئے" (تذکرہ شعرائے ہند)

صفیر بلگرامی :- "مومن خاں کے علم نے ان واقعات کو مشکل بندش اور نرالی ترکیبوں سے ایسے پردے میں رکھا کہ ادا شناس ہی اُسکے مزے کو جانتا ہے" (جلوہ خضر)

سید علی حسن خاں - جہان استادست داناداندکہ پایہ ریختہ از پستی بہ اوج رسانیدہ اوست - غزلیات اولاجوابست و مثنویات او مغز انتخاب - (بزم سخن)

مولوی عبدالغفور خاں نساخ " جمیع اوصاف سخن پر قادر تھے اشعار اُن کے پرمضمون و شیریں و عاشقانہ و نمکین ہوتے ہیں - راقم کے زعم میں اس مزے کی طبیعت کا کوئی شاعر ریختہ گویوں میں گذرا نہیں " - (سخن شعرا)

نواب امداد امام اثر " مومن درد و میر سے مضامین قلبیہ میں کم سہی لیکن اُن کی غزل سرائی پر اہل دہلی بالکہ ہر دیار کے اہل مذاق کو ناز ہونا چاہئے " (کاشف الحقائق)

مولوی عبدالحئی " مومن نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت و لطافت پیدا کر دی ہے وہ اُن کی ذہانت اور جولانی طبیعت کا تماشا گاہ ہے انداز بیان کہیں کیفیت سے خالی نہیں " (گل رعنا)

مولوی عبدالسلام " اُن کی عاشق مزاجی نے اُن کو جرات کے رنگ کی طرف مائل کیا لیکن انھوں نے اس میں بھی دلی کی شان کو قائم رکھا اور نہایت متانت و تہذیب کے ساتھ عشق و ہوس کے جذبات ادا کئے " (شعر الہند)

نیاز " اگر میرے سامنے تمام شعرا کا کلام رکھ کر صرف ایک کے انتخاب کی اجازت دیجائے تو بلا تامل کلیات مومن اُٹھا لونگا " (نگار)

رام بابو سکسینہ " مومن کا کلام نازک خیالی او بلند پروازی کے لئے مشہور ہے اور وہ صاحب طرز ہیں " (تاریخ ادب اُردو)

ظہیر دہلوی - طرز مومن سے نا آگاہ تھے جبتک کہ ظہیر ہیں سچ تو یہ ہے کہ کبھی لطف غزل نے دیا

بیخود دہلوی۔ زباں ہو داغ کی بیخود تو ہو مضموں مومن کا ✤ بیاں غالب کا ہو اشعار کی وہ شان پیدا کر

حسرت موہانی۔ مرحبا حسرت بنائی خوب تصویرِ سخن ✤ رنگ مومن خوشنما کس درجہ اس پیکر میں ہے

ی - قولِ فیصل

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو ✤ نفیِ حکمت مکن از بہرِ دلِ عامے چند

مانا کہ مومن کے کلام میں بعض ایسی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے اُن کا رنگ ملک میں رائج نہیں ہو سکتا تاہم اُن کے کمال سے چشم پوشی کرنا آفتاب کی درخشانی سے انکار کرنا ہے۔ قدیم اساتذہ کے کارناموں پر بحث و تمحیص کرنے کا مقصد نہیں کہ اہل فن اُن کے انداز و اسلوب کو ہر حیثیت سے اپنے لئے شمع راہ بنائیں۔ لیکن یہ روش بھی صحیح نہیں کہ اُن کے محاسن سے آنکھیں بند کر کے اُن کی نشر و اشاعت کو گناہ ٹھہرائیں۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ صدق جذبات اور ندرت اسلوب میں کوئی اُستاد مشکل سے مومن کا ہمسر ہوگا۔ نازک خیالی کی صفت میں البتہ غالب اُن کے شریک ہیں مگر دونوں کے کلام کے مطالعہ کرنے والوں پر یہ صداقت آشکار ہوگی کہ مومن اس میں ان سے سبقت لیگئے ہیں۔ پھر دونوں کی تخیئل کا میدان مختلف ہے۔ سب پر مستزاد یہ کہ غالب کا کلام منتخب ہے اور مومن کو یہ موقع نہیں ملا۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ مومن کی شاعری میں جو ہمہ گیری ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو (اُن کا کلام شعر کی تمام اصناف پر حاوی ہے اور اُس میں ایک طرف نازک خیالی کے جلوے نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف معاملہ بندی کے۔ گویا وہ فغانی کے انداز کے بھی مالک ہیں اور شرف جہاں کے طرز میں بھی ماہر ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص تغزل میں نظیری کو

نازک خیالی میں عرفی کو اور وقوعہ گوئی میں وحشی کو دیکھنا چاہیے تو مومن کو دیکھ لے جن کی شاعری بہ یک وقت تینوں کے طرز کی جامع ہے۔

اساتذہ اُردو میں ذوق کو تو معرض بحث میں لانا ظلم ہے کیونکہ اُن کی شاعری (خصوصاً غزل) میں لوچ اور ملاحت بہت کم ہے۔ خود مرزا غالب بھی بعض اوصاف میں مومن سے پیچھے ہیں۔ جب یہ حال ہے تو کس قدر حق تلفی ہے کہ اُن کے کلام سے کلام غالب کی نصف بھی اعتنا دریغ کی جائے وقت آگیا ہے کہ ارباب قلم اس "فقید المثال" استاد کے ساتھ انصاف اور اس کے محاسن کی قدر کریں۔

الحمد للہ کہ ملک کے مطلع پر جمود کی جو گھٹا چھائی ہوئی تھی اب بتدریج چھٹتی جا رہی ہے اور اُمید کی شعاع اپنا چمکتا چہرہ دکھا رہی ہے۔ عجب نہیں کہ آفتاب حقیقت اپنی پوری ضیا پاشیوں کے ساتھ جلوہ دکھائے اور آفاق تمام مطلع انوار بنجائے۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چنانکہ حرف عصا گفت موسیٰ اندر طور

تلک عشرۃٌ کاملہ

سیاہ نامہ ضیاؔ۔

کلامِ مومن کا نفسیاتی مطالعہ

(از ضیا احمد)

مشرق ہو یا مغرب، جاہلیت کی تاریکی کا دور ہو یا علم کی روشنی کا زمانہ۔ کوئی ملک اور کوئی دورِ حیات ایسا نہیں جس میں حقیقی ادب کو زندگی سے گہرا تعلق نہ رہا ہو۔ سچ پوچھئے تو ادب کا پودا جس کی جڑیں زمین میں دور تک نہ پھیلی ہوں ہرگز دیرپا اور مستحکم نہیں ہوتا۔ [1] اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ۔ میتھو آرنلڈ ادب کو تنقید (نقد) حیات مانتا ہے دوسرے اہلِ قلم تفسیرِ حیات[2] ٹھیراتے ہیں۔ غرض سب اس کے قائل ہیں کہ وہ زندگی سے پیدا ہوتا ہے اس سے رشتہ رکھتا ہے اور اسی کی خاطر جیتا ہے۔ لیکن جب ہم ادب کو زندگی کی تفسیر یا تعبیر قرار دیتے ہیں تو ہماری کیا مُراد ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان روح و جسم کے امتزاج کا نام ہے۔ اس لئے کبھی اس کے افکارِ ذہنی کا رُخ باطن کے حقائق کی طرف ہوتا ہے اور کبھی ظاہر کے مناظر کی جانب۔ یہی حال ایک فن کار یا ادیب کا ہے۔ کبھی وہ اپنے اندرون کی طرف متوجّہ ہوتا اور اپنے افکار و جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور کبھی وہ اپنے سے نکل کر بیرونی دُنیا میں پہنچ جاتا اور خارجی اشیاء کی تصویر کشی کرتا ہے بہرحال اس کا رشتہ زندگی سے برابر استوار رہتا ہے خواہ وہ شخصی زندگی ہو یا اجتماعی۔ عالمِ انسانی کی حیات سے متعلق ہو یا عالمِ مظاہر کی زندگی اس کا موضوع ہو۔ اسکے برخلاف جس ادب میں نری خیال آرائیاں اور تفریحی چٹخارے ہوتے ہیں۔ اسے صحیح اور پائدار ادب نہیں کہہ سکتے۔ زندگی کی ترجمانی، محسوسات اور واردات کی عکاسی ہی حقیقی ادب کی بنیاد ہے۔ جب عرب کا شاعر سموال بن عادیا کہتا ہے۔ سہ

[3] وَمَا اُخْمِدَتْ نَارٌ لَنَا دُوْنَ طَارِقٍ   وَلَا ذَمَّنَا فِی النَّازِلِیْنَ نَزِیْلُ

تو کیا ہمارے سامنے عربوں کی زندگی کا نقشہ نہیں کھنچ جاتا۔ کیا ہم شاعر کی رہنمائی میں اس کے ماحول میں نہیں پہنچ جاتے اور کیا زندگی کے بارے میں اسکا خاص

---

[1] جب چاہا زمین کے اوپر سے اکھاڑ پھینکا۔ اس کو کچھ ٹھہراؤ تو ہے ہی نہیں۔ قرآن مجید۔

[2] مبادیِ مطالعہ ادب۔ از ہڈسن۔ [3] کبھی ہماری آگ رات کے آنے والے مسافر سے پہلے نہیں بجھائی گئی۔ اور نہ مہمانوں میں سے کسی نے ہمیں کبھی بُرا کہا۔

نظریہ ہم پر آشکارا نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب ہم فرخی کے تصنیف کردہ مرثیہ میں پڑھتے ہیں.

خیز شاہا کہ رسولان شہاں آمدہ اند   ہدیہا بہر تو آوردہ فراوان و نثار

تو کیا محمود غزنوی کی عظمت۔ دوسرے سلاطین کی اس سے عقیدت اور شاعر کے دلی تاثرات کی کیفیت بہ یک وقت ہم پر آئینہ نہیں ہو جاتی۔ جو کچھ ادب کے بارے میں کہا گیا وہ تقریبًا تمام تر شعر پر بھی صادق آتا ہے۔ شعر کی تعریف جو کچھ بھی قرار دی جائے یہ بہر صورت تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ جذبات اور تخیل کی مدد سے زندگی کی ترجمانی کا نام ہے جو موزوں الفاظ میں کی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس ترجمانی کا صحیح حق اسی وقت ادا ہو سکتا ہے۔ جب کہ شاعر کے شخصی تجربات شعر کے سانچے میں ڈھل جائیں۔ کارلائل نے کیا خوب کہا ہے کہ ادب (اس میں شعر بھی شامل ہے) دو قسم کا ہوتا ہے۔ حقیقی آواز اور صدائے بازگشت یعنی بعض ادیب جو محسوس کرتے ہیں وہی بول سکتے ہیں اور بعض سُنی سنائی لے اُڑتے ہیں۔

شعر و ادب میں بہ ہر حال شاعر و ادیب کے ذاتی رجحانات اور شخصی واردات کی کچھ کارفرمائی ضرور ہوتی ہے۔ اس لئے شعر و ادب کے مطالعہ کرنے والے کا فرض ہے کہ شعر سمجھنے کے لئے وہ خود شاعر کی طرف متوجہ ہو۔ اس کی سیرت سے کما حقہٗ آگاہی حاصل کرے۔ اسکے افکار و جذبات کی تہہ میں اُتر کر اس کی شخصیت سے واقعی رابطہ پیدا کرے۔ سچ پوچھئے تو یہی مناسبت طبعی اور وحدت مذاق ہی ہر افادے اور استفادے کی روح ہے جس کے بغیر کچھ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یہ تجربہ ہے کہ شاگرد کو استاد سے اور مرید کو مرشد سے مناسبت کے بغیر کوئی فیض نہیں پہونچتا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شیخ مبالغے کو خاص طور پر ناپسند فرماتے تھے۔ ایک روز ان کی خدمت میں کوئی شخص بیعت کی نیت سے حاضر ہوا۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے خانقاہ کے حوض کو دیکھ کر کہا کہ ہمارے شہر کی مسجد کا حوض تو اس سے بہت بڑا ہے شیخ نے فرمایا اچھا اسے ناپو اور جب وطن جاؤ تو وہاں کے حوض کو بھی ناپنا اور مجھے بتانا۔ مرید نے تعمیل حکم کی اور واپسی پر عرض کیا کہ ہمارا حوض اس سے ایک بالشت بڑا ہے۔ شیخ نے ارشاد کیا جو ایک بالشت بڑا ہو اُسے بہت بڑا نہیں کہتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تم مبالغے کے عادی ہو تمھیں مجھ سے مناسبت نہیں اور اس بنا پر مجھ سے حصول فیض دشوار ہے۔[۱]

ہمارے ملک کے ایک مشہور شیخ وقت بھی جن کی وفات کو ابھی تھوڑا عرصہ گذرا ہے تربیت کے لئے مناسبت کو اوّلین شرط قرار دیتے۔ اور اس کے بغیر کسی کو بیعت نہ فرماتے تھے۔

---

[۱] مواعظ تھانوی۔

غرض شعر کو سمجھنے کے لئے مناسبت ناگزیر ہے۔ اس کے لئے ہمارا فرض ہوگا کہ خود شاعر۔ اس کی شخصیت۔ اس کے نظریۂ زندگی۔ اس کے خیال اور اسلوب کے مآخذ اس کے پیش رو اور معاصرین اور اس کے گرد و پیش کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہوں۔ ان آثار و علل کا تجزیہ کریں جن سے وہ متاثر ہوا اور اس کے عمل اور ردعمل کی تفتیش کے بعد کوئی رائے قائم کریں۔ یہ طریق کار وقت طلب بھی ہے دقت طلب بھی۔ لیکن اس کے بغیر صحیح فیصلہ ممکن نہیں

آج ہم چاہتے ہیں کہ دہلی کے نامور شاعر مومن کے کلام کو اس روشنی میں دیکھیں۔ یعنی شاعر کے ماحول اور شخصیت پر نظر ڈالیں اور مختصراً بتائیں کہ مختلف اثرات نے ان کی شخصیت کو اور شخصیت نے ان کی شاعری کو کیوں کر متاثر کیا۔

اس کے لئے ہمیں پہلے تیرھویں صدی ہجری کے ہندوستان اور خصوصاً دہلی کے عام حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس لئے کہ دلی اُس دَور کی تہذیب، سیاست اور معاشرت کا مرکز تھی۔

تیرھویں صدی ہجری یا انیسویں صدی عیسوی کا نصف اوّل سیاسی اعتبار سے نہایت پُرآشوب تھا۔ حکومت مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھڑک کر بُجھنے والا تھا۔ ملک کا بڑا حصہ عملاً انگریزوں کے زیرنگیں تھا۔ تاہم دکن سے دہلی تک مرہٹے اور پنجاب میں سکھ برسراقتدار تھے مرکزی حکومت کا بندھن ٹوٹنے سے نظام مملکت کی بندھی ہوئی جھاڑو بکھر گئی تھی۔ محکوم قومیں اُبھر رہی تھیں۔ یا اُبھرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں اور اس کے برخلاف حاکم قوم روز بروز پستی اور ابتری کے اتھاہ سمندر میں ڈوبی جارہی تھی۔ نہ ملت اسلامیہ کے سامنے کوئی مقصد تھا نہ رہنمائی کے لئے کوئی قائد۔ ان ہی حالات کی درستی کی غرض سے حضرت سید احمد بریلوی کی قیادت میں وہ تحریک جہاد وجود میں آئی جس کا ہم آگے ذکر کریں گے۔[۵]

تحریک جہاد

یہ زمانہ[۶] ہندوستان کے مسلمانوں کی اخلاقی گراوٹ اور مذہبی پستی کا زمانہ تھا۔ شرک و بدعت کا زور، عیش و تفریح کی گرم بازاری۔ رذیل اور شریف، عالم اور جاہل سب ایک ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ قصر و ایوان سے لے کر جھونپڑوں تک شامت اعمال کی بدلیاں چھائی تھیں۔ خانقاہوں اور علمی خانوادوں کا رنگ بھی بگڑ چکا تھا۔ مسلمانوں کی اس زبوں حالی کو دیکھ کر چند دردمند غیور اور حساس افراد کو جوش آیا اور دہلی کے نامور خاندان ولی اللّٰہی کے ایک نامور فرد مولوی محمد اسمٰعیل

۵؎ سیرت سید احمد شہید۔ ۶؎ سیرت مذکور۔

نے اسی خاندان کے ایک فیض یافتہ بزرگ حضرت سید احمد (ساکن رائے بریلی) کی امامت و قیادت میں پُرجوش اور حوصلہ مند اہل ایمان کو ساتھ لے کر علم اصلاح و جہاد بلند کیا۔

یہ ایک اصلاحی تحریک تھی اور انقلابی پروگرام بھی! عزم یہ تھا کہ مسلمانوں میں مذہب کے نام پر جو مشرکانہ بدعات رواج پاگئی ہیں۔ ان کا قلع قمع کیا جائے اور پنجاب میں مسلمانوں کو اغیار کے مظالم سے نجات دلانے کی سعی کی جائے لیکن افسوس ہے کہ بعض اُمراء کے نفاق اور کچھ امور اصلاحی میں شدت کے باعث اس انقلابی تحریک (۱۲۴۶ھ) کو ختم ہو جانا پڑا۔ اس تحریک کی ناکامی اسلامیان ہند کی تاریخ کا بہت بڑا حزنیہ ہے۔

یہ واقعہ کتنا عجیب تر ہے کہ ان ناخوشگوار اور پراگندہ حالات کے باوجود علمی و ذہنی اعتبار سے اسلامی معاشرت کی حالت دلّی اور قرب و جوار میں اطمینان بخش ہی نہیں، شاندار تھی۔ خیرآباد۔ بلگرام۔ امروہہ۔ بدایوں۔ رام پور۔ گوپامئو اور بھوپال ہی پر موقوف نہیں۔ اکثر شہر اور قصبے علم و فضل کا مرکز اور درس و تدریس کا محور بنے ہوئے تھے۔

دہلی کا خانوادۂ فضل و کمال جس کے سرپرست شاہ ولی اللہ کے بڑے بیٹے شاہ عبدالعزیزؒ تھے اور فرنگی محل کا خاندان جس کی سرداری مولانا عبدالحلیم کے سپرد تھی عرب و عجم میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے تلامذہ اور متوسلین کا سلسلہ تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔

آثارالصنادید کے حوالہ سے اس دور کے چند مشاہیر کے نام یہاں درج کئے جاتے ہیں جن کے کارنامے اگر قوم نے بھلا دئے تو یہ بہت بڑی بدتوفیقی ہوگی۔

صُلحا اور فقرا۔ شاہ غلام علی۔ شاہ ابوسعید۔ شاہ محمد آفاق۔ مولانا فخرالدین۔ شاہ غلام نصیرالدین۔ خواجہ محمد نصیر۔

علماء۔ شاہ عبدالعزیز۔ شاہ رفیع الدین۔ شاہ عبدالقادر۔ مولوی مخصوص اللہ۔ مولوی محمد اسمٰعیل۔ مولوی محمد اسحٰق۔ مولوی محمد یعقوب۔ مولوی صدرالدین خاں۔ مولوی رشیدالدین خاں۔ نواب قطب الدین خاں۔ مولوی عبدالحئی۔ میاں نذیر حسین۔ مولوی مملوک علی۔ مولوی فضل امام۔ مولوی فضل حق۔

اطبّاء۔ حکیم احسن اللہ خاں۔ حکیم غلام نجف خاں۔ حکیم غلام حیدر خاں۔ حکیم غلام حسن خاں

مُومن کی سیرت! علم و فضل کی اس ارزانی میں شعر و ادب کی بھی بہتات تھی مگر حکومت کے گلدستے میں خزاں کا دور دورہ تھا۔ مگر گلزار سخن میں بہار آئی

ہوئی تھی۔ میر اور سودا اور ان کے بعد اُن کے تلامذہ اور دوسرے اساتذہ کے نغموں سے فضا گونج رہی تھی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس وقت دہلی فضل و کمال میں قرطبہ و بغداد کی ہمسری کر رہی تھی تو مبالغہ نہ ہوگا۔ غرض یہ تھا وہ ماحول جس میں مومن[1] ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم غلام نبی خاں کا شمار دہلی کے معزز شرفا میں تھا۔ ان کو شاہ عبدالعزیز سے بڑی عقیدت تھی۔ چنانچہ وہ شاہ صاحب کو بلا لائے اور انھوں نے ہی محمد مومن نام رکھا۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو شاہ صاحب کے بھائی شاہ عبدالقادر سے عربی کی تحصیل کی اور اس کے بعد اپنے باپ اور چچا سے طب سیکھی۔ ذہن و حافظہ شروع ہی سے غیر معمولی تھا۔ ذہانت میں وہ مولوی محمد اسمٰعیل اور خواجہ محمد نصیر کے سوا کسی کو اپنا ہمسر نہ مانتے تھے۔ حافظہ کا یہ حال تھا کہ لڑکپن میں شاہ صاحب کی مجلس وعظ میں شریک ہوتے اور گھر آکر تمام مطالب زبانی سُنا دیتے۔ علوم متداولہ کے علاوہ نجوم، رمل، ریاضی، شطرنج اور موسیقی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ شعر سے فطری ذوق تھا مگر شاعری وغیرہ کو ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔ ان کی شادی خواجہ میر درد کے خاندان میں ہوئی۔ جس سے اولاد میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی یادگار رہے۔ مومن ایک خوبرو اور جامہ زیب انسان تھے۔ اور طرز ماند و بود امیرانہ تھا۔ تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ رنگین طبع اور رنگین مزاج تھے۔ آغاز شباب میں جو بھی بے راہ روی رہی ہو مگر انھوں نے جلد ہی حضرت سید احمد سے (اور بقول صاحب سوانح احمدی سید صاحب کے خلیفہ مولوی ولایت علی عظیم آبادی سے) بیعت کرلی اور آخر وقت تک جادۂ استقامت پر ثابت قدم رہے۔ طبیعت میں خوش اخلاقی خودداری اور نازک مزاجی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ مولوی محمد اسمٰعیل کے ہم جلسہ اور عقیدے میں اُن کے ہم نوا یعنی عمل بالحدیث کے قائل تھے۔ آخر ۱۲۶۸ھ میں اتفاقاً کوٹھے سے گر کر ۵۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔

مومن کی مختصر لائف پڑھ کر ہر شخص اُن کے رجحانات کا اندازہ کرسکتا ہے۔ ان میں کچھ فطری ہیں کچھ اکتسابی۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ ایک خوشحال اور شریعت گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ذہن اور حافظہ بے نظیر پایا تھا۔ مزاج میں رنگینی اور لطافت خودداری اور ثقاہت بدرجۂ اتم تھی۔ ایک طرف تو یہ میلانات اپنا کام کر رہے تھے

---

[1] حیات مومن و آب حیات وغیرہ۔

دوسری طرف شاہ عبدالعزیز کا فیضان، شاہ عبدالقادر کی تعلیم، میر درد کے خاندان سے قرابت۔ مولوی محمد اسمٰعیل شہید کی صحبت۔ اور شاہ سید احمد کی بیعت، یہ وہ محرّکات تھے جو اپنا اثر دکھلائے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

ان دو متضاد قسم کے عناصر کا نتیجہ غالباً یہ ہوا کہ ہمارے شاعر کو مدتوں ایک مستقل ذہنی کشمکش سے دوچار رہنا پڑا۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر　　کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اگرچہ آخر میں مذہبی اثرات دوسرے رجحانات پر غالب آئے تاہم ان کی شاعری میں اس کشمکش کی جھلک کچھ نہ کچھ ہر زمانہ میں ملتی ہے جو ان کے خلوص کی دلیل ہے۔ افلاطون کا قول ہے کہ اچھے ادب (نیز اچھے شعر) کے لئے کامل خلوص اوّلین شرط ہے۔ ادیب کا خلوص اپنی ذات کے ساتھ اپنے تجربات اور اپنے مشاہدات کے ساتھ درحقیقت یہی خلوص یا صدق جذبات شعر کی جان ہے۔ شاعر کے خیال و فکر میں ندرت کا ہونا بھی ایک بڑی چیز ہے۔ مگر نہ اتنی جتنا کہ خلوص۔ اگر یہ نہیں تو کچھ نہیں۔ لیکن اگر حسن اتفاق سے ندرت بھی خلوص کے ساتھ مل جائے تو کیا کہنا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مومن کے یہاں دونوں کا لطیف امتزاج ہے۔

ذکر شراب و حور کلامِ خدا میں دیکھ　　مومن میں کیا کہوں مجھے کیا یاد آگیا
ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے　　مومن غمِ مآل کا آغاز دیکھنا
مومن یہ لاف الفت تقویٰ ہے کیوں مگر　　دلّی میں کوئی دشمن ایماں نہیں رہا
کس میں ہیں ہے مومن وہ کافر صنم　　بس اب پاسبانیٔ دیں ہو چکی!
خدا کی بے نیازی ہائے مومن　　ہم ایمان لائے تھے نازِ بتاں سے

ان اشعار کو محض اس نظر سے نہ دیکھئے کہ وہ غزل میں مقطع کا خاص اہتمام کرتے ہیں اور مومن۔ کافر۔ خدا اور صنم کی رعایت ملحوظ رکھتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی پیش نظر رکھئے کہ یہ اسی کشمکش اور خلوص کے آئینہ دار ہیں جس کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کیا ہے مقطع پر منحصر نہیں اور اشعار میں بھی یہ رنگ جھلکتا ہے۔

کس صنم کو چھڑا دیا واعظ　　لے خدا تجھ سے انتقام میرا
بے سیر دشت و بادیہ لگنے لگا ہے جی　　اور اس خراب گھر میں کہ ویراں نہیں رہا
بے اعتبار ہو گئے ہم ترکِ عشق سے　　ازبسکہ پاس وعدہ و پیماں نہیں رہا

کس کام کے رہے جو کسی سے رہا نہ کام   سر ہے مگر غرور کا ساماں نہیں رہا

تغزل

یوں تو مومن کو تمام اصناف سخن پر استادانہ قدرت ہے لیکن ان کا خاص میدان غزل ہے اور غزل میں وہ مضامین تغزل کے دائرے سے باہر نکلنا گوارا نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ دوسری اصناف (قصیدہ و مثنوی وغیرہ) میں بھی تغزل کا انداز غالب ہے اسی بنا پر بعض ناقد[۵۹] کہتے ہیں کہ ان کی دنیا محدود ہے۔ یہ اعتراض بڑی حد تک درست ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ یہی وصف ان کی کمزوری بھی ہے اور طاقت بھی۔ اگر مراد یہ ہے کہ ان کے تجربات و احساسات میں شخصیت ہے کلیت نہیں۔ ان میں عام حقائق کی جگہ غالب کے برخلاف ذاتی عنصر نمایاں ہے تو ہمیں اس سے انکار نہیں لیکن اگر یہ مقصد ہے کہ وہ فلسفہ و اخلاق و تصوف کی بجائے عشق و محبت ہی کے ترانے گاتے ہیں تو یہ شاعری کے مذہب میں کوئی گناہ نہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو انھوں نے وضع الشیئ فی غیر محلہ سے اجتناب کر کے غزل کو اس کے اصل موضوع (سخن با معشوق) کا پابند کر دیا۔

روح پدرم شاد کہ می گفت بہ استاد   فرزند مرا عشق بیاموز دگر ہیچ

بلکہ یہ ان کا کمال ہے کہ اتنے تنگ موضوع میں اپنے تخیل کے زور سے تنوعات کی وہ وسعتیں پیدا کر دیں جو انھیں کی فکر نادرہ کار کا حصہ تھیں۔ دراصل یہ اعتراض چنداں وقیع نہیں۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ شاعر نے جو کچھ بھی کہا ہے آیا اس میں خیال کی ندرت اور اسلوب کی لطافت پائی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ اس کی زندگی اور شعر میں ہم آہنگی بھی ہے۔ ہماری رائے میں اس خصوص میں مومن کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب یہ ناقدین فن یہ اعتراض کرتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک واقعی شاعر کہنے سے پہلے یہ کبھی سوچنے نہیں بیٹھتا کہ کون مباحث غزل میں داخل کرے اور کس انداز کے مباحث کو خارج کرے۔ وہ کسی مبحث کو اس لئے اختیار کرتا ہے کہ اس کے سوا دوسرے کو اختیار نہیں کر سکتا۔ یہی اُس کی طبیعت کا اقتضا ہے اور اس کی فکر کا خاصّہ! جب وہ اپنے حقیقی جذبات کو چھپائے گا کلام میں "تکلف اور بناوٹ پیدا ہو جائے گی۔ عشقیہ جذبات" شاعری کی جان اور اُس کا جوہر ہیں۔

جب عرب کا شاعر اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

[۶۰] ذکرتک والخطّی یخطر بیننا   وقد نھلت منّا المثقّفۃ السّمر

---

[۵۹] اردو شاعری پر ایک نظر از کلیم الدین۔ [۶۰] اے محبوبہ میں نے تجھے اس وقت یاد کیا جب کہ برچھیاں ہمارے درمیان ہل رہی تھیں

یا بیخودیٔ شوق میں چلا اُٹھتا ہے۔

عجبتُ لمسراھا وانّٰی تخلصت　　الیّ وباب السجن دونیَ مغلق

تو درحقیقت یہ کیفیتیں اس پرگذر چکی ہوتی ہیں عشاق کا رقیبوں سے کشت و خون کرنا۔ زنداں کے مصائب جھیلنا اور معشوقہ کے قبیلہ کا پانی اور چارے کی خاطر کسی دوسری جگہ خیمے منتقل کر لینا عربوں کی زندگی کے عام واقعات ہیں۔ اسی طرح جب مومن اپنے عشق کے جذبات و واردات بیان کرتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ آپ بیتی سنا رہے ہیں۔ مثلاً

چپکے سے ترے ملنے کا گھر والوں میں تیرے　　اس واسطے چرچا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا!

کیسے گلے رقیب کے کیا طعن اقربا　　تیرا ہی دل نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

عشق پردہ نشیں میں مرتے ہیں　　زندگی پردہ در نہ ہو جائے!

یارب کوئی معشوقۂ دلجو نہ ملے اب　　جو اُن کی دعا ہے وہی اپنی بھی دعا ہے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس　　ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہونگے

اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں　　تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے!

توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے　　وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی!

ان کے یہاں "پردہ نشیں" کا کثرت سے مذکور ہونا بھی اسی رازِ نہاں کی پردہ دری کر رہا ہے۔ عام شعرا کے یہاں بھی یہ چیزیں ملتی ہیں مگر حقیقی آواز اور صدائے بازگشت میں کیا نسبت۔ یہ ضرور ہے کہ مومن کے یہاں خصوصاً ابتدائی کلام میں (جب کہ وہ رنگِ ناسخ کی طرف مائل تھے) اور کہیں کہیں بعد میں شاید عام مذاق کے اثر سے رسمی اور غیر حقیقی جذبات کا سراغ بھی ملتا ہے لیکن یہ انکا اصلی رنگ نہیں۔ کاش کچھ ایسے مستند ذرائع دستیاب ہوتے جن کی مدد سے ہم ان کے تمام کلام کو ترتیبِ زمانی کے ساتھ مدوّن کر سکتے اور اس طرح یہ یقین سے بتا سکتے کہ کس عہد تک کونسا کلام دوسروں سے متاثر ہوا اور کس عہد سے انھوں نے اپنی طرزِ خاص ایجاد کی۔

ہاں تو یہ ذکر تھا کہ مومن کی شاعری میں حقیقی آواز کی شان پائی جاتی ہے۔ چند مثالیں اور ملاحظہ کیجیے۔ عشق مجاز میں جہاں بوالہوسی کا پہلو نمایاں ہو (اور مومن کا عشق کچھ اسی قسم کا تھا) ایسے واقعات بھی پیش آجاتے ہیں کہ عاشق کو معشوق کی خاطر رقیب کی مدارات بھی کرنی پڑتی ہے۔ اس مضمون کا پیرایۂ بیان دیکھیے۔ ؎ اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل + میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

لہ مجھے اس کی آمد پر حیرت ہے کہ جب میرے زنداں کا دروازہ بند تھا تو وہ مجھ تک کیوں کر پہنچ گئی۔

دل کی دھڑکن کا سبب فرطِ قلق بھی ہو سکتا ہے اور جوشِ مسرت بھی ۔ لکھتے ہیں ۔

کیا خجل ہوں اب علاجِ بیقراری کیا کروں　　دھر دیا ہاتھ اس نے دل پر تو بھی دل دھڑکا کیا

رقیب اور ناصح کا تذکرہ ان کے یہاں جس تکرار اور انفرادیت کے ساتھ آتا ہے اس سے صاف ان کی روداد محبت کی غمازی ہوتی ہے ۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ۔

ذکر اغیار سے ہوا معلوم　　حرف ناصح بُرا نہیں ہوتا

یعنی میں ناصح کی باتوں کو بُرا سمجھتا تھا مگر ذکر اغیار ان سے بڑھ کر دل خراش ہے ۔ اب ذکر اغیار کے مقابلہ میں ناصح کی باتوں کی مجھے قدر ہوئی کہ وہ اس قدر بُری نہ تھیں ۔ ناصح کی تعریف کا ایک نیا پہلو ملاحظہ فرمائیے ۔

کیا جی لگا ہے تذکرۂ یار میں عبث　　ناصح سے مجھ کو آج تلک اجتناب تھا

مراد یہ ہے کہ میں نے ناحق ناصح سے اب تک پرہیز کیا ۔ اس لئے کہ دورانِ نصیحت میں ذکرِ دوست آتا ہے اور ذکرِ دوست سے دلبستگی کس کو نہ ہوگی ۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو میرا تصور تم کو لا کر میرے پیش نظر کر دیتا ہے ۔ یہ شعر اس قدر مطابق فطرت اور بلیغ ہے کہ بقول خواجہ حالی[۱۵۳] مرزا غالب کہا کرتے تھے کہ کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دیدیتا ۔ اس سے ایک طرف مومن کی ژرف نگاہی اور بالغ نظری کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف غالب کی نکتہ شناسی اور منصف مزاجی ظاہر ہوتی ہے ۔

سُنا ہے کہ کوئی درویش تنہا عالم استغراق میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ اتفاق سے ایک مردِ فضول بھی ادھر آنکلے اور دخل در معقولات کا تو مرض تھا ہی ۔ پوچھ بیٹھے ۔ شاہ صاحب آپ کا اکیلے بیٹھے بیٹھے دل نہیں گھبراتا ۔ جواب دیا میں اکیلا کب تھا ۔ ہاں تم آئے تو اکیلا ہو گیا ۔ سچ ہے ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ایک شعر میں نہایت نیچرل انداز سے محبوب کو ظلم سے روکتے ہیں ۔

دن رات فکرِ جور میں یوں رنج اُٹھانا کب تلک　　میں بھی ذرا آرام لوں تم بھی ذرا آرام لو

نکتہ یہ ہے کہ فکرِ جور ترک کرنے میں میرا ہی نہیں تمہارا بھی فائدہ ہے مگر یہ ٹکڑا (میں بھی ذرا آرام لوں) قصداً اس لئے مقدم رکھا گیا ہے کہ محبوب کو بدگمانی نہ ہو ۔ دوسری جگہ اس سے ملتا ہوا مضمون ہے ۔ لیکن اس کا پیرایہ اس قدر نیچرل نہیں ۔

---

[۱۵۳] یادگار غالب ۔ صفحہ [illegible]

ٹھہر جا جوشِ تپش ہے تو تڑپنا لیکن   چارہ سازوں میں ذرا دم دلِ زار آ جائے

وہ اپنے مطلب کو پیچ سے بیان کرتے اور اس طرح پیش کرتے ہیں کہ مخاطب اس میں اپنا فائدہ سمجھے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جس کو میں مکرِ شاعرانہ سے تعبیر کرتا ہوں اور اس میں وہ تمام اُردو شعراء میں منفرد ہیں۔ مثلاً

نہ ہو وہ بات کہ جس سے وفا میں آئے خلل   کہیں نہ کیجیو ناصح سے شرمسار مجھے

یعنی ناصح تمھیں بے وفا بتاتا ہے اور میں اس کی تکذیب کرتا ہوں۔ خدا کے لئے کہیں تم بے وفائی نہ کرنا کہ اس کا قول سچ ہو جائے اور مجھے قائل ہونا پڑے۔

سُنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں   کہ سخت چاہیئے دل اپنے رازداں کے لئے

مُراد یہ ہے کہ نرم دل شخص میرا حال سُننے کی تاب نہیں لا سکتا۔ سخت دل صرف تم ہو یا رقیب ہے۔ اگر تم نہیں سنتے تو رقیب سے کہوں گا۔

کہا ہے غیر نے تم سے مرا حال   کہے دیتی ہے بے باکی ادا کی!

تمھاری اداؤں کی بے باکی صاف کہہ رہی ہے کہ میرا حال تمہیں غیر (دشمن) کی زبانی معلوم ہوا ہے۔ اگر تم کسی صحیح ذریعہ سے سنتے تو اس قدر دیدہ دلیری سے کام نہ لیتے۔ مثالیں[۱] کہاں تک دی جائیں۔ ادنیٰ جستجو سے سینکڑوں اشعار مل سکتے ہیں جن سے ہمارے دعوے کی تصدیق ممکن ہے۔ یہاں ایک شبہہ کا دور کرنا ضروری ہے۔ جب ہم اچھے شعر کے لئے صداقت کی شرط لگاتے ہیں تو ہمارا مقصود سادہ اور سپاٹ حقیقت کا اظہار نہیں ہوتا۔ ورنہ۔

دندان تو جملہ در دہا نند   چشمان تو زیر ابروانند

کو بھی شعر ماننا پڑے گا۔ بات یہ ہے کہ شعری حقیقت اور سائنٹیفک حقیقت میں آسمان اور زمین کا فرق ہے۔ شعر میں حقیقت اس زاویہ سے بیان کی جاتی ہے جس سے شاعر کا ذہن اُسے محسوس کرتا ہے۔ اس کے برخلاف سائنس کا نصب العین حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے۔ ایک کا نقطۂ نظر موضوعی۔ داخلی اور جذباتی ہے۔ دوسرے کا معروضی۔ خارجی اور عقلی۔ ایک تخلیق کا ضامن ہے۔ دوسرا اضافہ معلومات کا۔ اگرچہ زندگی کی تفسیر دونوں کا موضوع رہی ہے۔ اوپر مومن کی طرزِ خاص کا حوالہ گزرا۔ یہ طرزِ خاص یا اسلوب منفرد (جس کی تفصیل کا یہاں محل نہیں) ان کی مخصوص شخصیت اور انفرادیت کا مظہر ہے۔ اسلوب کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ادیب یا شاعر کی شخصیت کا پرتو اس کی انفرادیت کا اشاریہ ہوتا ہے

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ شرح مومن مرتبہ راقم۔

(STYLE IS THE MAN) ایک ناقد کا قول ہے کہ جو شخص واقعی شخصی تجربہ بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ اس کے واسطے شخصی اندازِ بیان بھی تلاش کر لیتا ہے۔ پوپ نے کہا ہے کہ اسلوب خیال کا لباس ہے مگر صحیح یہ ہے کہ وہ بقول مسٹر کارلائل لباس نہیں بلکہ جلد ہے ایک بڑے شاعر کی پہچان یہ ہے کہ اس کا خیال یا اسلوب دونوں اچھوتے ہوں۔ مومن کے اسلوب میں ان کی ندرت اور تکرِ شاعرانہ۔ شوخی اور طنز نے چار چاند لگا دئے ہیں۔ کچھ مثالیں اوپر گذری ہیں اور کچھ اور پیش کی جاتی ہیں۔

ندرتِ ادا: کیا تم نے قتل جہاں اک نظر میں + کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری | چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا
محفل میں مرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ | بدنامیٔ عشاق کا اعزاز تو دیکھو!
پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے | اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے
(چمن میں کوئی اس کو سے نہ آیا | گئی برباد سب محنت صبا کی)

مکرِ شاعرانہ:

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا | جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں
منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں | اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں
گزر کر وفا سے بھی غصہ ہے تو اب سے | گو قتل کا وعدہ ہو تقاضا نہ کریں گے!
تابِ کم ظرف کو کہاں ۔ تم نے | دشمنی کی عدو سے چاہ نہ کی
وہ بدخواہ مجھ سا تو میرا نہیں | عبث دوستی تم کو دشمن سے ہے

شوخی: ہم چارہ گر کو یوں ہی پہنائیں گے بیڑیاں + قابو میں اپنے گر وہ پری زاد آگیا
کس دن تھی اس کے دل میں محبت جواب نہیں + سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا
لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شبِ فراق + ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں!
ہم حال کہے جائیں گے سنئے کہ نہ سنئے + اتنا ہی تو یاں صحبتِ ناصح کا اثر ہے
توبہ گنہِ عشق سے فرمائیے ہے واعظ + یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

طنز: غیر عیادت سے بُرا مانتے + قتل کیا آن کے اچھا کیا!
فرماتے ہیں وصال ہے انجام کار عشق + کیا ناصح شفیق نے مژدہ سنا دیا
کر علاج جوشِش وحشت چارہ گر + لادے اک جنگل مجھے بازار سے
دیکھ مضطر کیوں نہ پھیرے دشنہ پھر + یار ہے وہ کچھ تماشائی نہیں

شبِ ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے　　　زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے!

وقت اجازت نہیں دیتا ورنہ اشعار مذکورہ میں خیال کی نزاکت کے ساتھ جو بیان کی لطافت ہے اُس کی وضاحت کی جاتی۔ کہا جاتا ہے کہ مومن کی نازک خیالی اور ندرت اسلوب مسلم مگر یہ صحیح شاعری نہیں۔ کیونکہ اول الذکر تاثیر سے مہجور ہے اور آخر الذکر تصنع سے معمور۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں اعتراضوں کی نسبت بھی لگے ہاتھوں دو جملے عرض کر دئیے جائیں۔

تجزیۂ تخیل

اولاً۔ ان کے خیالات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر خیال حسب معمول جذبات اور تخیل کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں انھوں نے واردات محبت کی جو ترجمانی کی ہے اُس کا تعلق جذبات سے ہے جن میں ان کی تخیل نے اپنا رنگ بھر دیا ہے۔ یا یوں کہئے اپنے جذباتی تجربات کو انھوں نے اپنی تخیل کی رنگین عینک سے دیکھا ہے۔ جذبات کی اصلیت و صداقت کی بحث اوپر گذری۔ رہی تخیل۔ یہ دراصل قوت اختراع کا نام ہے جس کے بغیر شعر شعر نہیں کہلاتا۔ البتہ یہ درست ہے کہ اگر شعر میں صرف تخیل کی جلوہ گری ہو تو وہ چیستاں بن کر رہ جائے گا۔[۱۱۵] ہمیں تسلیم ہے کہ مومن کے ہاں تخیل کے اعتدال کے ساتھ اس کی بے اعتدالی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ خصوصاً ابتدائی دور میں جب کہ وہ ناسخ کے پیرو تھے۔ اعتدال کی مثالیں عرض کی گئیں۔ بے اعتدالی کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

بن ترے اے شعلہ رو آتش کدہ تن ہو گیا　　　شمع قد پر میری پروانہ برہمن ہو گیا

تھی کمیں میں غارت بوس دہن ہنگام خواب　　　شب کی بیداری سحر کا خواب رہزن ہو گیا

ہوں غضب سے اس کے سرگرم فغان شعلہ زن　　　جل گیا جی احتراق زہرہ کی تاثیر سے

طوطیاں سیکھیں کہاں سے نالۂ رشک آفریں　　　ہو نہ زیب پشت آئینہ تری تصویر سے

[۱۱۶] ان اشعار سے دماغ کو تو شاید حظ ملے دل کو لذت نہیں ملتی۔ لیکن یہ ادبی ناانصافی ہوگی کہ سب کو ایک لکڑی سے ہانکا جائے۔

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ان کے جذبات و احساسات اصلی اور واقعی سہی مگر انداز بیان اس قدر پیچدار اور تکلف آمیز کیوں ہے۔ اس دورنگی کی آخر کیا وجہ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شخص خوشی یا غم کے کسی حقیقی اصلی احساس سے متاثر ہو۔ اور اس کو ادا

---

[۱۱۵] شرح مذکور۔ [۱۱۶] اردو شاعری پر ایک نظر۔

کرنے کے لئے غیر حقیقی پر پیچ اسلوب تلاش کرے۔ ہمارے خیال میں اس کی وجہ ان کی منفرد شخصیت ہے جو کبھی روش عام پر چلنا گوارا نہیں کرتی۔ حتٰی کہ ان امور میں وہ مرزا غالب سے بھی (جو خود ایک زبردست انفرادی ذہنیت رکھتے تھے) سبقت لے گئے ہیں۔ مومن ایک GENIUS یا نابغہ تھے اور نابغہ مخصوص فوق العادہ ذہنی اور تخلیقی صلاحیت کا مالک ہوتا ہے۔ اس بنا پر اگر انھوں نے اپنے مطالب کو ادا کرنے کے لئے ایک نیا اور غیر متعارف پیرایہ ایجاد کیا تو کیا تعجب ہے۔ اس کے علاوہ سب جانتے ہیں[16] کہ ان کا عشق حقیقی نہیں مجازی ہے۔ مجازی بھی وہ جس سے ہوس پرستی اور کوچہ گردی کی بُو آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے عشق میں پرشتگی۔ اور نامرادی، ربودگی اور خود فراموشی کا کیا کام وہاں تو عاشق یہ چاہتا ہے کہ تھوڑے سے ایثار کے سہارے معشوق سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کیا جائے۔ عجب نہیں کہ اسی داؤ پیچ کے کاروبار نے ان کو تصنّع آمیز اور پیچدار باتوں کا خوگر بنا دیا۔ پروفیسر[17] کلیم الدین احمد نے سودا کی نسبت کہا ہے کہ وہ مصنوعی خیالات کو اصلی کر دکھاتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ مومن اصلی جذبات[18] کو مصنوعی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وَللنّاس فیما یعشقون مذاھب۔ اگر جستجو کی جائے تو مختلف زبانوں کے ادب میں ایسے شعراء مل جائیں گے جو جذبات و حسّیات کے خلوص کے باوجود تصنّع آمیز اسلوب کے مالک ہیں۔ انگلستان[19] کے Metaphysical POETS میں (*Donne*) اور ایران کے شعراء میں[20] خاقانی بڑی حد تک اوصاف بالا کے مصداق ہیں۔ انگریزی کے مشہور[21] ناقد و مصنّف ایلیٹ نے اس موقع پر کتنی باریک بات کہی ہے۔

"It is a fidelity to thought and feeling. Some poets only think; others also feel their thoughts their thought is their experience"

(*Selected Essay*)

---

[16] کاشف الحقائق از امداد امام اثر۔ [17] اردو شاعری پر ایک نظر۔ [19] مابعد الطبیعی شاعری از گریرسن۔
[20] دیکھو قصائد حبیبیہ۔ نیز مقالہ راقم بر خاقانی شروانی (علی گڑھ میگزین) [21] منتخب مقالات از ایلیٹ۔

مومن کی شخصیت (اور اس شخصیت کے وسیلے سے شاعری) پر اثر ڈالنے والے خارجی محرکات کا تذکرہ ضمناً ہو چکا ہے۔ یہاں ہم چاہتے ہیں کہ محرکات مذکورہ پر کسی قدر تفصیلی بحث کی جائے جس کو قصداً سہولت کی غرض سے مؤخر کر دیا گیا تھا۔ مومن کی سیرت کا مطالعہ ہم کو بتاتا ہے کہ وہ GENIUS تھے۔ یہ ضروری ہے کہ ایسی حساس شخصیت اپنے ماحول کا غائر نظر سے جائزہ لے۔ اور حالات موجودہ پر قانع نہ ہو۔ چنانچہ جب انھوں نے ہوش سنبھالا ہوگا اور اپنے گرد و پیش ایک عام سیاسی خلفشار اور مذہبی انتشار کی کیفیت دیکھی ہوگی تو موجودہ صورت حال کو تا امکان بدلنے کی سعی کا جذبہ دل میں پیدا ہوا ہوگا۔ اسی جذبہ کا مظاہرہ ان کا اس عہد کی دعوت جہاد و اصلاح میں شرکت کرنا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کو اس تحریک میں عملاً شریک ہونے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن قلباً وہ ہمیشہ اس کے حامی و موید رہے۔

مذہبی جھلکیاں یہی نہیں بلکہ اس وقت سے ان کا زاویہ نظر ہی بدل گیا جس سے ان کا کلام بہت زیادہ متاثر ہے۔ دینی اور علمی رنگ تو ان پر پہلے ہی چڑھا ہوا تھا۔ سیاسی اور اصلاحی اثرات نے اس کو اور بھی تیز کر دیا۔ دیوان غزلیات کو کھولتے ہی پہلی غزل میں حمد و نعت کے بعد یہ شعر نظر آتے ہیں۔

مجھے وہ تیغ جوہر کر کہ میرے نام سے خوں ہو
دل صد پارہ اصحاب نفاق و اہل بدعت کا

نہ رکھ بیگانۂ مہر امام اقتدا[۱۲] سنت
کہ انکار آشنائے کفر ہے اس کی امامت کا

امیر لشکر اسلام کا محکوم ہوں یعنی
ارادہ ہے مرا فوج ملائک پر حکومت کا!

مقطعوں میں یہ اشارات عام ہیں۔

غنچہ ہائے آرزوئے مومن اب کھلنے کو ہیں
خیر مقدم گلشن ایماں میں آتی ہے بہار

مومن تم اور عشق بتاں اپنے پیر و مرشد خیر ہے
یہ ذکر اور منہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

چل کے کعبہ میں سجدہ کر مومن
چھوڑ اس بت کے آستانے کو

ہم اور یہ بدعت تپش دل کے سبب سے
مومن مرے سینے پہ رہے لیٹ قضا تا

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

مومن نہیں بوسہ پا سجدہ کریں گے
وہ بت ہے جو اوروں کا تو اپنا بھی خدا ہے

حسن انجام کا مومن مرے بارے ہے خیال
یعنی کہتا ہے وہ کافر کہ تو مارا جائے

۱۲؎ حضرت سید احمد رائے بریلوی ۔

ہم بندگیٔ بت سے ہوتے نہ کبھی کافر ہر جائے گر اے مومن موجود خدا ہوتا

یہ ملحوظ رہے کہ ان کی غزلیات میں تصوّف کی سرشاریاں نہیں ملتیں۔ کیونکہ وہ اس شراب کا استعمال طریق کتاب وسنت کے منافی سمجھتے ہیں۔ غزل کے علاوہ دوسری اصناف بھی لامحالہ اسی زاویۂ نظر سے متاثر ہوئی ہیں۔ قصائد[۲۳] میں یہ التزام صرف ان ہی کے یہاں ملتا ہے۔ کہ ترتیب وار حمد، نعت اور منقبت خلفائے اربعہؓ میں جوش عقیدت کے دریا بہائے ہیں اور حسن ارادت کے موتی لٹائے ہیں۔ اسی کے ساتھ دوسرے فرقوں کے مسلک پر جا بجا طعن بھی کرتے گئے ہیں جو ایک پیاک شاعر کے لئے زیبا نہیں۔ وہ خود مسلک کے لحاظ سے غیر مقلد ہیں۔ اور ممکن ہے کہ یہ ان کی تقلید ناپذیر طبیعت کا اثر ہو۔ انھوں نے اہل دنیا کی مدح میں صلے کے حصول کی خواہش سے کچھ نہیں لکھا۔ قطعات ورباعیات میں بھی متعدد مقامات پر مذہبی عقائد اور فرقہ وارانہ مطاعن نظر آتے ہیں۔ رہیں مثنویات[۲۴]، ان میں چند عشقیہ ہیں اور کچھ حمد، نعت، مناجات اور جہاد کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ آخر الذکر مثنویوں کے چند شعر ہم بطور نمونہ پیش کئے دیتے ہیں۔ ان کو پڑھ کر ارباب ذوق خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔

حمد۔ وہ عالم کہ معلوم ہر بات اُسے — نیاز سخن بے اشارات اُسے
وہ قادر کہ گر چاہے اُس کا کرم — مٹا دے مرے دل سے عشق صنم
وہ ناصر کہ گر اُس کی امداد ہو — فغاں سے مری چرخ برباد ہو
وہ حافظ کہ آتش سے خس کو بچائے — تپ عشق سے بوالہوس کو بچائے

نعت۔ محمد سزائے ستائش گری — مدیح آفریں جس کی پیغمبری
وہ اُمّی وَلے نقش بند علوم — کلام اس کے سب دل پسند علوم
عجب بات ہے اُس کی نام خدا — کہ لیضے سخن ہیں کلام خدا
یہ تابش میں انجم کا پایہ نہیں — کہ ان کے ہے ظل۔ اس کے سایہ نہیں

جہاد۔ پلا مجھ کو ساقی شراب طہور — کہ اعصا شکن ہے خمار فجور
کوئی جرعہ دے دیں فزا جام کا — کہ آجائے بس نشہ اسلام کا
بہت کوشش وجاں نثاری کروں — کہ شرع پیمبر کو جاری کروں
نہ کیوں کہ ہوں اس کام میں ناشکیب — ظہور امام زماں ہے قریب

---

[۲۳] قصائد مومن مرتبہ راقم مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ۔ [۲۴] مقالہ راقم۔ مطبوعہ الناظر لکھنؤ۔

اُردو پر موقوف نہیں۔ فارسی کلام میں بھی یہی رنگ ہر جگہ نمایاں ہے۔ چنانچہ فارسی قصائد میں بھی مومن نے اپنے قلم کو اہل دولت کی مدح سے آلودہ نہیں کیا۔ چار قصیدے تو نعت شریف میں ہیں اور دو اپنے امام شاہ سید احمد رائے بریلوی کی منقبت میں جن سے جوش اعتقاد کے چشمے اُبلے پڑتے ہیں۔ انسی کے ساتھ اُن کے جذبۂ حریت قومی اور غیرت طبعی کی وہ شان نظر آتی ہے جس کو دیکھ کر منکر کے لئے ایمان لانا ناگزیر ہوجاتا ہے۔ ایک قصیدے کے چند شعر جو عرفی کی زمین میں کہا گیا ہے پڑھ کر ان کی طبع غیور و حساس کی داد دیجئے۔ دیکھنا ہندوستان میں برطانوی اثر کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو دیکھ کر وہ کس طرح بے چین ہوگئے ہیں۔ اور رسول مقبول (صلعم) سے کس طرح فریاد کرتے ہیں۔

این عیسویاں بلب رسانند — جان من و جان آفرینش
نکشود گرہ ز کار د فرسود — ناخن کہ بنان آفرینش
تا چند بخواب ناز باشی — فارغ ز فغان آفرینش
برخیز کہ شور کفر برخاست — اے فتنہ نشان آفرینش

دوسرے فارسی اصناف کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ خصوصاً قطعات میں ایسے اشارے بکثرت ہیں جس زمانہ میں یہ سطور سپرد قلم تھیں اس وقت ایک نکتہ شناس دوست سے ایک روز سلسلۂ گفتگو چھڑ گیا کہنے لگے کہ یہ مستبعد ہے کہ ایک فوق العادہ فعّال ذہنیت اس قدر منفعل ہو کہ ہر خارجی اثر قبول کرلے۔ راقم نے عرض کی کہ (genius) کی یہ تعریف نہیں کہ گرد و پیش کے واقعات سے اپنی آنکھیں بند کرلے۔ ماحول سے متاثر ہونا تقاضائے فطرت ہے۔ خاص و عام سب پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ایک ان تاثرات کو اپنی شخصیت کے رنگ میں رنگ لیتا ہے اور دوسرا اس سیلاب کی رو میں بہہ جاتا ہے۔

راہ مجنوں و فرہاد ہم آمد در پیش — رفتم ایں راہ و لیکن نہ چو ایشاں رفتم

اس مختصر سے مقالہ میں کلام مومن کے تمام پہلو نمایاں کرنا ممکن تھا نہ ضروری۔ مقصود صرف یہ دکھانا تھا کہ ان کی زندگی اور ان کی شاعری میں کامل ہم آہنگی رہی ہے اور جب تک ہمارے لئے زندگی اور اس کے مسائل سے دلچسپی باقی ہے مومن کی شاعری اور اس کے لطائف کی دلآویزی کم نہیں ہوسکتی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شرح

غزلیاتِ مومن

ردیف الف

تہ کیونکر مطلعِ دیواں ہو مطلع مہرِ وحدت کا
کہ ہاتھ آیا ہے روشن مصرع انگشتِ شہادت کا

بچاؤں[1] آبلہ پائی کو کیونکر خارِ ماہی سے
کہ بامِ عرش سے پھسلا ہے یارب پاؤں دقّت کا

سر[2] شکِ اعترافِ عجز نے الماس ریزی کی
جگر صد پارہ ہے اندیشۂ خوں گشتہ طاقت کا

نہ[3] یہ دستِ جنوں ہے اور نہ وہ جیبِ جنوں کوشاں
کہ ہو دستِ مژہ سے چاک پردہ چشمِ حیرت کا

نہ[4] دے تیغِ زباں کیونکر شکستِ رنگ کے طعنے ذکو
کہ صفہائے خرد پر حملہ ہے فوجِ خجالت کا

غضب[5] تیرے سے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش ہے
نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنّت کا

گلو[6] سے خامہ میں سرمہ مدادِ دودِ دل سے ہے
مگر لکھنا ہے وصفِ خاتمہ جلدِ رسالت کا

سلہ[1] ماہی = ماہی زمین - دقت - نکتہ سنجی - شاعر راہ حمدِ باری کی دشوارگذاری بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں اسقدر چلا کہ پاؤں میں آبلے پڑ گئے - آخر بلند پروازی کرکے بامِ عرش پر پہنچا - لیکن دشواری راہ کے باعث جو پاؤں پھسلا تو سیدھا تحت الثریٰ میں جاکر رکا - اب اپنے آبادں کو زمین کی مچھلی کے کانٹوں سے کیونکر بچاؤں - سلہ[2] اندیشہ (خیال) نے جس کی طاقت حمدِ الٰہی کی کوشش میں خون ہوچکی ہے - اقرارِ عجز کے آنسو گرائے اور ان آنسوؤں نے الماس بنکر اندیشہ کا جگر اور بھی پارہ پارہ کردیا - سلہ[3] مانا کہ دستِ جنوں دیوانوں کے جیب کو چاک کرسکتا ہے - مگر نہ دستِ مژہ دستِ جنوں ہوسکتا ہے نہ پردۂ چشمِ حیرت جیبِ اہلِ جنوں - لہذا دستِ مژہ سے اس پردہ کا چاک ہونا محال - مژہ (پلک) کو دست سے تشبیہ دی ہے - حیرت سے مراد وہ حیرانی ہے جو عارف پر تجلیاتِ الٰہی سے طاری ہوتی ہے - سلہ[4] خرد کو کُنہ باری تک پہنچنے کا دعویٰ تھا - مگر فوجِ خجالت نے اس پر حملہ کیا جس کے باعث خرد کے رنگ کو شکست ہوئی - قاعدہ ہے کہ خجالت سے رنگ اڑ جاتا ہے - اب زبان (جو تیغ کی طرح تیز ہے) خرد کو طعنے دے رہی ہے کہ بس اسی منہ پر یہ دعویٰ تھا ؟ لعنت ہو کا - سلہ[6] جلدِ رسالت کے خاتمہ سے جنابِ ختمِ رسالت کی ذاتِ قدس مراد ہے - چونکہ حضور کا وصف لکھنا مقصود ہے اسلیے قلم کے گلے میں دودِ دل کی سیاہی سرمہ بنگئی ہے - یعنی قلم تحریر سے عاجز ہے - قاعدہ ہے کہ سرمہ کھانے سے آواز بیٹھ جاتی ہے - مطلب یہ ہے کہ سوزِ ناکامی کا دھواں دل سے اٹھکر گلو سے خامہ میں سرمہ بن گیا ہے - سرمہ کی مشابہت مدادِ دود سے ظاہر ہے خامہ اور مداد (سیاہی) اور جلد میں رعایت ہے

نہ پوچھو گرمیِ شوقِ ثنا کی آتش افروزی ۱؎
بنا جاتا ہے دستِ عجز شعلہ شمعِ فکرت کا

نمک ۲؎ تھا بختِ شورِ فکر خوانِ مدحِ شیریں پر
کہ دندانِ طمع نے خوں کیا ہے دستِ حسرت کا

خدایا ہاتھ اٹھاؤں عرضِ مطلب سے بھلا کیونکر
کہ ہے دستِ دعا میں گوشہ دامانِ اجابت کا

عنایت کر مجھے آشوبگاہِ حشرِ غم اک دل
کہ جس کا ہر نفس ہم نغمہ ہو شورِ قیامت کا

جراحت ۳؎ زار اک جاں دے کہ جسکی ہر جراحت ہو
نمکداں شورِ الفت سے مزا آوے عیادت کا

فروغِ جلوۂ توحید کو وہ برقِ جولاں کر
کہ خرمن پھونکدیوے ہستیِ اہلِ ضلالت کا

مرا جوہر ہو سرتاپا صفائے مہرِ پیغمبر
مرا حیرت زدہ دل آئینہ خانہ ہو سنت کا

مجھے وہ تیغ جوہر ۴؎ کر کہ میرے نام سے خوں ہو
دلِ صد پارہ اصحابِ نفاق و اہلِ بدعت کا

خدایا لشکرِ اسلام ۵؎ تک پہنچا کہ آ پہنچا
لبوں پر دم بلا سے جوشِ خوں شوقِ شہادت کا

نہ رکھ بیگانۂ مہرِ امامِ اقتدا سنت
کہ انکار آشنائے کفر ہے اسکی امامت کا

امیرِ لشکرِ اسلام کا محکوم ہوں یعنی
ارادہ ہے مرا فوجِ ملائک پر حکومت کا

زمانہ مہدیِ موعود کا پایا اگر مومن
تو سب سے پہلے تو کہیو سلام پاک حضرت ۶؎ کا

۱؎ شوقِ ثنا کی شدت نے اس قدر آگ بھڑکائی کہ میرا دستِ عجز (جو تحریرِ نعت سے قاصر ہے) شمعِ فکر کا شعلہ معلوم ہوتا ہے۔ شاعر ایک طرف شوقِ ثنا کی شدت بیان کرتا ہے دوسری طرف اپنے عجز کا۔ تو مطلب یہ ہے کہ باوجود عجز شوقِ ثنا بنا ہی دیتا ہے۔
۲؎ حضور کی مدح شیریں کو خوان اور اپنی شوربختی (ناکامی) کو نمک قرار دیا ہے۔ چونکہ دستِ حسرت اس خوان تک نہ پہنچ سکا اسلیے دندانِ طمع نے اسکی خواہش میں جھنجلا کر دستِ حسرت کو کاٹ کاٹ کر خون کر دیا۔ شاعر نے اس کاٹنے کی توجیہ یوں کی کہ شاید خوانِ مدحِ شیریں پر میری فکرِ نارسا کا بختِ شور نمک کا حکم رکھتا تھا جبھی تو اس (نمک) کی لذت کے تصور سے دندانِ طمع نے دستِ حسرت کو کاٹا۔ شور و نمک میں ایہام تناسب اور شیریں و شور میں ایہام تضاد ظاہر ہے۔ ۳؎ جراحت زار = جہاں کثرت سے زخم ہوں۔ شاعر ایذا پسندی کی آرزو ہے کہ ہر زخم نمکداں بنجائے اور شورِ محبت میں عیادت کا لطف آئے جسکو وہ مصیبتوں میں [illegible] مومن کے یہاں کثیر الوقوع ہے۔ ۴؎ تیغ جوہر = وہ جسکے جوہر تیغ کی طرح ہوں۔ اصلی تلوار یا آئینہ میں جو نشان ہوتے ہیں اُن کو جوہر کہتے ہیں۔ خاصیت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ۵؎ کیوں پر دم آ پہنچا کیونکہ شوقِ شہادت کی وجہ سے جوشِ خون انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ لشکرِ اسلام سے مراد وہ فوج ہے جس نے بسرکردگی سید احمد صاحب ساکنِ بریلی [illegible] میں سکھوں کے مقابلے میں جہاد کے لیے خروج کیا تھا۔ دوسرے شعر میں امام اقتدا سنت سے سید احمد صاحب ہی مقصود ہیں یعنی جس کی پیروی سنت ہے۔ ۶؎ حضرت = رسول مقبول۔ اس میں اشارہ ہے ایک حدیث کی طرف جس میں حضور نے ہدایت فرمائی ہے کہ جو کوئی امام مہدی کا زمانہ پائے تو اُن سے میرا سلام کہدے۔

آگ اشکِ گرم کو لگے جی کیا ہی جل گیا
آنسو جو اس نے پونچھے شب اور ہاتھ پھل گیا

پھوڑا تھا دل نہ تھا یہ موئے پر خلل گیا
جب ٹھیس سانس کی لگی دم ہی نکل گیا

کیا روؤں خیرہ چشمیِ بختِ سیاہ کو
واں شغلِ سرمہ ہے ابھی یاں نیل[۱] ڈھل گیا

کی مجھکو ہاتھ ملنے کی تعلیم ورنہ کیوں
غیروں کو آکے بزم میں وہ عطر مل گیا

اُس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی
کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

جوں خفتگان خاک ہے اپنی فتادگی
آیا جو زلزلہ کبھی کروٹ بدل گیا

اُس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

کچھ جی گرا پڑے تھا پر اب تو نے ناز سے
مجھکو گرا دیا تو مرا جی سنبھل گیا

ملتا ہے گریہ خاک میں اُس نے وہاں کی خاک
گل کی تھی کیوں کہ پاؤں وہ نازک پھسل گیا

بتخانے سے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے
مومن بس اب معاف کہ یاں جی بہل گیا

لگے خدنگ[۲] جب اس نالۂ سحر کا سا
فلک کا حال نہ ہو کیا مرے جگر کا سا

نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا
اگر نہ ہوے گا نقشہ تمھارے گھر کا سا

کرے نہ خانہ خرابی[۳] تری ندامتِ جور
کہ آبِ شرم میں ہے جوش چشمِ تر کا سا

یہ جوشِ یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت
دعائے وصل نہ کی وقت تھا[۴] اثر کا سا

لگے اُن آنکھوں سے ہر وقت اے دلِ صد چاک
ترا نہ رُتبہ ہوا کیوں شگافِ در کا سا

۱ نیل کا ڈھل جانا = آنکھ کا بے نور ہو جانا جو علامات موت میں سے ہے۔
۲ نالۂ سحر تو جگر سے نکل کر آسمان تک جا کر ہی پر پڑتا ہے اور اُس کو مجروح کر دیتا ہے۔ اگر ایسا تیر صحیح نشانہ پر بیٹھے یعنی آسمان پر جا کر پڑے تو اُس کا بھی وہی حال ہو جو میرے جگر کا ہے۔ ۳ معشوق اگر ظلم سے نادم ہے تو بھی عاشق کی خانہ خرابی کا احتمال ہے کیونکہ اُس کے عرقِ شرم میں عاشق کی چشمِ تر کی سی کیفیت ہے۔ چشمِ تر کی خانہ ویران سازی مشہور ہے۔ ۴ وقتِ قتل کو شہادت کی بنا پر وقتِ مقبولیت قرار دیتا ہے۔ مگر جوشِ یاس کی وجہ سے دعائے وصل نہیں کرتا۔

ذرا ہو گرمیِ صحبت تو خاک کر دے چرخ
مرا سرور ہے گُلِ خندۂ شرر کا سا

یہ ناتواں ہوں کہ ہوں اور نظر نہیں آتا
مرا بھی حال ہوا تیری ہی کمر کا سا

جنوں کے جوش سے بیگانہ وار ہیں احباب
ہمارا حال وطن میں ہوا سفر کا سا

خبر نہیں کہ اسے کیا ہوا پر اُس در پر
نشانِ پا نظر آتا ہے نامہ بر کا سا

دل ایسے شوخ کو مومن نے دیدیا کہ وہ ہے
محبِ حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا

گر وہاں بھی یہ خموشی اثر افغاں ہوگا
حشر میں کون مرے حال کا پُرساں ہوگا

اُن سے بدخو کا کرم بھی ستمِ جاں ہوگا
مَیں تو مَیں غیر بھی دل دیکھے پشیماں ہوگا

اور ایسا کوئی کیا بے سر و ساماں ہوگا
کہ مجھے زہر بھی دیجے گا تو احساں ہوگا

محو مجھ سا دمِ نظارۂ جاناں ہوگا
آئنہ آئنہ دیکھے گا تو حیراں ہوگا

خواہشِ مرگ ہوا اتنا نہ ستانا ورنہ
دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

ایسی لذت خلشِ دل میں کہاں ہوتی ہے
رہ گیا سینہ میں اس کا کوئی پیکاں ہوگا

بوسہ ہائے لبِ شیریں کے مضامیں ہیں نکیوں
لفظ سے لفظ مرے شعر کا چسپاں ہوگا

کیا سُناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل
تم سے بیرحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا

۵۳ گلِ خندہ شرر ناپائدار ہوتا ہے۔ شرر ذرا ہنسا اور خاک ہوگیا۔ یہی میرا حال ہے۔ ۵۴ یعنی نامہ بر کے در یار تک پہنچنے کا ثبوت ہے۔ آگے نہیں معلوم کیا گزری شاید مارا گیا۔ ۵۵ شمر اصل میں بسکون میم ہے۔ یہ حرکت مومن کا تصرف ہے۔ ۵۶ خموشی اثر: جس کا اثر خاموشی کا سا ہے یعنی جب میری فغاں خاموشی کا حکم رکھتی ہے تو حشر میں بھی اس کی پرسش کی امید نہیں۔ مومن نے افغاں اور فغاں کو مذکر باندھا ہے۔ آزاد کے نزدیک خموشی اثر فغاں سے مراد ہے فغانے کہ اثرش خموشی است۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ میری فریاد سن کر لوگوں کو چپ لگ جاتی ہے۔ پھر حشر میں پرسشِ حال کی کیا امید۔

۵۷ شاعر اپنی بے سر و سامانی سے اُکتا کر موت کا متمنی ہے۔ مگر اُس کے لئے بھی ساز و سامان چاہئے۔ بے سر و سامانی کی انتہا یہ ہے کہ زہر بھی میسر نہیں۔ ۵۸ دوسرے آئینہ سے رخِ جاناں مراد ہے۔ ۵۹ یعنی ارمانِ مرگ۔ ۶۰ یعنی تم پر مرنا زیادہ مشکل ہے۔ جب میں نے اس کو جھیل لیا تو اُس کو جھیلنا کیا دشوار ہے۔

حیرتِ حسن نے دیوانہ کیا گر اُس کو	دیکھنا خانۂ آئینہ بھی ویراں ہوگا
دیدۂ منتظر آتا نہیں شاید تجھ تک	کہ مرے خواب کا بھی کوئی نگہباں ہوگا
ایک ہی جلوۂ مہرو میں ہوا سو ٹکڑے	جامۂ صبر جسے کہتے ہیں کتاں ہوگا
گریہی گرمیِ مضمون شرر ریز رہی	رشتۂ شمع سے شیرازۂ دیواں ہوگا
کیونکہ اُمید وفا سے ہو تسلی دل کو	فکر ہے یہ کہ وہ وعدے سے پشیماں ہوگا
گر ترے خنجرِ مژگاں نے کیا قتل مجھے	غیر کیا کیا ملک الموت کے قرباں ہوگا

اپنے انداز کی بھی ایک غزل پڑھ مومن
آخر اس بزم میں کوئی تو سخنداں ہوگا

بے سبب کیونکہ لبِ زخم پہ افغاں ہوگا	شورِ محشر سے بھرا اُس کا نمکداں ہوگا
آخر اُمید ہی سے چارۂ حرماں ہوگا	مرگ کی آس پہ جینا شبِ ہجراں ہوگا
مجمعِ بسترِ مخمل شبِ غم یاد آیا	طالعِ خفتہ کا کیا خواب پریشاں ہوگا
دل میں شوقِ رخِ روشن نہ چھپے گا ہرگز	ماہ پردے میں کتاں کے کوئی پنہاں ہوگا

لہ خانہ آئینہ کی ویرانی سے اُسکی بے رونقی مراد ہے۔ اسکو یعنی معشوق کو آئینہ دیکھتے وقت اگر خود اُسی کی حیرتِ حسن نے دیوانہ کر دیا تو پھر آرایش سے بیزار ہو جائیگا۔ ٢ه اے دیدۂ منتظر تجھ تک خواب نہیں آتا۔ شاید اسکا بھی کوئی نگہبان ہوگا۔ جو معشوق کی طرح اسکو نہیں آنے دیتا۔ ٣ه کتان کا کپڑا جلوۂ ماہ سے چاک چاک ہو جاتا ہے۔ میرا جامۂ صبر بھی گویا کتان تھا کہ جلوۂ ماہرو کی تاب نہ لاسکا۔ ٥ه مجھے یہ فکر ہے کہ وہ وعدہ کر کے پچھتائیگا۔ پھر ایسے شخص سے اُمیدِ وفا سے وعدہ لاحاصل۔ ٦ه یعنی رقیب میرے قتل کی خوشی میں ملک الموت کے قربان ہوگا۔ لہذا اگر معشوق کو رقیب کی خاطر عزیز ہے تو چاہئے کہ مجھ (عاشق) کو خنجرِ مژگاں سے قتل کر دے۔ یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ رقیب ہی رشک سے اپنی جان دیگا۔ ٧ه قاتل کا نمکدان شورِ محشر سے بھرا ہوگا اور محشر اور فریاد لازم و ملزوم ہیں۔ اسلئے نمک پاشی سے لبِ زخم کا مائلِ فریاد ہونا حق بجانب ہوگا۔ گویا فریادِ زخمِ عاشق کم حوصلگی کا نتیجہ نہیں بلکہ بیدادِ معشوق قدرۃً محرکِ فغاں ہے۔ شور اور نمکدان کی رعایت ظاہر۔ ٨ه ناکامیِ عشق کا علاج اگر ہو سکتا ہے تو اُمید ہی سے۔ خواہ وہ اُمیدِ مرگ ہی کیوں نہ ہو یعنی اُمید سے بہرحال مددگار رہتا ہے۔ کچھ نہیں تو موت ہی کی اُمید سہی۔ ٩ه شبِ ہجراں میں کامرانیِ وصل یاد آئی جب بسترِ مخمل پر دوست کے ساتھ دادِ عیش دیے رہے تھے۔ ایسی حالت میں یادِ عیشِ گذشتہ سے سوئے ہوئے نصیبے کا خواب کسقدر پریشان ہوگا یعنی یادِ وصل خفتہ طالعی کی تلخی میں اور اضافہ کریگی۔ لفظ خواب میں ایہام ہے۔

دردِ ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

شومیِ بخت تو ہے چین سے لائے وحشتِ دل
دیکھ زنداں ہی کوئی دن میں بیاباں ہوگا

اُسیِ جنبشِ تپش سے ہوں نزع میں گریاں یعنی
ہے یہ رونا کہ دہنِ گور کا خنداں ہوگا

بات کرنے میں رقیبوں سے ابھی ٹوٹ گیا
دل بھی شاید اُسی بدعہد کا پیماں ہوگا

چارہ جو اور بھی اچھا میں کروں گا ٹکڑے
پردۂ شوخ جو پیوند گریباں ہوگا

دوستی اُس صنمِ آفتِ ایماں سے کرے
مومن ایسا بھی کوئی دشمنِ ایماں ہوگا

دیدۂ حیران نے تماشا کیا
دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

ضبطِ فغاں گو کہ اثر تھا کیا
حوصلہ کیا کیا نہ کیا کیا کیا

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے
آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا

مر گئے اس کے لبِ جاں بخش پر
ہم نے علاج آپ ہی اپنا کیا

اگر علاج ہوا تو درد جاتا رہے گا۔ لیکن چونکہ درد جان کے عوض تمام جسم میں سرایت کئے ہوئے ہے اسلیے درد کا زائل ہونا اور جان کا جانا مترادف ہونگے۔ ساری = اثر کرنے والا۔

وحشتِ دل زنداں سے گھبراکر بیاباں نوردی پر ابھارتی ہے۔ جس پر مومن کہتا ہے کہ اگر میری سبز قدمی سلامت ہے تو ایک دن زنداں ہی ویران ہو کر بیابان ہو جائے گا۔ یہاں دہانِ گور کے کشادہ ہونے کو اس کے خنداں ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ شاعر کی ایذا پسندی کو عیش و خوشی سے اتنی سی مناسبت بھی گوارا نہیں اور محض اسی وجہ سے نزع میں روتا ہے۔ معشوق نے عہد کیا تھا کہ رقیبوں سے بات نہ کرے گا۔ لیکن بات کی۔ جس سے اِدھر اُس کا عہد ٹوٹا، اُدھر عاشق کا دل یعنی اُس کا عہد اور اس کا دل دونوں ٹوٹ گئے۔ چارہ جو نے دیوانہ کے چاک گریباں میں معشوق کے پردۂ در کا پیوند لگایا ہے کہ شاید اس سے تسکین خاطر ہو یا اسکا ادب کر کے جامہ دری سے باز رہے۔ مگر دیوانہ بدرجہ اولیٰ اُس کو چاک کرے گا کیونکہ وہ ہمیشہ سے معشوق کے پردے کا دشمن ہے۔ دیدۂ حیراں کی بدولت میں خود تماشا بن گیا۔ باوجود اثر ضبط فغاں کیا۔ افسوس کیا کیا کہ اس قدر حوصلہ سے کام لیا۔ آنکھ نہ لگنا = نیند نہ آنا۔ آنکھ کا لگ جانا۔ کسی پر عاشق ہو جانا۔

مرنے میں اور جاں بخش میں رعایت ہے۔ اور شاعر نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اپنا علاج آپ کرنا اس میں حقیقی اور طنز یہ دونوں پہلو موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ لبِ جاں بخش پر مرنا بھی زندگی ہے۔

بجھ گئی اِک آہ میں شمعِ حیات
مجھکو دمِ سرد نے ٹھنڈا کیا

غیر عیادت سے بُرا مانتے
قتل کیا آن کے اچھا کیا

اُنسے پری وش[۵] کو نہ دیکھے کوئی
مجھکو مری شرم نے رسوا کیا

زندگیِ ہجر بھی اِک موت تھی
مرگ نے کیا کیا مسیحا کیا

پان[۶] میں یہ رنگ کہاں آپ نے
آپ مرے خون کا دعویٰ کیا

جور[۷] کا شکوہ نہ کروں ظلم ہے
راز مرا صبر نے افشا کیا

کچھ بھی بن آتی نہیں کیا کیجئے
اُس کے بگڑنے نے کچھ ایسا کیا

جانے[۸] تھی تیری مرے دل میں سو ہے
غیر سے کیوں شکوہ بیجا کیا

رحم[۹] فلک اور مرے حال پر
تونے کرم اے ستم آرا کیا

سچ ہی سہی آپ کا پیماں ولے
مرگ نے کب وعدۂ[۱۰] فردا کیا

دعویٰ تکلیف[۱۱] سے جلاد نے
روزِ جزا قتل دوبارا کیا

مرگ نے ہجراں میں چھپایا ہے منھ
لو منہ[۱۲] اُسی پردہ نشیں کا کیا

دشمنِ **مومن** ہی رہے بُت سدا
مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا

۵ عاشق نے یار سے شرم سے معشوق کو نہ دیکھا تاکہ افشاءِ رازِ محبت نہ ہو۔ مگر اس سے اور زیادہ رسوائی ہوئی اور لوگوں کو شبہ ہوا کہ کچھ راز ضرور ہے ورنہ ایسے پری وش کو نہ دیکھنا کیا معنی۔ ۶ میرے قتل کے بعد آپ کی یہ زینت خود اس امر کی غمازی کر رہی ہے کہ آپ ہی نے مجھے قتل کیا ہے۔ گویا آپ کے لبوں پر پان کا رنگ نہیں۔ بلکہ خونِ عاشق کی سُرخی ہے۔ ۷ میں ظلم یار کا شکوہ نہیں کرتا اور صبر سے کام لیتا ہوں کہ پردۂ عشق فاش نہ ہو۔ مگر ستم یہ ہے کہ اس (صبر) سے اور راز کھل گیا اور لوگ تاڑ گئے کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔
۸ یعنی غیر کے دل میں تیری جگہ پہلے ہی کب تھی۔ جانے اب متروک ہے۔ جا اور بیجا میں ایہام تضاد ہے۔
۹ تونے مجھ پر اس قدر ظلم کئے کہ اب آسمان کو بھی میرے حال پر رحم آنے لگا۔ اس لحاظ سے تیرا ستم بھی میرے حق میں کرم ہوگیا۔ ۱۰ اسلئے وعدہ کو کل پر نہ اٹھا رکھئے۔ ممکن ہے کہ مجھے آج ہی موت آجائے۔
۱۱ اپنانا ہمارا۔ قاتل نے روزِ جزا الزام پر دعویٰ کیا کہ اس سخت جان کے ہلاک کرنے سے مجھے تکلیف ہوئی اور اس جرم پر ہمیں پھر قتل کردیا۔ ۱۲ منہ کرنا = طرفداری کرنا۔

مُوئے[1] نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہ ہوا
بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

خُدا کی یاد دلاتے تھے نزع میں احباب
ہزار شکر کہ اُس دم وہ بدگماں نہ ہوا

ہنسے نہ غیر مجھے بزم سے اُٹھانے پر
سُبک[2] ہے وہ کہ تری طبع پر گراں نہ ہوا

دِیت[3] میں روزِ جزا لے رہیں گے قاتل کو
ہمارا جان کے جانے میں بھی زیاں نہ ہوا

وہ آئے بہرِ عیادت تو تھا میں شادیِ مرگ
کسی سے چارۂ[4] بیدادِ آسماں نہ ہوا

لگی نہیں ہے یہ چُپ لذتِ ستم سے کہ میں
حریفِ[5] کشمکشِ نالہ و فغاں نہ ہوا

دمِ حساب رہا روزِ حشر بھی یہی ذکر
ہمارے عشق کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا

ہے شرط ہم پہ عنایت میں گونہ گونہ ستم
کبھی محبتِ دشمن کا امتحاں نہ ہوا

وہ[6] حال زار ہے میرا کہ گاہ غیر سے بھی
تمہارے سامنے یہ ماجرا بیاں نہ ہوا

اُمیدِ[7] وعدۂ دیدار حشر پر مومن
تو بے مزہ تھا کہ حسرت کشِ بتاں نہ ہوا

۱ عشق میں جب تک، ہم نہ مرے دوست مہرباں نہ ہوا۔ جو دل بلائے جان (موجبِ ہلاکت) نہ ہو وہ دراصل بلائے جان (باعثِ مصیبت) ہے۔ ۲ جو شخص تیری طبعِ نازک پر گراں نہ ہو (یعنی غیر) وہ حقیقت میں سُبک ہے۔ شاعر نے یہاں سُبک دوسرے معنی میں استعمال کیا ہے یعنی ذلیل۔ اور اس طرح اپنے دل کو تسلی دی ہے۔ سُبک اور گراں کا تقابل ظاہر ہے۔

۳ دِیت = خوں بہا۔ ۴ بیدادِ آسمان کا کوئی علاج نہیں۔ دوست یا تو عیادت کو آتا نہ تھا۔ اور جب آیا تو میں خوشی سے مرگیا اور اس کی آمد سے متمتع نہ ہو سکا۔

۵ میری خاموشی لذتِ ستم کی وجہ سے نہیں بلکہ کشمکشِ نالہ و فغاں میں پڑنا میری وضع کے خلاف ہے۔ ۶ میرا حال اس قدر تباہ ہے کہ رقیب جیسا قسی القلب بھی تم جیسے سنگدل کے سامنے بیان نہیں کرسکتا۔ دشمن کے نہ بیان کرنے کی نئی توجیہ کی ہے۔

۷ مومن اس قدر بد مذاق تھا کہ اُمید وعدہ دیدار حشر پر بیٹھا رہا اور بتوں کی تمنا نہ کی یعنی نقد کو چھوڑ کر نسیہ کو اختیار کیا۔

سم کھا موئے تو دردِ دلِ زار کم ہوا
بارے کچھ اِس دوا سے تو آزار کم ہوا

کچھ[۱] اپنے ہی نصیب کی خوبی تھی بعدِ مرگ
ہنگامۂ محبتِ اغیار کم ہوا

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری
واں لُطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا

آئے[۲] غزال چشم سدا میرے دام میں
صیاد ہی رہا میں گرفتار کم ہوا

ناکامیوں[۳] کی کاہشِ بیجا کا کیا علاج
بوسہ دیا تو ذوقِ لبِ یار کم ہوا

ہر چند[۴] اضطراب میں میں نے کمی نہ کی
تو بھی نہ وان تغافلِ بسیار کم ہوا

کیا[۵] مجھ میں دم بھی لینے کی طاقت نہیں رہی
کیوں شورِ نالہ ہائے عزا بار کم ہوا

سب[۶] تا بہ فتنہ چونک پڑے تیرے عہد میں
اِک میرا بخت تھا کہ وہ بیدار کم ہوا

کچھ قیس اور میں ہی نہیں سب کے سب موئے
اچھا تو دردِ عشق کا بیمار کم ہوا

ذکرِ بُتاں سے پہلی سی نفرت نہیں رہی
کچھ اب تو کفرِ مومنِ دیندار کم ہوا

گر غیر کے گھر سے نہ دل آرام نکلتا
دم کا ہے کو یوں اے دلِ ناکام نکلتا

میں وہم[۷] سے مرتا ہوں ہاں رعب سے اسکے
قاصد کی زباں سے نہیں پیغام نکلتا

---

۱ اگر میری زندگی میں رقیبوں کی محبت کا ہنگامہ کم ہوتا تو میں صدمۂ رشک سے کا ہے کو مرتا۔
۲ غزال چشم = آہو چشم (حسین) شاعر خود گرفتار ہونے کی عوض خوش چشموں کو اپنے دام میں پھانستا رہا اور اسی لیے اپنے کو صیاد کہتا ہے۔ ۳ مومن ناکامیوں کے مصائب کا شکوہ سنج ہے یعنی پہلے تو حسرت بوسہ کی کاہش تھی۔ جب بوسہ ملا تو لبِ یار میں وہ لذت باقی نہ رہی۔ غرض دونوں طرح ناکامی ہے۔ قاعدہ ہے کہ حصول شے کے بعد اس شے میں پہلی سی کشش نہیں رہتی۔
۴ اضطراب سے مقصود یہ تھا کہ دوست متوجہ ہو اور اسکے جمود میں کمی ہو۔ میں نے اپنے مقدور بھر اضطراب میں کمی نہ کی لیکن اسکا تغافل بدستور رہا۔ کاش وہ میرے اضطراب سے برہم ہو کر مجھ پر ظلم ہی کرتا اور عہد تغافل توڑتا۔
۵ جب تک میرے دم میں دم رہا نالہ ہائے عزا بار کھینچتا رہا۔ عزا بار = غم انگیز۔ ۶ فتنہ کا چونک پڑنا = فتنہ برپا ہونا۔ کم ہوا۔ یہاں نہیں ہوا کے مترادف ہے۔ ۷ قاصد دوست کے رعب سے میرا پیغام ادا کرنے سے قاصر ہے مگر مجھے یہ وہم ہے کہ کہیں یہ بھی اُس پر عاشق نہ ہو گیا ہو جس کی وجہ سے یہ محویت ہے۔

کرتے[۲] جو مجھے یاد شب وصل عدو تم ۔ کیا صبح کہ خورشید نہ تا شام نکلتا
جب جانتے تاثیر کہ دشمن بھی وہاں سے ۔ اپنی[۳] طرح اسے گردشِ ایام نکلتا
ہر ایک سے اس بزم میں شب پوچھتے تھے نام ۔ تھا لطف جو کوئی مرا ہمنام نکلتا
کیوں[۴] کام طلب ہے مرے آزار سے گردوں ۔ ناکام سے دیکھا ہے کہیں کام نکلتا
تھی نوحہ زنی دل کی جنازے پہ ضروری ۔ شاید کہ وہ گھبرا کے سر بام نکلتا
کانٹا سا کھٹکتا ہے کلیجے میں غمِ ہجر ۔ یہ خار نہیں دل سے گل اندام نکلتا

حوریں[۵] نہیں مومن کے نصیبوں میں جو تو ہیں
بتخانے ہی سے کیوں یہ بدانجام نکلتا

وصل کی شب شام سے میں سو گیا ۔ جاگنا ہجراں کا بلا ہو گیا
دل نہ پھرا جان ہی ٹھہرے خدا ۔ یہ تو نجا سے کہیں وہ تو گیا
آئینہ[۶] جلدی سے پٹک دو کہیں ۔ دل ہی نہیں ہاتھ سے دیکھو گیا
ہوں میں سیہ[۷] روز کہ وہ شمع رو ۔ شام کو آیا تھا سحر کو گیا
طالعِ برگشتہ مرے کیا پھریں ۔ مُلک عدم سے نہ پھرا جو گیا
ساتھ[۸] نہ چلنے کا بہانہ تو دیکھ ۔ آکے مری نعش پہ وہ رو گیا

۲ میں اس قدر سیاہ روز ہوں کہ اگر تم مجھے شبِ وصل عدو میں یاد کرتے تو میرے نحوست کے اثر سے شام تک سورج نہ نکلتا اور اس سے تمھارا فائدہ تھا کہ شبِ وصل دراز ہو جاتی - ۳ اپنی طرح = ہماری طرح - انقلاب زمانہ کا اقتضا یہ تھا کہ ہماری طرح رقیب کی حالت میں بھی تغیر ہوتا - ۴ آسمان مجھے آزار پہنچا کر اپنی مقصد برآری چاہتا ہے کیونکہ میرا آزار ہی اس کا مقصد ہے - لیکن میں ٹھہرا ناکام - اور ناکام سے کسی کا کام نکلنا معلوم - ۵ جب بت ہی نہ ملے تو اس بدانجام کو حوریں ملنے سے رہیں - ۶ نہیں = ورنہ - ورنہ دل ہی ہاتھ سے جاتا رہیگا اور تم خود اپنی صورت پہ فریفتہ ہو جاؤ گے ۷ معشوق کا صبح کو جدا ہونا عاشق کی سیاہ روزی (نحوست) ہے - شاعر نے یہاں سیاہ رو اور شمع رو کے لفظوں سے خاص فائدہ لیا ہے - ۸ دوست نے میری میت کے ساتھ نہ چلنے کا یہ عذر نکالا کہ آکر نعش پر بناوٹ سے رو گیا - لوگ یہ سمجھے کہ عدم مشایعت جنازہ کی تلافی ہو گئی یا یہ کہ اس کو اس قدر عاشق کے مرنے کا غم ہے - اسلئے گورستان تک زحمت کرنا مشکل ہوگا - اس میں مومن کی افتادِ خیال سے مناسبت رکھنے والا یہ نکتہ خاص طور پر مضمر ہے کہ مذہباً رونے والوں کو مشایعت جنازہ سے روکنے کا حکم ہے -

شوخیٔ قاتل کے میں قربان ہوں
کہتے رہے سب[۴] یہ گیا وہ گیا

صبر[۵] نہیں شام فراق آچکو
جس سے کہ بیزار تھے تم سو گیا

شکر[۶] اثر تھا گلۂ دشمناں
نالہ مرے کام سے یارو گیا

زلف کی بو آئے گی ہم کو اگر
غیر کے گھر دستۂ شبّو گیا

ہائے صنم ہائے صنم لب پہ کیوں؟
خیر ہے مومن تمھیں کیا ہو گیا

ڈر تو مجھے کسکا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
پر حال یہ افشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ناصح یہ گلہ کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
تو کب مری سنتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

میں بولوں تو چپ[۱] ہوتے ہیں اب آپ جبھی تک
یہ رنجش بیجا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کچھ غیر سے ہونٹوں میں کہے ہے یہ جو پوچھو
تو وہ ہیں مکرتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کب پاس پھٹکنے دوں رقیبوں کو تمھارے
پر پاس تمھارا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ناصح کو جو چاہوں تو ابھی ٹھیک بنا دوں
پر خوف خدا کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کیا کیا نہ کہے غیر کی گر بات نہ پوچھو
یہ حوصلہ میرا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کیا کہیے نصیبوں کو کہ اغیار کا شکوہ
سن سن کے وہ چپکا[۲] ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم
بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

[۴] یعنی قاتل دیکھتے دیکھتے نظر سے غائب ہو گیا۔ "وہ" مومن کے زمانہ میں "وُو" (دو واؤ کے ساتھ) بھی لکھا جاتا تھا اسی لیے قافیہ میں استعمال کیا۔ [۵] جس (صبر) سے تم بیزار تھے وہ گیا۔ اب آنے میں کیا عذر ہے معشوق کی اداتیں چونکہ صبر کی دشمن ہیں اسلیے بیزاری سے تعبیر کیا۔ مراد یہ ہے کہ اب صبر باقی نہیں رہا۔ ممکن ہے کہ صبر کی جگہ ہوش ہو جس سے مطلب زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔ [۶] میں نے رقیبوں کی شکایت کے طور پر نالہ کیا مگر الٹا اثر ہوا۔ گویا مرا گلہ نہ ہوا شکر ہو گیا۔

[۱] میں بولوں گا تو آپ ابھی چپ (قائل) ہو جائیں گے اور رنجش بیجا رفع ہو جائے گی۔

[۲] یعنی دوست کی خاموشی سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ میں اس معاملہ میں دخل نہیں دیتا۔ اور اسی کی عاشق کو شکایت ہے

چھپکے سے ترے ملنے کا گھر والوں میں تیرے / اس[53] واسطے چرچا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ہاں تنگ[54] دہانی کا نہ کرنے کے لیے بات / ہے عذر پر ایسا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

اسے[55] چارہ گرو قابلِ درماں نہیں یہ درد / ورنہ مجھے سودا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ہر وقت ہے دشنام ہر اک بات میں طعنہ / پھر اس پہ بھی کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کچھ سن کے جو میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو / سمجھو[56] تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

سنتا نہیں[57] وہ ورنہ یہ سرگوشیٔ اغیار / کیا مجھ کو گوارا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

مومن بخدا سحر بیانی کا جبھی تک
ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

رات کس کس طرح کہا نہ رہا / نہ رہا پردہ مہ لقا نہ رہا

غیر[58] آکر قریبِ خانہ رہا / شوق اب تیرے آنے کا نہ رہا

تیرے[59] پردہ نے کی یہ پردہ دری / تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

غم مرا کس لیے کہ دنیا میں / نہ رہا میں مرا فسانہ رہا

۵۳ تیری اور میری مخفی ملاقات کا چرچا اسلیے ہو رہا ہے کہ مجھے لب کشائی کی اجازت نہیں - اگر میں تردید کے لیے زبان کھولوں تو پھر لوگوں کو بدنام کرنے کا حوصلہ نہ ہو۔ ۵۴ اُن کو بات نہ کرنے کے لیے تنگ دہانی کا ایسا عذر ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ یعنی قابلِ قبول نہیں - ۵۵ میں اظہارِ درد سے اسلیے خاموش ہوں کہ اُس کو قابلِ علاج نہیں سمجھتا - ۵۶ تمہاری ناروا باتیں سُنکر میرا خاموش رہنا ہی غنیمت ہے - اگر جواب دوں تو اور تمہاری برہمی کا باعث ہو - ۵۷ سرگوشی اغیار سے دوست کو منع کرنا اسلیے بیکار سمجھتا ہوں کہ وہ میری سنتا ہی نہیں -

۵۸ رقیب میرے مکان کے قریب آکر رہا - اب تیرے آنے کا مجھکو ارمان نہیں کیونکہ میری ملاقات کے ساتھ تجھکو رقیب کی ملاقات کے موقعے بھی پیدا ہو جائیں گے - ۵۹ تو مجھ سے چھپا مگر اس سے رازِ محبت اور کھل گیا اور لوگ تاڑ گئے کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے -

مدعا[۵۳] غیر سے کہا تا وہ — سمجھے اب کچھ بھی مدعا نہ رہا
کس[۵۴] کی زلفوں کا دھیان تھا کہ تمام شب — محو دودِ چراغ خانہ رہا
غیر[۵۵] چھڑکے ہے زخمِ دل پہ نمک — شورِ الفت میں بھی مزا نہ رہا
پہنچے[۵۶] وہ لوگ رتبہ کو کہ مجھے — شکوۂ بختِ نارسا نہ رہا
تلخ کامی[۵۷] نصیب اعدا حیف — جب کہ وہ اپنے کام کا نہ رہا
دل لگانے کے تو اٹھائے مزے — جی بلا سے رہا رہا نہ رہا
تو فلک مرگ ہم سے سب غافل — اب کسی کا بھی آسرا نہ رہا

مومن اُس بُت سے کیہ ہم نازہی ہیں
تم کو دعوا سے اتقا نہ رہا

ٹانکنے چاک گریباں کو تو ہر بار لگا — ہاتھ کٹواؤں جو ناصح رہے اب تار لگا
بسکہ اک پردہ نشیں سے دل بیمار لگا — جو مریضوں[۵۸] سے چھپاتے ہیں وہ آزار لگا
جذبۂ[۵۹] دل کو نہ چھاتی سے لگاؤں کیونکر — آپ وہ میرے گلے دوڑ کے اکبار لگا
شوخیٔ[۶۰] رنگِ حنا میرے لہو سے سو ہے — قتل اغیار سے کیا ہاتھ ترے یار لگا

۵۳ آدمی کو جب خیال ہوتا ہے کہ حصول مدعا اب بالکل مایوسی ہے تو ایسی حالت میں دشمن سے بھی مدعا دل کہہ گذرتا ہے۔ عاشق نے مکر سے مدعا دل رقیب سے کہدیا تاکہ وہ سمجھے کہ اب یہ مدعا سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور یہ سمجھکر اُس (عاشق) کی مخالفت چھوڑ دے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ "وہ" سے معشوق مراد ہو۔ ۵۴ زلف کی مشابہت دود چراغ سے ظاہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رات بھر دھیان میں جاگتا رہا اور دود چراغ کو دیکھتا رہا۔ یہ شغل بیکاری سمجھو یا محویت۔ بہت نیچرل ہے۔ ۵۵ شور الفت کا مزا جب تھا کہ دوست زخم دل پر نمک چھڑکتا نہ کہ رقیب۔ نمک شور اور مزہ کی رعایت ظاہر ہے۔ ۵۶ پہلے مجھے اپنے بخت نارسا سے شکوہ تھا۔ مگر اب ایسے ایسے فرومایہ لوگ عروج کو پہنچ گئے کہ مجھے نصیب کی شکایت نہیں رہی۔ کیونکہ انکی برابری کرنا میرے لیے باعث ننگ ہے۔ ۵۷ افسوس جب معشوق مجھ سے ملتفت نہیں رہا تو اغیار کو محرومی نصیب ہوتی۔ اب ہوئی بھی تو میرے کس کام کی۔ ۵۸ لوگ مہلک مرض کو مریض پر ظاہر نہیں کیا کرتے۔ پردہ نشیں سے دل لگا یا تو مرض بھی ایسا لگا جسکو سب مجھ سے چھپاتے ہیں۔ ۵۹ کیونکہ اسی جذبۂ دل کی بدولت دوست گلے لگا۔ ۶۰ یعنی اغیار کے لہو میں یہ شوخی کہاں۔ عاشق کا جذبۂ رشک رقیبوں کے قتل پر بھی بھڑک اٹھتا ہے۔ رنگ حنا کی چمک ہاتھ لگا کر مناسبت پیدا

تو کسی کا بھی خریدار نہیں پر ظالم
سر فروشوں کا ترے کوچہ میں بازار لگا

دُرّ و یاقوت کی پھر غیر پہ فرمایش ہے
جوہری[8] کی تو دُکان چشم گہربار لگا

یاد آئی[9] مجھے ناصح کی زباں کی تیزی
دیکھ اِغوائے رقیباں سے نہ تلوار لگا

منہ[10] میں کیسا خمِ صہبا کے بھر آیا پانی
تیرے لب سے جو لبِ ساغرِ سرشار لگا

ناگہاں نعش پہ عاشق کی دمِ نوحہ گری
ق کوئی مذکور ترا کرنے ستمگار لگا

دیکھ تو حسرتِ دیدار پسِ مردن بھی
آنکھیں وہ کھول کے تکنے در و دیوار لگا

کعبہ سے جانبِ بتخانہ پھر آیا مومن
کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

شبِ غمِ فرقت ہمیں کیا کیا مزے دکھلائے تھا
دم رُکے تھا سینے میں کمبخت جی گھبرائے تھا

یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکائے تھا
تھے غلط پیغام سارے کون یاں تک آئے تھا

بل بے[11] عیاری عدو کے آگے وہ پیماں شکن
وعدۂ وصل آج پھر کرتا تھا اور شرمائے تھا

سُن کے میری مرگ بولے مرگیا اچھا ہوا
کیا بُرا لگتا تھا جس دم سامنے آجائے تھا

یار[12] و دشمن راہ میں کل دیکھنا کیونکر ملے
وہ اُدھر کو جائے تھا اور یہ اِدھر کو آئے تھا

[8] اے موتی برسانے والی آنکھ جوہری کی دکان لگا یعنی اس قدر رو کہ موتیوں کی دکان لگ جائے اور تیرے اشکوں کی گوہر افشانی دُرّ و یاقوت کی قدر و قیمت معشوق کی نظر سے گرا دے۔

[9] عاشق کو اپنے قتل سے صرف اس بنا پر گریز ہے کہ معشوق رقیبوں کے بہکانے سے آمادہ قتل ہے۔ اس لیے کہتا ہے کہ دیکھ ایسا نہ کر۔ مجھے تیری تلوار دیکھکر ناصح کی تیزیِ زبان یاد آئی۔ کہ وہ مجھے نصیحت کرتا تھا اور سختی کے ساتھ معشوقوں کی اور عشق کی مذمت کرتا تھا۔

[10] خمِ شراب کو یہ حسرت ہوئی کہ اُسے ساغر کی طرح تیرے لب تک رسائی نہیں۔

[11] وہ وعدہ خلافت جو ایک بار وعدہ خلافی کر چکا تھا آج پھر مجھ سے وعدۂ وصل کرتا تھا اور خجل ہوا جاتا تھا اس میں عیاری یہ تھی کہ میں سمجھوں کہ پچھلی پیماں شکنی پر شرمندہ ہے اور عدو سمجھے کہ عاشق سے وعدہ کرکے شرمسار ہے۔

[12] یار رقیب کے گھر جا رہا تھا اور رقیب یار کے یہاں۔ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔

بات شب کو اُس۵۳ سے منعِ بیقراری پر بڑھی — ہم تو سمجھے اور کچھ وہ اور کچھ سمجھائے تھا

کوئی دن تو اس پہ کیا تصویر کا عالم رہا — ہر کوئی حیرت کا پتلا دیکھ کر بنجائے تھا

سوئے صحرا لے چلے اُس کوچے سے میری نعش ہائے — تھا یہی۵۴ ڈر ان دنوں تلوا مرا کھجلائے تھا

ناز شوخی دیکھنا وقتِ تظلم۵۵ دمبدم — مجھ سے وہ عذرِ جفا کرتا تھا اور جھنجلائے تھا

ہوگئی دو روز کی الفت میں کیا حالت ابھی
مومنِ وحشی کو دیکھا اس طرف سے جائے تھا

ہماری جان شب تجھ بن دلِ ناکام لیتا تھا — خدنگِ آہ سے تیرِ قضا کا کام لیتا تھا

یہی حالت رہی آٹھوں پہر تجھ بن کہ دم اُلٹے۵۶ — سحر تک شام سے دل صبح سے تا شام لیتا تھا

عیش الفت بڑھی تم کو وہ کب دیتا تھا دم تم پر — یہ مجھ کو دیکھ کر دشمن کلیجا۵۷ تھام لیتا تھا

چھٹا یا کیوں مرا واں رات دن رہنا بہم پھرنا — بتا تو کیا ترا تیں گردشِ ایام لیتا تھا

نہ کانٹوں پر کوئی یوں لوٹے جوں میں بستر گل پر — ترے بن کروٹیں شب لے سمتِ اندام لیتا تھا

رقیبوں پر ہوئی کیا آج فرمائش جواہر کی — کہ ہیرا۵۸ عاشق خطِ زمرد فام لیتا تھا

سحر تک شام سے تجھ بن یہی حالت تھی دل سے — نہ مجھ کو چین دیتا تھا نہ آپ آرام لیتا تھا

۵۳ محبوب نے تو اِن کو بیقراری سے اس لیے منع کیا کہ اِن کا اضطراب اُسکے برہمی مزاج کا موجب تھا مگر یہ حضرت سمجھے کہ ہماری بیقراری کی تاثیر سے وہ مائل التفات ہوا ہے اور ہمدردی کی بنا پر منع کرتا ہے۔ اس لیے اور بیقراری دکھانے لگے۔ آخر کو بات بڑھ گئی۔ ۵۴ "تلوا کھجلانا" سفر کی علامت یا شگون سمجھا جاتا ہے۔ زندگی میں تو عاشق کے لیے کوئے یار سے سفر کرنے کا کیا امکان ہوسکتا تھا۔ جب مر کر وہاں سے نعش نکلی تو اس شگون کی تصدیق ہوگئی۔ ۵۵ تظلم = فریاد کرنا۔
۵۶ اُکھڑے دم لینا علامات نزع میں سے ہے۔ ۵۷ کلیجا تھام لینے کا سبب تمہاری محبت کا اظہار نہ تھا بلکہ میرے حالِ زار پر اظہار تاسف۔ یعنی میری حالت پر رقیب کو بھی رحم آتا تھا۔ ۵۸ خطِ زمرد فام کا عاشق اس رشک کے باعث خودکشی کی غرض سے ہیرا لیتا تھا۔

نہ مانوں[۱۲] گا نصیحت پر نہ سنتا مَیں تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات میں ناصح تمھارا نام لیتا تھا

مَیں اُس کی بزم سے مَے بن نہ ہر پی کیونکر نہ مرجاتا
کہ میرے سامنے اُس لب کے بوسے جام لیتا تھا

اگر مومن[۱۳] ہی ہو مومن ولے مَیں تو نہ مانونگا
جو عہدِ دوستی وہ دشمنِ اسلام لیتا تھا

وقت[۱۴] جوشش بحر گریہ مَیں جو گرم نالہ تھا
حلقۂ گرداب رشکِ شعلۂ جوّالہ تھا

آگ[۱۵] کیا ہم کو لگائی ابر نے تیرے بغیر
وقت بارش اخگر خورشید تفت ہر ژالہ تھا

اس[۱۶] لبِ نازک کو برگِ گُل سے دیتے ہیں مثال
ہونٹ برگِ لالہ تھے اور نیل داغ لالہ تھا

اک نگاہ[۱۷] سرسری دیوانہ ہم کو کر گئی
گردشِ چشم پریرو ساحرِ بنگالہ تھا

دیکھکر یہ مجمع اُمڈ آ گیا ہی ابرِ اشک آہ
حلقۂ[۱۸] اغیار اس کے گرد مہ کا ہالہ تھا

آبلے[۱۹] کیونکر نہ نکلیں جائے اشک آنکھوں سے آہ
میرے پہلو میں ابھی وہ آگ کا پرکالہ تھا

بھی

۱۲ میری نصیحت نہ سُننے سے تم بدگمان نہ ہو - مَیں نے ناصح کی باتیں صرف اس لیے سُن لیں کہ وہ دورانِ گفتگو میں بار بار تمھارا نام لیتا تھا - ورنہ مَیں اُس کی نصیحت ماننے اور ترکِ عشق کرنے سے رہا -
۱۳ جب اُس دشمنِ اسلام (معشوق) نے مومن سے عہد دوستی لیا تو مجھے مومن کے مومن (ایمان دار) ماننے میں بھی تامّل ہے -
۱۴ ایک طرف میرے اشکوں کی طغیانی تھی اور دوسری طرف نالوں کی شرر فشانی - نتیجہ یہ ہوا کہ دریاے اشک کا گرداب شعلۂ جوّالہ کو مات کرنے لگا - شعلۂ جوّالہ = چکر کھانے والا شعلہ بنیٹی -
۱۵ اخگر خورشید تفت = وہ انگارا جس میں سورج کی سی حرارت ہو - مطلب یہ ہے کہ تیرے ہجر میں بارش کے اولے بھی انگارے معلوم ہوتے تھے - ۱۶ معشوق کو اپنے لبِ نازک کی تشبیہ برگ گُل سے اس قدر ناگوار ہوئی کہ غصّہ میں لب برگ لالہ کی طرح سُرخ اور لب کا نیل (جو غصّہ میں ہونٹ چبانے سے پڑ گیا تھا) داغ لالہ کی مانند نیلا پڑ گیا - گویا اس طریقہ سے تشبیہ صادق آگئی - ۱۷ مشہور ہے کہ بنگالے کے جادوگر آدمی کو دیوانہ کر دیتے ہیں - دراصل ساحرِ بنگالہ تھا جو گردشِ چشمِ پریرو کے بھیس میں اپنا کام کر گیا - ۱۸ چاند کے گرد ہالے کا نمایاں ہونا بارش ہونے کی علامت سمجھا جاتا ہے - ۱۹ معشوق کو پرکالۂ آتش کہا ہے اور اسی مناسبت سے اُسکی جدائی میں اشک کے بدلے آنکھوں سے آبلے نکلتے ہیں -

شور[1] الفت نے کیا کیا بے مزہ جلاد کو
گرم خونی سے لبِ شمشیر پر تبخالہ تھا

آہ پر دود اپنی کب زیبِ فلک تھی رات کو
دیدۂ مہتاب میں سرمہ کا یہ دنبالہ تھا

مومنِ عاشق طبیعت نوجواں ہی مر گیا
عشق طفلِ چند سالہ و دشمن[2] صد سالہ تھا

میرے[3] کوچے میں عدو مضطر و ناشاد رہا
شب خدا جانے کہاں وہ ستم ایجاد رہا

اُس[4] روانی سے ذرا خنجرِ بیداد رہا
بارے اک دم اثرِ نالہ و فریاد رہا

بیکسی[5] نے نہ دیا ہائے تہِ خاک بھی چین
تا قیامت الم گریۂ جلّاد رہا

نقدِ[6] جاں تھا نہ سزائے دیتِ عاشق حیف
خونِ فرہاد سرِ گردنِ فرہاد رہا

لذتِ[7] جور سے دم لینے کی فرصت نہ رہی
کیا اثر منتظرِ دعوتِ فریاد رہا

[1] تب خالہ = آبلہ جو گرمی کی وجہ سے ہونٹ پر پڑ جاتا ہے۔ عاشق کی خون کی حدّت سے لبِ تیغ پر چھالہ پڑ گیا اور اُسکے شورِ الفت سے قاتل بے مزہ (مکدّر) ہوا۔ شور اور مزہ کی رعایت اوپر بیان ہو چکی۔ قاعدہ ہے کہ کھاری چیز آبلہ پر ناگوار محسوس ہوتی ہے۔ یہاں شورِ الفت سے سوزِ الفت زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔
[2] دشمن صد سالہ = پُرانا دشمن جو زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔
[3] معلوم ہوتا ہے کہ معشوق نے عدو (رقیب) کے سوا کسی تیسرے شخص سے رسم پیدا کی۔ گویا وہ رقیب سے بھی وفادار نہیں۔
[4] بارے میری فریاد میں اتنا اثر تو ہوا (اگرچہ دم بھر کے لیے ہوا) کہ خنجرِ قاتل ذرا روانی سے رُک گیا۔ [5] شاعر کو اپنی بیکسی سے شکایت ہے کہ وقتِ قتل بیکسی کو دیکھکر قاتل کو بھی رونا آگیا اور قاتل کی تکلیف کے خیال نے شاعر کو قبر میں بھی مضطرب رکھا۔
[6] دیت = خون بہا یعنی وہ روپیہ جو قاتل سے ورثۂ مقتول کو دلایا جائے۔ سزائے دیت = دیت کے لائق۔ فرہاد نے عشق میں اپنی جان دی جسکے صدمہ سے شیریں نے اپنے آپ کو ہلاک کیا۔ مومن کا مطلب یہ ہے کہ حسن کو ہر حال میں عشق پر ترجیح ہے۔ شیریں کا نقدِ جان اتنا گراں بہا تھا کہ عاشق کے بے حقیقت خون کی قیمت نہیں ہو سکتا تھا اس لیے فرہاد کا خون فرہاد کی گردن پر رہا اور وہی قصوروار ٹھہرا۔ دوسرے معنی یوں ہو سکتے ہیں کہ فرہاد کی دو حیثیتیں مانی جائیں ایک عاشق کی حیثیت جو ہلاک ہوا دوسری قاتل کی اس لیے کہ اُس نے خودکشی کی۔ مراد یہ ہے کہ بہ حیثیتِ قاتل اُس پر خوں بہا واجب تھا جس کی مستحق اُس کے جان و دل کی مالک یعنی شیریں تھی۔ چنانچہ اُس نے شیریں کو اپنا نقدِ جان پیش کیا جو بلحاظِ عظمتِ مرتبۂ عشق دیتِ عاشق کے قابل نہ تھا۔ اس واسطے خونِ فرہاد کا مواخذہ فرہاد ہی کے ذمہ رہا کیونکہ خون بہا کافی نہ تھا۔ مگر اس معنی میں تکلف زیادہ ہے۔
[7] اثر کس قدر میری فریاد کی دعوت کا منتظر رہا مگر اس کا کیا علاج کہ میں نے فریاد ہی نہیں کی اور ستمِ یار کی لذت میں اتنا محو رہا کہ دم لینے کی بھی مہلت نہ ملی۔

یاد سہواً اُسے اے غیر ہے نسیاں عمداً	یاد رکھ بھول گیا جس کو وہی یاد رہا
سر پٹکنے نے مرے سنگِ دراسکا توڑا	یہی سودا ہے تو گھر کا ہے کو آباد رہا
کرۂ خاک ہے گردش میں طپش سے میری	میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا
چھوٹنا دامِ شکستہ سے بھی آساں نہیں	میں گرفتارِ خمِ گیسوئے صیاد رہا
لیچلا جوش جنوں جانبِ صحرا افسوس	جب مرے کوچے میں آکر وہ پریزاد رہا

گو غمِ جور کھے عشقِ بتاں اے مومن
میں سدا سوختۂ حسنِ خداداد رہا

میں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا	میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھسے کیا کیا
کشتۂ نازِ بتاں روزِ ازل سے ہوں مجھے	جان کھونے کے لیے اللہ نے پیدا کیا
روز کہتا تھا کہیں مرتا نہیں ہم مر گئے	اب تو خوش ہو بیوفا تیرا ہی لے کہنا کیا
سر سے شعلے اُٹھتے ہیں آنکھوں سے دریا جاری ہے	شمع سے یہ کس نے ذکر اس محفل آرا کا کیا
روئیے کیا بختِ خفتہ کو کہ آدھی رات سے	میں یہاں رو یا کیا اور وہ وہاں سویا کیا
آتشِ اُلفت بجھادی داغہائے رشک نے	مدعی کی گرمیِ صحبت نے جی ٹھنڈا کیا
آنکھ عاشق کی کوئی پھرتی ہے اے غفلت	دیکھ لے میں مرتے مرتے سوئے در دیکھا کیا

لہ معشوق کی عادت ہے کہ کسی کو فراموش کرتا ہے تو بالقصد اور اگر کسی کو یاد کرتا ہے تو بھولے سے۔ اس بنا پر مجھے رقیب پر ترجیح حاصل ہے کہ میں اُس کی یاد میں موجود ہوں یعنی اُسنے مجھے بالارادہ بھلا رکھا ہے۔ ٹہ مجھے حالت اسیری میں بھی آزادی میسر ہے اس واسطے کہ جب میں زنداں میں تڑپتا ہوں تو میری تپش کے اثر سے تمام کرۂ زمین گردش کرنے لگتا ہے اور اُس کے ساتھ میں بھی گردش کرتا ہوں۔ اب آزادی کے لیے اور کیا چاہئے۔ ٹہ گیسو کو خم (شکن) کے اعتبار سے دامِ شکستہ قرار دیا ہے۔

دلبروں[1] میں بیوفا میری وفا کی دھوم ہے		بوالہوس سے کیوں کہا تھا راز جو افشا کیا
چارہ[2] گر کعبے میں اسکے آستاں سے لیگئے	زنداں	ایک بھی میری نہ مانی لاکھ سر پٹکا کیا
غیر[3] کا اور آپکا گر دل نہیں ہے ایک تو		کیوں ترے دل میں مری یاد آنیکا چرچا کیا
کیا[4] خلش تھی رات دل میں آرزوئے قتل کی		ناخنِ شمشیر سے مَیں سینہ کھجلایا کیا
کیا خجل ہوں اب علاجِ بیقراری کیا کروں		دھر[5] دیا ہاتھ اُسنے دل پر تو بھی دل دھڑکا کیا

عرضِ[6] ایماں سے ضد اُس غارتگرِ دیں کو بڑھی
تجھسے اے مومن خدا سمجھے یہ تو نے کیا کیا

کسی کا ہوا آج کل تھا کسی کا		نہ[1] ہے تو کسی کا نہ ہوگا کسی کا
کیا[2] اُس نے قتلِ جہاں اک نظر میں	تنہے	کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا
نہ[3] میری سنے وہ نہ مَیں ناصحوں کی		نہیں مانتا کوئی کہنا کسی کا
مجھے[4] مار ڈالا ہے انکار نے پھر		نہ کہنا کہ کیا مجھ پہ دعویٰ کسی کا
جو پھر جائے اُس بیوفا سے تو جانوں		کہ دل پر نہیں زور چلتا کسی کا

[1] معشوق کو یہ گوارا نہیں کہ حسینوں میں عاشق کی وفا کی تعریف ہو۔ اسکے اس ذہنیت سے عاشق یوں فائدہ اُٹھاتا ہے کہ تم نے رقیب سے میرا رازِ محبت کیوں کہدیا جو افشا ہوگیا اور حسینوں میں چرچا ہونے لگا کہ مومن انتہا کا وفا پرست ہے جو ایسے (ظالم) سے عہد وفا نبھاتا ہے۔ اس اشتعال کا نتیجہ لامحالہ یہ ہوگا کہ آئندہ وہ رقیب سے راز ظاہر نہ کریگا جس میں مومن کا سراسر فائدہ ہے۔ [2] مجنوں کو اُس کا باپ دعا کی غرض سے کعبے کو لے گیا تھا کہ اسکی برکت سے جنون دور ہوجائے۔ غالباً اس شعر کا محرک یہی واقعہ ہے۔ [3] معشوق کے دل میں عاشق کی یاد آئی۔ غیر کو کسی طرح خبر ہوگئی۔ اور آپنے سب میں چرچا کردیا عاشق کہتا ہے کہ تیرا اور اُس کا دل ایک ہے ورنہ تیرے دل کی بات آسے کیسے معلوم ہوگئی۔ اِدّعا ہے مگر دلوں کے ایک ہونے کا طنز بہت پُرلطف ہے۔ آپ کا اور تیرا میں شترگربہ کا عیب آگیا۔
[4] جب کسی عضو میں خلش (چبھن) ہوتی ہے تو آدمی ناخن سے کام لیتا ہے۔ [5] پہلے تو دل صدمۂ فرقت کی وجہ سے دھڑکتا تھا۔ اب جوشِ مسرت کے باعث دھڑکنے لگا۔ [6] عرض = ظاہر کرنا۔
[1] جس کا تو کل دوست تھا اُس کا آج نہیں اور جس کا آج ہوا کل نہ ہوگا۔ دوستی میں تیرا تلون اس امر کی دلیل ہے کہ تو اصلاً کسی کا بھی دوست نہیں۔ [2] یعنی سب ایک ساتھ ہلاک ہوگئے۔ عاشق کو قتلِ جہاں کا اس قدر خیال نہیں جس قدر اس امر کا کہ قاتل کو سفاکی کی اچھی طرح داد نہ ملی۔ [3] مصرع ثانی دعویٰ ہے اور مصرع اول دلیل ہے جس میں صرف معشوق کی اور اپنی دو مثالوں کی بنا پر کلیہ قائم کردیا ہے۔ یہ استدلال منطقی نہ سہی شاعرانہ ضرور ہے۔ [4] معشوق نے یہ کہا کہ کیا تجھ پہ دعویٰ کسی کا۔ اسکے اس انکارِ محبت نے عاشق کو مار ڈالا۔ اب عاشق کہتا ہے کہ دوبارہ انکار نہ کرنا اسلیے کہ وجہ دعویٰ (یعنی قتل) پیدا ہوگئی جو پہلے نہ تھی اب ہے۔

صبا نکہتِ یار لائی کہاں سے
نہیں دخل اس کو میں اصلا کسی کا

وہ کرتے ہیں بیباک عاشق کُشی یوں
نہیں کوئی دنیا میں گویا[5] کسی کا

کوئی کیا کرے آپ ہرجائی ہو تم
نہیں میری جاں شکوہ بیجا کسی کا

حذر[6] الحذر اور عشقِ بتاں سے
تجھے ڈر ہے اے مومن ایسا کسی کا

محشر[1] میں پاس کیوں دمِ فریاد آگیا
رحم اُس نے کب کیا تھا کہ اب یاد آگیا

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زُلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیّاد آگیا

ناکامیوں[2] میں تم نے جو تشبیہ مجھ سے دی
شیریں کو دردِ تلخیِ فرہاد آگیا

ہم[3] چارہ گر کو یوں ہی پہنائیں گے بیڑیاں
قابو میں اپنے گر وہ پریزاد آگیا

دل[4] کو قلق ہے ترکِ محبت کے بعد بھی
اب آسماں کو شیوۂ بیداد آگیا

[5] گویا دنیا میں کوئی خون عاشق کا دادخواہ نہیں۔ [6] حذر = ڈر۔ الحذر = الاماں۔ مطلب یہ ہے کہ تجھے ایسا کس کا ڈر ہے جو عشق جیسی مرغوب چیز سے پناہ مانگتا ہے۔

[1] محشر میں عاشق فریاد کرنے والا تھا کہ پاس معشوق سے رک گیا۔ اب اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ معشوق نے دنیا میں کبھی رحم کیا ہوتا تو وہ رحم اس وقت یاد آکر مانع فریاد ہوتا۔ مگر جب ہمیشہ ظلم ہی کیے تو فریاد سے باز رہنے کی کیا وجہ۔ [2] میں ناکامی میں ضرب المثل ہوں چنانچہ جب تم نے ناکامی کے اعتبار سے فرہاد کو مجھ سے تشبیہ دی تو شیریں کو بھی فرہاد کی مصیبت پر ترس آگیا کہ اب غریب (فرہاد) کی تلخی اس درجہ کو پہنچ گئی۔ اس میں یہ نکتہ ہے کہ تشبیہ ہمیشہ اعلیٰ سے دی جاتی ہے یعنی میں فرہاد سے بھی ناکامی میں بڑھا ہوا ہوں۔ شیریں اور تلخی میں ایہام تضاد ہے۔ [3] ہم چارہ گر کو اس لیے بیڑیاں پہنائیں گے کہ وہ خود دیوانہ ہے۔ ورنہ عاشق کو مجنون سمجھ کر قید و بند کا (غلط) علاج کیوں تجویز کرتا۔ یہ مطلب بھی ممکن ہے کہ ہم اس پریزاد کی صورت دکھا کر چارہ گر کو دیوانہ بنائیں گے۔ [4] جب عہد محبت میں قلق ہوتا تھا تو اس (قلق) کی وجہ بیداد یار تھی اب ترک محبت کے بعد بھی دل کو قلق ہے۔ تو ظاہر ہے کہ معشوق کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے۔ لامحالہ یہ آسمان کی مشق ستم کا نتیجہ ہے جس کو معشوق کی دیکھا دیکھی اب شیوۂ بیداد آگیا ہے۔

وہ بدگماں ہوا جو کہیں شعر میں مرے
ذکرِ بتانِ خلخ[۵] و نوشاد آگیا

تھے[۶] بیگناہ جراُتِ پابوس تھی ضرور
کیا کرتے وہ ہم خجلتِ جلّاد آگیا

جب ہو چکا یقیں کہ نہیں طاقتِ وصال
دم میں ہمارے وہ ستم ایجاد آگیا

ذکرِ شراب و حور کلامِ خدا میں دیکھ[۷]
مومن میں کیا کہوں مجھے کیا یاد آگیا

وعدہ[۸] وصلت سے دل ہو شاد کیا
تم سے دشمن کی مبارکباد کیا

کچھ[۹] قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

نالۂ پیہم سے یاں فرصت نہیں
حضرتِ ناصح کریں ارشاد کیا

ہیں اسیر اس کے جو ہے اپنا اسیر
ہم[۱۰] نہ سمجھے صید کیا صیاد کیا

شوخ بازاری تھی شیریں بھی مگر
ورنہ[۱۱] فرق خسرو و فرہاد کیا

---

۵ خلخ و نوشاد۔ ترکستان کے دو حُسن خیز شہر ہیں۔ ۶ جلّاد (معشوق) عاشق کو بے گناہ قتل کر رہا ہے۔ عاشق جراُت کر کے جُرم پابوسی کا مرتکب ہوتا ہے۔ تاکہ جلّاد کو قتل کے لیے ایک معقول عذر ہاتھ آجائے اور وہ بے گناہ کُشی کی شرمندگی سے محفوظ رہے۔

۷ دیکھ = دیکھکر۔ یعنی مے و معشوق یاد آگئے۔

۸ دشمن کی مبارکباد اور وہ بھی تم جیسے دشمن کی مبارکباد وجہ اطمینانِ دل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اُس میں عموماً طنز یا استہزا کا پہلو ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ مجھے تمہارے وعدۂ وصل پر اعتبار نہیں آتا۔

۹ میں ان دنوں قفس سے مانوس سا ہو گیا ہوں جس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ شاید اب میرا آشیاں برباد ہو گیا۔ گویا اُنسِ قفس قدرت کی طرف سے بربادیِ آشیاں کی تلافی ہے۔ ۱۰ جو میری محبّت کا پابند ہے میں اسکا غلام ہوں اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔ ۱۱ خسرو (بادشاہ) اور فرہاد (مزدور) میں امتیاز کرنا اور اس وجہ سے ایک کو متمتع اور دوسرے کو محروم رکھنا حُسنِ بازاری کا شیوہ ہے۔

نشہ[۵] الفت سے بھولے یار کو
سچ ہے ایسی بیخودی میں یاد کیا

نالہ اک دم میں اُڑا ڈالے دھوئیں[۶]
چرخ کیا اور چرخ کی بنیاد کیا

جب[۷] مجھے رنجِ دل آزاری نہ ہو
بیوفا پھر حاصلِ بیداد کیا

پانوں[۸] تک پہنچی وہ زلفِ خم بخم
سرو کو اب باندھئے آزاد کیا

کیا کروں اللہ سب ہیں بے اثر
ولولہ کیا نالہ کیا فریاد کیا

دلربائی[۹] زلفِ جاناں کی نہیں
پیچ و تابِ طرۂ شمشاد کیا

ان[۱۰] نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

روزِ محشر کی توقع[۱۱] ہے عبث
ایسی باتوں سے ہو خاطر شاد کیا

گر[۱۲] بہا ئے خونِ عاشق ہے وصال
انتقامِ رحمتِ جلاد کیا

بتکدہ جنت سے پہلے بے ہراس
لب پہ مومن ہرچہ[۱۳] بادا باد کیا

۵ الفتِ یار کا نشہ اس قدر ہے کہ اس بیخودی میں خود یار کی یاد بھی باقی نہیں۔ ۶ دھوئیں اُڑا ڈالنا = برباد کر دینا۔ ۷ تو اس لیے بیداد کرتا ہے کہ مجھے تکلیف ہو اور میں اس قدر خوگر بیداد ہو گیا ہوں کہ احساس تکلیف جاتا رہا۔ پھر بیداد سے کیا نتیجہ؟ ۸ سرو کو شعرا آزاد باندھتے ہیں۔ یہاں سرو سے قد یار مراد مراد ہے مگر چونکہ زلف پاؤں تک پہنچکر زنجیر بن گئی ہے اس لیے اب سرو کو آزاد کہنا غلط ہو گیا۔ ۹ طرۂ شمشاد کا پیچ و خم کس کام کا جب اُس میں زلفِ جاناں کی سی دلربائی نہیں۔ ۱۰ آسمان کی ستم ایجادی تو دیکھو کہ مجھے بدنصیب بنایا اور اُس پر ستم زادہ یہ کہ اختر شناس (منجم) بھی کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اختر شناسی کی بدولت وقت سے پہلے مجھے اپنے مصائب کا علم ہو جاتا ہے جو اور زیادہ موجب اذیت ہے۔ واضح رہے کہ مومن اختر شناسی میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ ۱۱ یعنی حشر میں دادرسی کی توقع عبث ہے ۱۲ مانا کہ وصالِ عاشق کا خون بہا قرار دیا گیا۔ مگر قتل میں جلاد (معشوق) کے دست و بازو کو جو زحمت ہوئی اُس کا کیا معاوضہ ہو گا۔ ۱۳ ہرچہ بادا باد اُس موقع پر کہتے ہیں جب انسان اپنے کام میں ہاتھ ڈالے جس میں ہراس ہو۔ مراد یہ ہے کہ بتکدہ سے جاتے ہیں (جنت نہ ملنے کا) اندیشہ بیکار ہے کیونکہ بتکدہ خود جنت ہے، ہراس کا ہے کا۔

دلِ بیتاب کو گر باندھ کر رکھوں نہ ٹھہریگا
۱؎ سوا اُس در کی زنجیروں کے یہ مجنوں نہ ٹھہریگا

طپش سے خاک میں بھی عاشقِ مدفوں نہ ٹھہریگا
کہ گنبد قبر کا جوں گنبدِ گردوں نہ ٹھہریگا

نہ ٹھہرا بوسہ تو دینا دلِ مفتوں نہ ٹھہریگا
اگر واں وہ نہ ٹھہریگا تو یاں بھی یوں نہ ٹھہریگا

۲؎ اگر گردش یہی ہے مغبچوں کی چشمِ میگوں کی
کفِ ساقی میں جامِ بادۂ گلگوں نہ ٹھہریگا

۳؎ مرے خط میں شکایت اُسکے شہبازِ نظر کی ہے
پر و بالِ کبوتر ایک اک لکھ دوں نہ ٹھہریگا

اسے خو پڑ گئی ہے بے طرح زانوئے جاناں کی
یہ سر تکیہ پہ ہمدم جس طرح رکھوں نہ ٹھہریگا

۴؎ سراپا اُسکے محوِ شوخیِ قاتل ہوں محشر تک
مرے زخموں سے جاری ہی رہیگا خوں نہ ٹھہریگا

کیا پھر عیادت گر ارادہ اُس نے آنے کا
۵؎ تو جب تک جان ہے دردِ دلِ محزوں نہ ٹھہریگا

ہوئی تاثیر گر تھوڑی سی بھی اُس سروِ موزوں کو
۶؎ زمیں کیا آسماں پر نالۂ موزوں نہ ٹھہریگا

۷؎ مہِ نو بن گئے ہم طولِ شبہائے جدائی سے
کہاں تک دیکھئے وہ حسنِ روز افزوں نہ ٹھہریگا

۸؎ وہ شاعر ہوں کہ باندھوں گا تم زنجیرِ کاکل سے
اگر دل کے قلق کا دھیاں میں مضموں نہ ٹھہریگا

۹؎ طوافِ کعبہ کا خو گر ہے دیکھو صدقے ہونے دو
بتو سمجھو ذرا مومن ہے مومن یوں نہ ٹھہریگا

۱؎ اس مجنوں کو صرف زنجیرِ دریار سے قرار ممکن ہے۔ یعنی اُس کو صرف اسی دروازہ پر چین آسکتا ہے زنجیروں میں باندھنے سے یہ نہیں رُک سکتا۔ ۲؎ اگر مغبچوں کی چشمِ مست کی گردش اسی طرح رہی تو بیخودی کی وجہ سے دستِ ساقی میں جامِ شراب کا سنبھالنا دشوار ہوگا۔ ۳؎ چونکہ میرے خط میں دوست کے شہبازِ نظر کی شکایت رقم ہے اس لیے اُس کی تاثیر سے خط لیجانے والے کبوتر کے پر و بال ہرگز نہیں ٹھہر سکتے۔ ظاہر ہے کہ شہباز کبوتر کا دشمن ہوتا ہے۔ لکھ دوں کا لفظ اپنے دعوے کی توثیق کے لیے استعمال کیا ہے۔ ۴؎ چونکہ قاتل کی شوخی کا خیال کسی وقت دل سے نہیں جاتا اس لیے زخم ہر وقت تازہ اور خون ہر دم جاری رہیگا۔ ۵؎ اس لیے کہ اگر درد ٹھہر گیا تو دوست عیادت کا ارادہ ترک کر دیگا۔ ۶؎ سروِ موزوں = معشوق۔ نالہ کا اس فخر کے باعث زمین پر قدم رکھنا تو در کنار آسمان پر بھی ٹھہرنا محال ہے۔ ۷؎ دوست کو شاعر نے چاند فرض کیا ہے جس کا حسن روز افزوں ہے۔ قاعدہ ہے کہ چاند جب کمال کو پہنچ جاتا ہے تو پوری رات ٹھہرتا ہے اور جب تک کامل نہیں ہوتا اُس کا قیام مختصر ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہم طولِ شبہائے جدائی سے ہلال کی طرح کاہیدہ ہو گئے۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے کہ وہ حسن کامل ہو کر دیر تک ہمیں اپنے جلوے سے مستفید کرے۔ ۸؎ اگر بیتابی دل کا مضمون (بیتابی کی وجہ سے) دھیان میں نہ ٹھہرا تو میں اُس کو تم زنجیرِ کاکل سے باندھونگا۔ باندھونگا کے لفظ میں ایہام ہے۔
۹؎ مومن طوافِ کعبہ کا عادی ہے۔ اگر تم نے ترکِ عادت پر مجبور کیا اور اپنے گرد طواف کرنے (صدقے ہونے) نہ دیا تو اُس کا یہاں ٹھہرنا مشکل ہے۔

یہ عذرِ[1] امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام اُس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

نہ شادیِ مرگ ہوں کیونکر ہے مژدہ[2] قتلِ دشمن کا
کہ گھر میں سے لیے شمشیر وہ روتا نکل آیا

ستم اے گرمیِ ضبطِ فغاں و آہ چھاتی پر
کبھو بس پڑ گیا چھالا کبھو پھوڑا نکل آیا

کیا زنجیر[3] مجھکو چارہ گر نے کس دنوں میں جب
عدو کی قید سے وہ شوخ بے پروا نکل آیا

نکل آیا اگر آنسو تو ظالم مت نکال[4] آنکھیں
سنا معذور ہے مضطر نکل آیا نکل آیا

ہمارے[5] خونبہا کا غیر سے دعوی ہے قاتل کو
یہ بعدِ انفصال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا

ہوئی[6] بلبل ثنا خوانِ دہانِ تنگ کس گل کی
کہ فروردین میں غنچہ کا مُنہ اتنا سا نکل آیا

کوئی تیر اسکا دل میں رہ گیا تھا کیا کہ آنکھوں سے
ابھی رونے میں اک پیکان کا ٹکڑا نکل آیا

دمِ بسمل یہ کس کے خوف سے ہم پی گئے آنسو
کہ ہر زخمِ بدن سے خون کا دریا نکل آیا

خدنگِ یار کے ہمراہ نکلی جان سینے سے
یہی ارمان اک مدت سے جی میں تھا نکل آیا

بہت نازاں ہے تو لے قیس وحشت پر دکھاؤنگا
کتابوں میں کبھو قصہ جو مومن کا نکل آیا

[1] عاشق نے دوست کو بے التفاتی کا الزام دیا اُس نے اُلٹا عاشق کا قصور ثابت کر دیا اور کہا کہ میں تمھارے دل کی کشش کا امتحان کرتا تھا کہ اگر کشش صادق ہے تو خود مجھے کھینچ بلائے گی۔ اُسکے اس عذر نے عاشق کا الزام باطل کر دیا۔ [2] شمشیر لیے روتا نکلنا اس امر کا مژدہ ہے کہ وہ دشمن کو قتل کریگا۔ [3] زنجیر کرنا = قید کرنا۔ فارسی محاورہ کا ترجمہ ہے۔ [4] آنکھیں نکالنا اصلی معنی میں اور نیز ناراض ہونے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثل مشہور ہے المجبور معذور۔ [5] قاتل نے عاشق کو قتل کیا۔ خیر یہانتک تو مضائقہ نہ تھا۔ مگر شکایت اس کی ہے کہ اب وہ رقیب سے اُس کا خونبہا طلب کرتا ہے اسلئے کہ وہی محرک قتل تھا۔ قتل کا تحریک دشمن سے ہونا یا قتل کے بعد دشمن سے دوست کا سلسلہ معاملت جاری رکھنا عاشق برداشت نہیں کر سکتا۔ [6] فروردین = فارسی کے پہلے مہینہ کا نام جو بہار کا زمانہ ہے۔ گل سے معشوق مراد ہے۔ اتنا سا مُنہ نکل آنا = خجل ہوجانا۔

[1] روزِ جزا جو قاتلِ دلجو خطاب تھا — میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا

[2] ناصح ہے طعنہ زن مری ناکامیوں پہ کیا — دلجوئیوں سے تیری کبھی کامیاب تھا

[3] پھرنے سے شام وعدہ تھکے یہ کہ سو رہے — آرام شکوۂ ستمِ اضطراب تھا

[4] کیا کیا شکن دیئے ہیں دلِ زار کو مگر — اُس کے خیال میں ورقِ انتخاب تھا

[5] عاشق ہوئے ہیں آپ کہیں گو اُسی پہ ہوں — شب حال غیر مجھ سے زیادہ خراب تھا

[1] دلجو کے لفظ میں گونہ ایہام ہے یعنی دل کا تلاش کرنے والا اور نیز مہربانی کرنے والا۔ عاشق نے حشر میں اپنے قتل کرنے والے معشوق کو قاتل دلجو کہکر دعواے خون کیا۔ مگر دعویٰ اس بنا پر خارج کر دیا گیا کہ مدعی خود اپنی زبان سے قاتل کی تلافی جرم (دلجوئی) کا مقر ہے۔ اس میں صنعت القول بالموجب پائی جاتی ہے۔ [2] اگر کامیاب تھا کا فاعل ناصح ہو تو مراد یہ ہے کہ ناصح مجھے میری ناکامیوں پر طعنے دیتا ہے۔ شاید اُس کو کبھی تیری عنایتوں کا ذاتی تجربہ ہو چکا ہے۔ اگر فاعل میں ہو جو محذوف ہے تو مطلب یہ ہے کہ میں پہلے کب مورد کرم تھا جو اب ناکامی پر مجھے طعنہ دیا جاتا ہے۔ [3] شام وعدہ انتظار یار میں ہمیں اس قدر تگ و دو کرنی پڑی کہ آخر تھک کر سو رہے۔ لہذا ہم کو آرام کا طعنہ دینا بیجا ہے اسلیے کہ اگر تھکے ہوئے نہ ہوتے تو کیوں سوتے گویا یہ آرام نہیں بلکہ اضطراب کے ہاتھوں جو ظلم اُٹھائے ہیں زبان حال سے اُن کا شکوہ ہے۔

[4] قاعدہ ہے کہ کتاب میں جس ورق کو پڑھنے کے لیے انتخاب کرتے ہیں اُس کو شکن دیدیتے ہیں۔ محبوب نے شاید میرے دل کو ورق انتخاب خیال کیا جو اُس کو اس قدر شکن (دکھ) دیئے۔ [5] شاعر کے نزدیک عشق میں خود رفتگی۔ دنیا و ما فیہا (حتیٰ کہ خود معشوق) سے بیخبری اور حالت کی خرابی لازم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رات رقیب کا حال مجھ سے بھی زیادہ خراب تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ (معشوق) کہیں عاشق ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے اُس کی طرف وہ نظر التفات نہیں رہی گو اُسی پہ ہوں یہ ٹکڑا شاعر کی انتہائی شوخی ہے۔ یعنی آپ کو پہلے اُس پر التفات تھا۔ اب ممکن ہے آپ کی وہ حالت عشق کے درجہ تک پہنچ گئی ہو۔ اور بیخبری ٹھہری لازمۂ عشق۔ اسلیے رقیب کا حال تباہ ہونا امر مسلم لیکن اگر آپ کے لفظ سے طنزاً رقیب کو اور لفظ اُسی سے معشوق کو مراد لیا جائے تو مطلب زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔

وقتِ[۶] وداع بے سبب آزردہ کیوں کیا	ہوئے	یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا
وہ چشمِ انتظار کہاں باز بعدِ مرگ		دیکھا[۷] تو ہم نے آنکھ نہ لگنا بھی خواب تھا
بے پردہ غیر سے نہ ہوا ہوگا شب کہ صبح		آنکھوں[۸] میں شرم تھی نہ نظر میں حجاب تھا
دیکھا[۹] نہ ہے یہ رشک و حسد وہ بلا کہ آج		سنبل کو تیری زلف کا سا پیچ و تاب تھا
ہوں[۱۰] کیوں نہ محوِ حیرتِ نیرنگہائے شوق		جو دل میں شعلہ تھا وہی آنکھوں میں آب تھا
کیا[۱۱] جی لگا ہے تذکرۂ یار میں عبث		ناصح سے مجھکو آج تلک اجتناب تھا

روزِ جزا خدا بُتِ جلّاد کو ملا
گویا کہ خونِ ناحقِ مومن صواب تھا

مجھکو تیرے عتاب نے مارا	یا مرے اضطراب نے مارا
بزمِ مے میں بس ایک میں محروم	آپ کے اجتناب نے مارا
لے کے دل بھی کبھی نہیں جاتی	زلف کے پیچ و تاب نے مارا

[۶] معشوق چلتے وقت عاشق سے بے سبب آزردہ ہوا۔ عاشق نے اُسکی طرز پہ توبیخ یوں کی کہ آپنے یہ ناحق کا جھگڑا میرے پاس خاطر سے اسلیے نکالا کہ آپکے جانے کے بعد جھگڑے کو یاد کرکے آپکی یاد مجھے کم ستائے اسلیے کہتا ہے کہ اس تکرار بیجا کی کیا ضرورت تھی آخر میرے ستانے کے لیے عذاب ہجر کیا کم تھا۔ [۷] بعد مرگ آنکھ لگ گئی اور معلوم ہوا کہ انتظار کا جاگنا خواب (بے اصل) تھا۔ [۸] محبوب کی آنکھوں کی بے حجابی اس امر کی علامت ہے کہ شب وہ غیر سے بے پردہ نہیں ہوا۔ ورنہ صبح کو ضرور محجوب اور شرمندہ ہوتا۔ [۹] سنبل کو زلف کا سا پیچ و تاب حسد کا نتیجہ ہے۔ اس میں غالباً اس امر کی تنبیہ ہے کہ جب سنبل کا زلف کے رشک سے یہ حال ہے۔ تو میں انسان ہوں مجھے رشک سے پیچ و تاب کیوں نہ ہو [۱۰] عشق کے نیرنگ (طلسم) کا یہ اثر ہے کہ دل کے شعلے آنکھوں سے آنسو بنکر نکلنے لگے۔ [۱۱] لفظ عبث کا تعلق مصرع ثانی سے ہے یعنی میں نے ناحق ناصح سے اب تک اجتناب (پرہیز) رکھا۔ اسلیے کہ دوران نصیحت میں ذکر دوست آتا ہے اور ذکر دوست سے تسکین ہوتی ہے

کیا[1] پسند آئی اپنی جور کشی — چرخ کے انتخاب نے مارا
خاک[2] اٹھیں گے خاک سے جو نہیں — ترکِ آرام و خواب نے مارا
تشنہ کامی وصال[3] کی مت پوچھ — شوقِ تیغِ خوش آب نے مارا
خون کیونکر مرا کھلے کہ مجھے — اک سراپا حجاب نے مارا
یادِ ایامِ وصلِ یار افسوس — دہر کے انقلاب نے مارا
لبِ[4] میگوں پہ جان دیتے ہیں — ہمیں شوقِ شراب نے مارا
جبہہ[5] سائی کا بھی نہیں مقدور — اُن کی عالی جناب نے مارا
نازک[6] اندام سے لگی ہے آنکھ — حسرتِ فرشِ خواب نے مارا
کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں — مجھے فکرِ جواب نے مارا
یوں کبھی نوجواں نہ مرتا میں — تیرے عہدِ شباب نے مارا

مومن از بس ہیں بے شمار گناہ
غمِ روزِ حساب نے مارا

دیکھ[1] لو شوقِ ناتمام مرا — غیر لے جائے ہے پیام مرا
بے اثر ہے فغانِ[2] خوں آلود — کیوں نہ ہوئے خراب کام مرا

[1] میرے ظلم اُٹھانے کی ادا آسمان کو پسند آئی - اسلیے ظلم کرنے کے لیے اُسکی نظرِ انتخاب مجھی پر پڑی - اے روشنیِ طبع تو برمن بلا شدی - [2] جس قدر دُنیا میں آرام و خواب سے محروم رہے - مرنے کے بعد ہمیں اسی قدر گہری نیند آئیگی - اسلیے حشر میں قبر سے اُٹھنا معلوم - [3] وصال = موت - [4] میگوں = شراب فام یا سُرخ رنگ - دوسرے مصرع میں شراب سے لب میگوں ہی مراد ہے - [5] جبہہ سائی = پیشانی گھسنا - جناب = آستان - [6] جب سے آنکھ لگی (عشق ہوا) فرشِ خواب کی حسرت ہی رہی یعنی نیند حرام ہو گئی -
[1] اگر میرا عشق ناتمام (خام) نہ ہوتا تو غیر کے پیام لے جانے کی کیا ضرورت تھی - خود دوست کے دل کو خبر ہو جاتی یا میں خود اپنا پیام لے کر پہنچتا - غیر کوئی دوسرا شخص - رقیب بھی مراد ہو سکتا ہے - [2] فغانِ خون آلود = وہ فریاد جو خون کے ساتھ مُنہ سے نکلے - کام کے لفظ میں ایہام ہے اُسکے دوسرے معنی تالو کے ہیں -

آتشیں خو سے آرزوئے وصال
پک[53] گیا اب خیالِ خام مرا

دیکھنا کثرتِ بلا[54] نوشی
کاسۂ آسماں ہے جام مرا

رتبہ اُفتادگی کا دیکھو ہے
عرش کے بھی پرے مقام مرا

کس صنم کو چھڑا دیا واعظ
لے خدا تجھ سے انتقام مرا

ہو کے[55] یوسف جو دل چُراتے ہو
کون ہو جائے گا غلام مرا

اُس لبِ لعل کی شکایت ہے
کیونکہ رنگیں نہ ہو کلام مرا

تو نے رسوا کیا مجھے اب تک
کوئی بھی جانتا تھا نام مرا

ق
زانوے بت پہ جان دی دیکھا
مومن انجام و اختتام مرا

بندگی کام آ رہی آخر
مَیں نہ کہتا تھا کیوں سلام مرا

ناز بیجا[1] سے سوا شرم کے حاصل نہ ہوا
غیر پر ظلم کیے میرے مقابل نہ ہوا

خود گلا کاٹ موا جبکہ مَیں بسمل نہ ہوا
[2] اُن کو آساں نہ ہوا جو مجھے مشکل نہ ہوا

---

[53] میرا سودائے خام (جنون عشق) اب پختہ ہوگیا - گویا دوست کی آتشیں خوئی (بدمزاجی) نے میرے خیال کو اُتنا مستحکم کر دیا - قاعدہ ہے کہ کچی چیز آگ سے پک جاتی ہے - آتشیں خو اور پک گیا میں ایہام تناسب ہے

[54] بلانوشی = شدت سے نوشی اور چونکہ آسمان ہی سے بلائیں آتی ہیں اسلیے بلانوشی کے لفظ میں لطف پیدا ہوگیا

[55] تم جو یوسف ہو کر میرا دل چُراتے ہو - یہ تو بتاؤ کہ چوری کی سزا کون بھگتے گا - حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں قاعدہ تھا کہ جس پر مال کی چوری کا جرم ثابت ہوتا تھا اُس کو صاحب مال کا غلام بننا پڑتا تھا - چنانچہ مشہور ہے کہ جب حضرت یوسفؑ بچے تھے اور اپنی پھوپھی کے یہاں پرورش پاتے تھے ایک مرتبہ پھوپھی نے اُنکے روکنے کی نیت سے اُن پر چوری کا اتہام لگایا جس پر اُنکو کئی سال اُنکے گھر رہنا پڑا -

[1] معشوق نے ناز سے رقیب پر ظلم کیے - ناز کو بیجا اس لیے کہا ہے کہ اُس ناز کا محل صحیح عاشق تھا نہ کہ غیر نتیجہ ہوا کہ وہ اُسکے ظلم کا متحمل نہ ہوسکا - اب معشوق کو اپنے غلط انتخاب پر شرم (ندامت) پیدا ہوئی جسکے اثر سے اُسکو عاشق کے سامنے ہونے کی جرأت نہ پڑی - [2] جو بات (قتل عاشق) معشوق کو (نزاکت کے باعث) آسان نہ ہوئی - وہ عاشق کو مشکل نہ معلوم ہوئی -

کس طرح بزم میں وہ آنکھ چرائے مجھسے
دل کو کھو کر یہ ڈرا تھا کہ میں غافل نہ ہوا

خوں چھپانے کو مری لاش سے کہتا وہ شوخ
مجھکو یہ غم ہے کہ میں کیوں ترا قاتل نہ ہوا

یاد کاکل میں بھی خود رفتگی اپنی نہ گئی
جوشِ وحشت سے میں پابندِ سلاسل نہ ہوا

دل وہی کیسی وہ دم دیتے ہیں سُن لے دشمن!
کیا نہ دیتے مجھے میں آپ ہی سائل نہ ہوا

خوں مرا یار گلے کا نہ ہو کیوں اے قاتل
دستِ رنگیں مری گردن میں حمائل نہ ہوا

آتشِ سینۂ تفسیدہ کو کیا میں روؤں
اشک جانبِ کرۂ آب کی مائل نہ ہوا

دیتے تکلیفِ شبِ ہجر میں کیا اپنے پاس
نقدِ جاں پیشکشِ مرگ کے قابل نہ ہوا

بے حجابی کا گلہ کیجے تو کہتا ہے ترے
پردۂ چشم کی تقصیر کہ حائل نہ ہوا

کیا گلے ہوتے گر اوروں پہ بھی رحم آجاتا
شکر صد شکر کہ میرا سا ترا دل نہ ہوا

مر گیا جس پہ نہیں گھر میں رسائی اُسکے
تھا تو مومن میں و لے خلد میں داخل نہ ہوا

۱؎ آنکھ چرانا = بے التفاتی کرنا۔ شاعر نے چرانے کے لفظ سے خاص فائدہ لیا ہے۔ ۲؎ اس طریقہ سے قاتل یہ ظاہر کرتا ہے کہ اصلاً کسی اور نے قتل کیا ہے۔ منشا یہ ہے کہ لوگ سمجھیں کہ اگر یہ قاتل ہوتا اور قتل چھپاتا تو ارادہ قتل اس بے بیباکی سے کیوں ظاہر کر دیتا۔ ۳؎ قاعدہ ہے کہ زنجیر و بند سے دیوانہ کی وحشت کم ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں یادِ کاکل (جو سلاسل سے مشابہ ہے) کے باوجود بھی جنون میں کمی نہ ہوئی ۴؎ دلدہی تسلی۔ دم دینا = دھوکا دینا۔ اے دشمن تو جو دوست کی دلدہی پر نازاں ہے یہ تیری نافہمی ہے۔ یہ دلدہی نہیں دھوکا ہے۔ اس لیے میں خود ہی اُن کی (مصنوعی) دلدہی کا طالب نہ ہوا۔ ۵؎ سینۂ گرم کی آگ کا کیا بیان کروں۔ جس کی گرمی کے اثر سے میرے اشک اپنے مرکزِ اصلی (کرۂ آب) کی جانب رجوع کرنے کی بجائے بھاپ بنکر اُڑ گئے۔ ۶؎ شبِ ہجر میں اپنے نہ مرنے کی شاعرانہ توجیہ یوں کرتا ہے کہ ہم موت کو کیا بلاتے۔ کیونکہ (ضعف کے باعث) نقدِ جاں اس قابل نہ رہا تھا کہ موت کو پیش کیا جاتا۔ ۷؎ ترے کا تعلق مصرعِ ثانی سے ہے۔ ایسی ناہموار بندشیں مومن کے یہاں عامۃ الورود ہیں۔ معشوق بے حجابی کے الزام پہ اُلٹا عاشق کو قصوروار ٹھہراتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تمھارا پردۂ چشم حائل ہوتا تو بہتر ہے۔ ۸؎ شکایت نہ ہوتی کیونکہ ذوقِ دید کی انتہا یہ ہے کہ عاشق کو کچھ نظر نہ آسکے۔ ۹؎ شکر ہے کہ تیرا دل میرا سا (نرم) نہ ہوا۔ ورنہ جس طرح تو مجھ پر رحم کرتا اوروں پر بھی رحم کرتا۔ پھر اس صورت میں مجھے رشک پیدا ہوتا۔ ۱۰؎ کاشانۂ یار کو خلد قرار دیا ہے اور مومن کے لیے خلد کا وعدہ ہے۔

فراقِ غیر میں ہے بیقراری یاب اپنا سا
بنایا[۱] تو نے اس کو بھی دلِ بیتاب اپنا سا

کسی کا سوزِ دل ہرگز تجھے باور نہیں آتا
تو سب کو جانے ہے اے مہرِ عالمتاب اپنا سا

جوابِ خونِ ناحق میرا ایسا کیا دیا تو نے
کہ ظالم رہ گئے منہ لیکے سب احباب اپنا سا

اگر مرضی یہی ٹھہری کہ تجھکو چھوڑ دوں مجھکو
بتا دے اور کوئی غیرتِ مہتاب اپنا سا

یہ رنگ آمیزیاں کیسی ہیں کس کا ڈر ہے دیکھو تو
مجھے تو کچھ نظر آتا ہے یہ خونناب اپنا سا

بناوٹ سے یہ زلفیں لاکھ بل کھایا کریں لیکن
یہ ممکن ہی نہیں ہووے جو پیچ و تاب اپنا سا

اگرچہ شعر مومن بھی نہایت خوب کہتا ہے
کہاں ہے لیک معنی بند مضموں یاب اپنا سا

کیا[۳] مرتے دم کے لطف میں پنہاں ستم نہ تھا
وہ دیکھتے تھے سانس کو اور مجھ میں دم نہ تھا

بیخود[۲] تھے عشق تھے محو تھے دنیا کا غم نہ تھا
جینا وصال میں بھی تو مرنے سے کم نہ تھا

شاید[۴] کہ دستِ غیر رہا رات شانہ کش
اُس زلفِ تابدادہ میں کچھ آج خم نہ تھا

جوشِ قلق[۵] نے اس کو بھی دیوانہ کر دیا
پہلے تو ورنہ طبعِ تحمل میں رم نہ تھا

کیوں[۶] جورِ متصل سے ترے غیر کھنچ گئے
میں کیا حریفِ کشمکشِ دمبدم نہ تھا

چھڑکے[۷] ہے لون زخم پہ وہ کیوں ہوں غمیں
الماس کی تھی آس جبھی تاب الم نہ تھا

۱ جس طرح میرا دل دوست کے فراق میں بے تاب ہے اسی طرح دوست فراقِ دشمن میں بیقرار ہے۔ ۲ بیخودی کا یہ عالم ہے کہ عاشق درِ یار کو دیکھکر نہیں پہچانتا۔ پھر در پر اپنے خون کے داغ دیکھکر کچھ کچھ یاد آتا ہے کہ شاید یہ وہی در ہوگا۔ ۳ آن کا سانس کو دیکھنا بظاہر لطف کی صورت ہے۔ مگر اصلاً انکو یہ بدگمانی ہے کہ عاشق مردہ بنگیا ہے گویا انکا یہ آئین بھی ستم مضمر ہے۔ ۴ زلف کے بل کا نکل جانا اس امر کی مخبری کر رہا ہے کہ رات دستِ غیر نے شانہ کا کام دیا۔ ۵ قلق (صبر) پہلے تو مجھ سے اسقدر رم نہ کرتا تھا جسقدر اب کرتا ہے۔ شاید میری بیتابی نے اسکو بھی دیوانہ کر دیا۔ قاعدہ ہے کہ دیوانے سب سے رم کرتے ہیں۔ ۶ معشوق کے ظلم پیہم کی وجہ سے بوالہوس کیوں علیحدہ ہوگئے۔ آخر میں بھی تو روز روز کے ستم برداشت کرتا رہا۔ ۷ عاشق ایذا پسند زخم پر نمک چھڑکنے سے غمگین ہے اور سودہ الماس کو اس پر ترجیح دیتا ہے۔ اسلیئے کہ الماس سے اذیت زیادہ ہوتی ہے۔ الم اور آس کے الفاظ عمداً استعمال کیے ہیں کیونکہ دونوں کے ملانے سے الماس بنتا ہے۔

میں مرگیا[1] وہ چشم جو یاد آئی او یار — حیراں ہیں کہ مے تھی پیالہ میں سم نہ تھا
چھوڑا نہ دل میں کچھ بھی تپِ ہجر نے کہ رات — روتے تھے زار زار اور آنکھوں میں نم نہ تھا
درباں[2] کو آنے دیتے پہ میرے نہ کیجے قتل — ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

مومن چلا گیا تو چلا جائے اے بتو
آخر قدیم خادمِ بیت الصنم نہ تھا

انتخاب

غیر کو سینہ[3] کہہ سے سیمبر دکھلا دیا — تم نے کیا کچھ کس کو اپنی بات پر دکھلا دیا
زرد[4] منہ دکھلا دیا غم کا اثر دکھلا دیا — آج ہم نے اُس کو اپنا زور و زر دکھلا دیا
صبح[5] سے تعریف ہے صبر و سکونِ غیر کی — کس نے شب مجھکو تڑپتے پیش در دکھلا دیا
موت کے صدقے کہ وہ بے پردہ آئے لاش پر — جو نہ دیکھا تھا تماشا عمر بھر دکھلا دیا
اس کے دل میں اب خیالِ قتل ہر دم آئے ہے — موت کو کس نے الٰہی میرا گھر دکھلا دیا
گو حسد[6] سے ہو پر اب بھی ہے وہی ناصح کی بات — ناصح اُس جانِ جہاں کو اک نظر دکھلا دیا
نامِ اُلفت کا نہ لونگا جب تلک ہے دم میں دم — تو نے چاہت کا مزہ اے فتنہ گر دکھلا دیا

[1] پیالۂ مے دیکھکر عاشق کو چشمِ معشوق یاد آئی اور مرگیا۔ دوستوں کو حیرت ہوئی کہ شراب نے کیونکر سم (زہر) کا اثر دکھایا۔ [2] اس لیے کہ حرم (کعبہ) میں کسی کی روک ٹوک نہیں۔ اس کے علاوہ حرم میں قتل بھی ممنوع ہے۔ [3] سیم بر = جس کا سینہ چاندی جیسا ہو۔ غیر نے تم کو سیمبر کہا۔ تم نے اُسکی خوشامد سے متاثر ہوکر اُسکو سینہ دکھا دیا۔ [4] زرد چہرہ کو زر اور غم کے اثر کو زور سے تعبیر کیا ہے۔ [5] شاعر معشوق کی بے امتیازی کا شکوہ سنج ہے۔ یعنی رقیب تو اس لیے نہیں تڑپتا کہ اُس کا دل دردِ محبت سے خالی ہے۔ مگر وہ اس کو صبر و ضبط سمجھکر اُلٹی اُس (رقیب) کی تعریف کرتا ہے۔ [6] مومن نے ناصح کو قائل کرنے کی غرض سے اپنے محبوب کی صورت دکھادی۔ مگر یہ غضب ہوا کہ وہ اُس کو دل دے بیٹھا اور مومن کو ترکِ عشق کی نصیحت کرنے لگا۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے ہمدردی کی نیت سے نصیحت تھی، اب جذبۂ رشک کی بنا پر ہے۔

جب کہا دل پھیر دو بولے کہ دل پہلو میں ہے
میں نے اُن کی ضد سے سینہ کا ٹکڑ دکھلادیا

اس قیامت قد کو شب دیکھا تھا ہم نے خواب میں
دل نے محشر کا سماں وقتِ سحر دکھلا دیا

صورتِ[۹] اغیار کو دیکھے ہے وہ حیرت زدہ
میرے رنگِ رخ نے آئینہ مگر دکھلادیا

سخت کمبختی ہوئی یہ بھی نصیبوں کا لکھا
غیر کو خط نامہ بر نے بے خبر دکھلا دیا

دیکھیں گے مومن یہ ہم ایمان بالغیب[۱۰] آپ کا
اُس بتِ پردہ نشیں نے جلوہ گر دکھلا دیا

غیروں[۱۱] پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

اُڑتے[۱۲] ہی رنگِ رخ مرا نظروں سے تھا نہاں
اس مرغِ پرشکستہ کی پرواز دیکھنا

دشنام[۱۳] یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہمنفس نزاکتِ آواز دیکھنا

دیکھ[۱۴] اپنا حال زار منجم ہوا رقیب
تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا

۹ محبوب میرے رنگِ رخ کی تغییر دیکھکر حیرت زدہ ہوا۔ گویا میرے رنگِ رخ نے آئینہ کا کام کیا۔ اب وہ اغیار کی صورت کو حیرت سے دیکھتا ہے کہ ان لوگوں پر میرے حسن کا وہ اثر کیوں نہیں ہوا جو مومن پر ہے۔ آئینہ دکھلانے کے لفظوں میں یہ مفہوم بھی ہے کہ میرے تغیرِ رنگ نے رقیبوں کی بے حسی کی حقیقت آشکار کر دی۔ ۱۰ ایمان بالغیب = بے دیکھی چیزوں (باری تعالیٰ اور قیامت وغیرہ) پر اعتقاد کرنا جو اسلام کا منشا اور مومن کی شان ہے یعنی اگر آپ بتِ پردہ نشین کا جلوہ دیکھکر بھی خدا کے قائل ہیں تو ہم آپ کا دعویٰ ایمان تسلیم کر سکیں گے۔ ۱۱ اگر تم چاہتے ہو کہ رازِ محبت غیروں پر نہ کھلے تو میری طرف بھی دیکھو ورنہ لوگ تاڑ جائیں گے کہ کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے۔ غماز = سخن چین۔ اشارے کرنے والا۔ ۱۲ رنگ کو شکستہ (متغیر) ہونے کی وجہ سے پرشکستہ قرار دیا ہے اور اڑنے کی رعایت سے مرغ کہا ہے۔ ۱۳ نزاکت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اب اُنکی سخت کلامی بھی گراں نہیں گذرتی گراں اور نزاکت کے الفاظ سے شاعر نے فائدہ اُٹھایا ہے۔ ۱۴ منجم نے شاعر کا حال زار دیکھا اور تاثیر نجوم کے حساب سے اُسکی ناکامیِ عشق کا پتہ لگالیا اور خود اُس کا رقیب بن بیٹھا۔ کیونکہ عاشق کی ناکامی دریافت کرکے اُس کو اپنی کامرانی کی توقعات پیدا ہوئیں۔ اس طریقہ سے اُس کا طالع ناساز دیکھنا منجم کے حق میں سازگار ہوا۔

بد کام کا مآل برا ہے جزا کے دن ۵۲
حالِ سپہر تفرقہ انداز دیکھنا

مت رکھیو گردِ تارکِ عشاق پر قدم ۵۳
پامال ہو نہ جائیے سرافراز دیکھنا

کشتہ ہوں اس کی چشمِ فسونگر کا اے مسیح
کرنا سمجھ کے دعوے اعجاز دیکھنا

میری نگاہ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو ۵۴
بے طاقتی پہ سرزنشِ ناز دیکھنا

ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے ۵۵
مومن غمِ مآل کا آغاز دیکھنا

۳۲

کہہ رہا ہے کون کس سے بے شکیبائی ملا ۱
مجھکو قسمت سے نصیحت گر بھی سودائی ملا

میرے گھر بھی پھرتے چلتے ایک دن آ جائیگا
دو مبارکباد اب کی یار ہرجائی ملا

گور میں بھی جوشِ غم دل سے نہ نکلا ہائے ہائے ۲
آپ ہی میں ہم نہیں جب کنجِ تنہائی ملا

ہم بھی تو ناداں ہیں آخر یاس مطلب کس لئے ۳
خضر موسیٰؑ کو پئے تعلیمِ دانائی ملا

۵۲ مذہبی معتقدات کے بموجب آسمان قیامت کے روز ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا۔ شاعر کے نزدیک یہ اُن تفرقہ اندازیوں کی سزا ہے جو آسمان نے کی تھیں۔ ۵۳ یہ مومن کا مخصوص رنگ ہے جسکو میں مکر شاعرانہ سے تعبیر کرتا ہوں مراد یہ ہے کہ تارک (سپہر) عاشق کی خاک کو پامال نہ کرنا ورنہ تمھارے قدموں سے اسکی خاک کی آبرو بڑھ جائیگی اور ظاہر ہے کہ معشوق کو عاشق کی سرفرازی منظور نہیں۔ ۵۴ میری نگاہ بے طاقتی کی وجہ سے تابِ دیدار نہ لاسکی اور خیرہ ہو گئی معشوق طعن سے غیر کو میری نگاہ خیرہ دکھاتا اور ازراہ ناز اس بیطاقتی پر سرزنش کرتا ہے۔ ۵۵ شاعر نے جس غمِ مآل و سوزِ جحیم کے خوف سے ترکِ عشقِ صنم کیا تھا وہی تکلیف ترکِ عشق کی بدولت ابتدا ہی میں پیش آئی۔ گویا عشقِ صنم کا مآل عذابِ دوزخ ہوتا مگر یہاں آغاز ہی میں ترکِ عشق کے باعث عذابِ دوزخ کی سی اذیت ہے۔ جس غمِ مآل کا آغاز یہ ہے نہ جانے انجام کیا ہوگا۔ حاصل یہ ہے کہ سوزِ جحیم کے خیال سے ترکِ صنم محض بے نتیجہ ہے۔

۳۲ ۱ نصیحت گر (ناصح) دیوانہ ہے کہ مجھکو تلقینِ صبر و شکیبائی کرتا ہے کیونکہ صبر عاشق سے محال ہے۔ یا یہ کہ صبر کر کے بیٹھ رہنے سے مقصد اور زیادہ عسیر الحصول ہو جاتا ہے۔ ۲ زندگی میں جوشِ غم دل سے نہ نکل سکا اس لیے کہ دنیا میں کنجِ تنہائی نہ تھا کہ رو کر دل کا بخار نکالتے۔ اب گور میں کنجِ تنہائی نصیب ہوا تو جوشِ غم کا نکلنا معلوم اس لیے کہ یہاں ہم اپنے ہوش میں نہیں۔ ۳ حضرت موسیٰؑ بعض اسرارِ کائنات سے ناواقف تھے اس لیے اُن کو حکم ہوا کہ حضرت خضرؑ کی صحبت میں رہکر اُن رموز کی تعلیم حاصل کریں۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم بھی تو ناداں ہیں ہم کو اپنے مقصود سے ناامید نہ ہونا چاہیئے۔ کیا عجب ہے کہ اسی طرح قدرت ہماری رہنمائی کا سامان بھی پیدا کر دے۔

پند گو حالِ زلیخا یاد کر کچھ خیر ہے
کامِ دل جس کو ملا یاں بعدِ رسوائی ملا

تلخکامی۵۵ پر مجھے تجھکو لبِ شیریں پہ ناز
آ مرے جادو سے اعجازِ مسیحائی ملا

شے۵۶ جنون ایسے کے آگے ٹھہرنا اے بوالہوس
دیکھتے ہی مجھکو بھاگا جو تماشائی ملا

جستجو۵۷ سے وصلِ دلبر کی تمنا کس لیے
کیا دلِ گم گشتہ اسے ہنگامہ آرائی ملا

چھوڑ۵۸ بتخانہ کو مومن سجدہ کعبے میں نہ کر
خاک میں ظالم نہ یوں قدرِ جبیں سائی ملا

۳۳

ہمرنگ لاغری سے ہوں گل کی شمیم کا
طوفانِ باد ہے مجھے جھونکا نسیم کا

چھوڑا نہ کچھ بھی سینہ میں طغیانِ اشک نے
اپنی ہی فوج ہوگئی لشکر غنیم کا

یارانِ نو کے واسطے مجھسے خفا ہوا ہے
تم کو نہیں ہے پاس نیازِ قدیم کا

یاد۵۹ آئی کافروں کو مری آہ سرد کی
کیونکر نہ کانپنے لگے شعلہ جحیم کا

از بسکہ۶۰ ثبت نامہ ہے سوزِ تپِ دروں
قاصد کا ہاتھ ہے یدِ بیضا کلیم کا

واعظ۶۱ کبھی ہلا نہیں کوئے صنم سے میں
کیا جانوں کیا ہے مرتبہ عرشِ عظیم کا

۵۵ آ میرے جادو سے اپنے اعجاز کا مقابلہ کر۔ اثر کے لحاظ سے تلخکامی کو جادو اور لبِ شیریں کو اعجازِ مسیحائی قرار دیا ہے۔ ۵۶ اسی طرح تیرا (بوالہوس کا) میرے مقابلہ میں ٹھہرنا جنون ہے۔ بوالہوس = رقیب۔ ۵۷ شاعر ہنگامہ آرائی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تیری جستجو سے دلِ گم گشتہ کب ملا جو اب وصلِ دلبر کے حصول کی آرزو کی جائے۔ ۵۸ چھوڑ = چھوڑ کر۔ ۵۹ کافروں نے جحیم (دوزخ) میں عاشق کی آہ سرد کا تذکرہ کیا جس کے اثر سے شعلۂ دوزخ بھی سردی کے مارے کانپنے لگا۔ شعلہ کا کانپنا عام طور پر مشہور ہے۔ مگر اس کی یہ توجیہ و تعلیل خاص مومن کی جدت ہے۔ ۶۰ یدِ بیضا = روشن ہاتھ یعنی حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا دستِ مبارک جو بچپن میں آگ سے جل گیا تھا اور بعد کو معجزہ سے آفتاب کی طرح چمکتا تھا۔ چونکہ خط میں سوزِ دل کا ذکر ہے اس لیے قاصد کے ہاتھ میں یدِ بیضا کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ ۶۱ واعظ نے عرشِ عظیم کا مرتبہ بیان کیا جس پر عاشق کہتا ہے کہ مجھکو تو صرف کوئے صنم سے سروکار رہا ہے میں عرش کو کیا جانوں۔ یعنی شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اس میں عرشِ عظیم پر کوئے صنم کی ترجیح نکلتی ہے۔

مارا ہے وصلِ غیر کے شکوہ پہ جانیے		مدفن[۴] جدا جدا مری لاشِ دو نیم کا
کہتا ہے بات بات پہ کیوں جان کھا[۵] گئے		گویا کہ پک گیا ہے کلیجہ ندیم کا
واعظ[۶] بتوں کو خلد میں لیجائیں گے کہیں		ہے وعدہ کافروں سے عذابِ الیم کا

مومن تجھے تو وہب[۷] ہے مومن وہی نہیں
جو معتقد نہیں تری طبعِ سلیم کا

جوں نکہتِ[۱] گل جنبش ہے جی کا نکلجانا	۳۴	اے بادِ صبا میری کروٹ تو بدل جانا
پالغز[۲] محبت سے مشکل ہے سنبھل جانا		اس رخ کی صفائی پہ اس دل کا پھسل جانا
سینہ[۳] میں جو دل تڑپا دھر ہی تو دیا دیکھا		پھر بھول گیا کیسا میں ہاتھ کا جل جانا
اتنا تو نہ گھبراؤ راحت یہیں فرماؤ	آتے ہو	گھر میں مرے رہجاؤ آج اور کبھی کل جانا
اے[۴] دل وہ جو یاں آیا کیا کیا ہمیں ترسایا		تو نے کہیں سکھلایا قابو سے نکل جانا
کیا[۵] ایسے سے دعوی ہو محشر میں کہ میں نے تو		نظارۂ قاتل کو احسان اجل جانا

۴ لاش دو نیم کے دو جدا جدا مدفن اس امر کی نشانی ہونگے کہ یہ وصلِ غیر کے شکوہ پر قتل کیا گیا تھا۔
۵ جان کھانا = فضول گوئی سے پریشان کرنا کلیجہ پک جانا = عاجز آجانا۔ پکنے اور کھانے کی رعایت ذرا مبتذل ہے۔ ۶ خدا نے کافروں سے دوزخ کے عذاب الیم کا وعدہ کیا ہے۔ مومن دریافت کرتا ہے کہ کیا بتوں کو دوزخ سے خلد میں بھیجدیا جائیگا کیونکہ اگر بت بھی دوزخ میں ہوئے تو کافروں کو عذاب کا ہونا معلوم۔ بلکہ بتوں کا قرب اور راحت کا موجب ہوگا۔ ۷ وہب = بخشش۔ خدا کی دین ظاہر ہے کہ جو خدا کی دین کا منکر ہے وہ مسلمان ہی نہیں۔

۳۴ ۱ انتہائے نقاہت ہے کہ جنبش کرنے میں جانکنی کی سی ایذا ہوتی ہے اور جان سی نکلنے لگتی ہے جیسے ہوا کی حرکت سے بوئے گل نکلجاتی ہے۔ ۲ پالغز = لغزشِ پا۔ مصرع ثانی پالغز کی تفسیر کر رہا ہے ۳ پہلے دل پر ہاتھ رکھا تھا جو فوراً ہی دل کی حرارت سے جل گیا تھا۔ اب جو دل تڑپا تو پھر ہاتھ دھر دیا اور وہی تلخ تجربہ پھر ہوا۔ ۴ یعنی جس طرح دل قابو سے نکل جاتا ہے اسی طرح معشوق بھی قابو سے نکل جاتا ہے۔ شاید یہ عادت میرے دل نے سکھا دی۔ ۵ جب میں نے اپنے قتل کے وقت نظارۂ قاتل کو موت کا احسان تصور کیا تو ایسے شخص پر محشر میں دعوائے قتل کیسے کروں گا۔

ہے ظلم کرم جتنا تھا فرق پڑا کتنا		مشکل ہے مزاج اتنا اک بار بدل جانا
حوروں کی ثنا خوانی واعظ یونہیں کب مانی		لے آکر ہے نادانی باتوں میں بہل جانا
عشق اُنکی بلا جانے عاشق ہو تو پہچانے		لو مجھکو اطبا نے سودے کا خلل جانا
کیا باتیں بناتا ہے وہ جان جلاتا ہے	ق	پانی میں دکھاتا ہے کافور کا جل جانا
مطلب ہے کہ وصلت میں ہے بوالہوس آفت میں		اس گرمیٔ صحبت میں اے دل نہ پگھل جانا

دم لینے کی طاقت ہے بیمار محبت سے اتنا بھی غنیمت ہے مومن کا سنبھل جانا	بیت

کیا قہر طعن بوالہوس بے ادب ہوا	۳۷	جرم رقیب قتل کا میرے سبب ہوا
محو جفا ستم کش الطاف کب ہوا		رحم اُس کو میرے حال پہ آیا غضب ہوا
بوسے دم غضب لیے اُلٹی سمجھ تو دیکھ		بل جو پڑا جبیں پہ تمنا کو لب ہوا
کس دن کمی اسکے دل میں محبت جواب نہیں		سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

۱ کس قدر فرق پڑ گیا کہ پہلے جتنا کرم تھا اب اُتنا ستم ہے۔ ۲ یعنی حوروں کو دُنیا میں لے آ کیونکہ میں خالی وعدوں سے بہلنے والا نہیں۔ ۳ کافور پانی میں جلتا رہتا ہے۔ معشوق اس تمثیل سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے اسی طرح رقیب سردمہر وصل کی گرم جوشی سے عذاب میں ہے۔ اس پر عاشق اپنے دل کو مخاطب کرتا ہے کہ کہیں معشوق کی التفات ظاہری پر نہ بھول جانا اور اسکو ان باتوں سے حقیقت میں اپنا ہی خواہاں نہ سمجھ لینا یہ دونوں شعر قطعہ بند ہیں۔

۱ بوالہوس بے ادب نے معشوق کے حضور میں کوئی گستاخی کی۔ عاشق نے معشوق کو اسکا طعنہ دیا جس پر مشتعل ہوکر اُس نے رقیب کو نہیں بلکہ عاشق کو قتل کر دیا۔ گویا عاشق کے قتل کا سبب جرم رقیب (گستاخی) ہوا۔ ۲ جو شخص لذت جفا کا خوگر ہو گیا ہو اسکو لطف کا ستم کش ہونا کیونکر گوارا ہوگا کیونکہ عادت کے خلاف ہر چیز (لطافت ہی کیوں نہ ہو) بُری معلوم ہوتی ہے۔ ۳ شاعر اپنی اُلٹی سمجھ کا رونا روتا ہے کہ غصہ کے وقت محبوب کے پیشانی کے بل کو لب سمجھ کر تمنا کے بوسے لینے شروع کر دئے۔ اس شعر میں یہ لطف ہے کہ بل کو اگر الٹو تو لب ہو جاتا ہے۔ ۴ رقیب نے کہا کہ معشوق مجھ سے بے سبب خفا ہوا۔ (یعنی میں بے قصور تھا) ۔ عاشق نے معشوق سے اسی بات کو دہراتے ہوئے کہا کہ تم رقیب سے بے سبب خفا ہوئے اور اس میں پہلو یہ رکھا کہ دل رقیب میں محبت کا نہ ہونا اگر تمہارے نزدیک سبب ناراضگی ہے تو یہ قصور تو پہلے سے موجود تھا۔ آج کیا نئی بات ہوئی۔

بجلی[1] گری فغاں سے مری آسمان پر
جو حادثہ کبھی نہ ہوا تھا سو اب ہوا

جی[2] طعنِ وصلِ حور سے کیسا جلا دیا
روزِ جزا کا ذکر جو محفل میں شب ہوا

از[3] بسکہ تھی وصال میں غیروں سے ہمسری
عیش و سرور باعثِ رنج و تعب ہوا

تنہا[4] ہیں بہ رنگ شعلۂ جوّالہ بے قرار
جی خاک ہو گیا سے تجھے آرام جب ہوا

بر[5] میں عدو کی سوئے بغل سے مری اٹھے
وہ کیا کہ سب کو جذبۂ دل سے عجب ہوا

اب[6] اذنِ انتقام جفائے فلک تو دوں
سو بار جوشِ نالہ اجازت طلب ہوا

ربطِ بتانِ دشمنِ دیں اتہام ہے
ایسا گناہ حضرتِ مومن سے کب ہوا

۳۶

آ[7] اے آرزوئے قتل ذرا دل کو تھامنا
مشکل پڑا مرا مرے قاتل کو تھامنا

تاثیر[8] بیقراریِ ناکام آفریں
ہے کام ان سے شوخ شمائل کو تھامنا

دیکھے[9] ہے چاندنی وہ زمیں پر نہ گر پڑے
اے چرخ اپنے تو مہِ کامل کو تھامنا

[1] یعنی بجلی آسمان سے گرا کرتی ہے مگر میری فغاں آسماں رس سے آسمان پر بجلی گری۔ [2] غالباً مومن نے محفلِ معشوق میں قیامت کا تذکرہ کیا ہوگا۔ اس پر معشوق نے جلانے کے لیے ان کو وصلِ حور کا طعنہ دیا۔ [3] شاعر کی رشک پسند طبیعت کو عیش و وصال بھی اس لحاظ سے باعثِ رنج ہے کہ اس میں غیروں سے برابری ہوتی ہے۔ [4] شعلۂ جوّالہ سے شعلۂ رقصاں یا شعلۂ گروندہ۔ شعلہ کی رقص کا راز اس کی بیقراری میں مضمر ہے۔ ادھر اسکو سکون ہوا ادھر فنا ہو گیا۔ [5] وہ میری بغل سے اٹھ کر رقیب کے پہلو میں جا کر سو رہے جذبۂ دل کی اس الٹی تاثیر پر سب کو تعجب ہوا کیونکہ جذبۂ دل کا کام تو کشش ہے نہ کہ نفرت۔ اس شعر کی طنز قیامت ہے۔ غالب لکھتے ہیں۔ خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے + کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے۔ دوسرے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ میرے اس جذبۂ دل پر سب کو حیرت ہو گئی کہ وہ سوئے تو رقیب کی آغوش میں اور اٹھے (جاگے) میری بغل سے۔ دوسری صورت میں جذبۂ دل کے متعارف معنی لیے جائیں گے۔ [6] جوشِ نالہ نے مجھ سے سو بار لب سے نکلنے کی اجازت مانگی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب نالہ کو ازکم جفائے فلک کا بدلہ لینے کا اذن تو دیدوں۔ [7] شاعر کہتا ہے کہ آرزوئے قتل میں میرا دل بیتاب ہے، اسی وجہ سے قاتل کو میرا سنبھالنا اتنا مشکل ہو گیا ہے۔ اسلیے آرزوئے قتل کو دل کی روک تھام کی تاکید کرتا ہے۔ [8] عاشق کی بیقراری کی تاثیر تو یہ ہونی چاہیئے تھی کہ معشوق جو خود شوخ شمائل ہے اور زیادہ بیقرار ہو جاتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے اس کو بیقراریِ ناکام کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آفریں تو نے اتنا تو کیا ان سے جیسے شوخ شمائل کو سکون آشنا کیا۔ ایسے شوخ کو تھامنا تجھی کا حصہ تھا۔ اس طرح بیقراری کا استعارۃً مضمون پیدا کیا ہے۔ [9] کہیں مہِ کامل جوشِ رشک یا محویتِ جلوہ سے زمین پر نہ گر پڑے۔ ۱۴۱

مضطر ہوں[۴] کس کا طرزِ سخن سے سمجھ گیا
اب ذکر کیا ہے سامعِ عاقل کو تھامنا

ہو صرصرِ[۵] فغاں سے نہ کیونکر وہ مضطرب
مشکل ہوا ہے پردۂ محمل کو تھامنا

سیکھے ہیں[۶] مجھ سے نالۂ نہ آسماں شکن
صیاد اب قفس میں عنادل کو تھامنا

یہ زلفِ[۷] خم بخم نہ ہو کیا تاب غیر ہے
تیرے جنوں زدے کی سلاسل کو تھامنا

آئے[۸] ہمدم آہ تلخیِ ہجراں سے دم نہیں
گرتا ہے دیکھ جامِ ہلاہل کو تھامنا

سیماب[۹] وار مر گئے ضبطِ قلق سے ہم
کیا قہر ہے طبیعتِ مائل کو تھامنا

آغوشِ گور ہو گئی آخر لہو لہان
آساں نہیں ہے آپ کے بسمل کو تھامنا

سینہ پہ ہاتھ دھرتے ہی کچھ دم پہ بن گئی
لو جان کا عذاب ہوا دل کو تھامنا

باقی ہے شوق چاکِ گریباں ابھی مجھے
بس اے رفوگر اپنی انامل[۱۰] کو تھامنا

مت[۱۱] مانگیو امان بتوں سے کہ ہے حرام
مومن زبانِ بیہدہ سائل کو تھامنا

۴ سامع عاقل میرے طرزِ سخن سے سمجھ گیا کہ میں کس کے عشق میں مضطر ہوں اور اس خیال نے اسکو ایسا خود رفتہ کر دیا کہ اب اس کو سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ ۵ فغاں کو صرصر (آندھی) سے مشابہت دی ہے۔
۶ نہ آسمان شکن = نو آسمانوں کو توڑنے والا۔ یہ ترکیب لطیف اردو میں مومن کی جدت ہے۔
۷ رقیب مجھ سے جنون زدہ کی زنجیر کو تیری زلفِ پُر خم نہ سمجھ لے۔ زلفِ تاب تو اس کی دسترس ہے مگر دیوانہ کی زنجیر کا رولنا کھیل نہیں۔ ۸ تلخی ہجراں سے تنگ آکر عاشق خودکشی پر مائل ہے لیکن ضعف کی شدت سے جام زہر گرا پڑتا ہے۔ ۹ سیماب کی بیقراری کا دور ہونا اس کے کشتہ ہونے کے مترادف ہے۔ اسی طرح ضبطِ قلق میری ہلاکت کا باعث ہوا۔ ۱۰ انامل = انگلیوں کی پوریں۔ ۱۱ بیہدہ سائل = بیہودہ سوال کرنے والی۔ یعنی بتوں کے ستم اٹھاتے جا اور ان سے پناہ نہ مانگ۔ کیونکہ خدا کے سوا کسی دوسرے (خصوصاً بتوں) سے سوال کرنا حرام ہے۔

۳۷ لے اُڑی لاشہ ہوا لاغر بس تن ہوگیا — ذرّۂ ریگِ بیاباں اپنا مدفن ہوگیا

بن ترے اے شعلہ رو آتشکدہ تن ہوگیا[1] — شمع قد پر میرے پروانہ برہمن ہوگیا

تھی کمیں میں غارتِ بوسِ دہن ہنگامِ خواب[2] — شب کی بیداری سحر کا خوابِ رہزن ہوگیا

ایک ہی جنبش میں تھی صد راحتِ خوابِ عدم[3] — طفلہائے اشک کو گہوارہ دامن ہوگیا

سیر سے جلنے پر جو رویا غیر تیری بزم میں[4] — سوزِ دل کو آبِ اشک آتش پہ روغن ہوگیا

پاؤں زنداں سے اُٹھے کیا سر اُٹھا سکتے نہیں[5] — حلقۂ زنجیر آخر طوقِ گردن ہوگیا

جھانکتے ہیں کیا ملائک اس پری رخسار کو[6] — پردۂ تو بر توِ افلاک چلمن ہوگیا

شہر میں ہے شہرہ کس قدِ قیامت زا کا کیوں — جلوہ گاہِ حشر ہر ہر کوئے و برزن[7] ہوگیا

ہم یقیناً جوشِ وحشت سے فلک پر پہونچتے[8] — خارِ دامنگیر پر عیسیٰ کی سوزن ہوگیا

آخر اشکوں کے بھر آنے نے ڈبویا ہے مجھے[9] — چشم کا سوراخ تو کشتی کا روزن ہوگیا

[1] تیرے ہجر میں میرا بدن آتشکدہ ہوگیا اور میرا قد شمع کی طرح جلنے لگا۔ جس کو دیکھکر برہمن پروانہ وار نثار ہونے لگا۔ ۳۷
برہمن اگنی دیوتا (آگ) کو قابلِ پرستش مانتے ہیں اسلیے شمع پر برہمن کا پروانہ وار فدا ہونا بیان کیا اس غزل کا رنگ لکھنوی ہے اور ابتدائی زمانہ کی تصنیف ہے۔ [2] معشوق وصل کی رات بھر جاگتا رہا آخر صبح ہوتے نیند آہی گئی۔ اُسکے سو جانے پر عاشق کو بوسۂ دہن کے مزے لوٹنے کا موقع ملا۔ گویا بوسۂ دہن لینے کی خواہش رات بھر گھات میں رہی اور وقتِ سحر محبوب کو محوِ خواب پاکر قزاقوں کی طرح لوٹنے کے لیے کمین سے باہر نکل آئی۔ [3] گہوارہ کے ہلانے سے بچوں کو نیند آجاتی ہے۔ طفلِ اشک جو آنکھ سے دامن پر گرے گرتے ہی خوابِ عدم میں پہنچ گئے گویا دامن کے جھٹکے نے گہوارہ جنبانی کا کام دیا۔ اشک کو چھلکنے کے لحاظ سے طفل کہتے ہیں۔ [4] میرے سوزِ دل پر رقیب کو رحم آگیا اور وہ رونے لگا۔ اُس کے رونے پر رشک کی وجہ سے سوزِ دل اور بھڑک اُٹھا۔ یوں سمجھو کہ میرے سوزِ دل پر اُسکے آبِ اشک نے وہی تاثیر کی جو جلتی آگ پر تیل کرتا ہے۔ [5] قیدِ زنداں میں پاؤں تو کیا ضعف کی وجہ سے سر اُٹھانا بھی محال ہے اس لحاظ سے میرے پاؤں کی زنجیر کا حلقہ میرے حق میں طوق کا حکم رکھتا ہے کہ سر اُٹھانا دشوار کر دیا۔

[6] افلاک کے تہ بہ تہ پردہ کو شاعر نے چلمن قرار دیا ہے جس سے فرشتے جھانکتے ہیں۔ [7] برزن = گلی۔
[8] حضرت عیسیٰ جب آسمان پر اُٹھائے گئے تو اتفاقاً آپ کے پیرہن میں ایک سوئی لگی چلی گئی۔ سامانِ دنیا کے اس تعلق کی وجہ سے آپ چوتھے آسمان سے آگے نہ بڑھ سکے۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ اسی طرح ہمارے دامن میں کانٹا اُلجھ گیا ورنہ ہم جوشِ جنوں میں آسمان پر پہونچ جاتے۔ گویا خارِ دامنگیر ہمارے حق میں سوزنِ عیسیٰ بن گیا۔
[9] اپنی ہستی کو کشتی اور چشم کو اُس کا روزن ٹھہرایا ہے۔

خاک اڑائی میں نے کیا طرزِ جنونِ قیس کی
داغ سینے سے دل و جان و جگر سب پھک گئے
بیکسی سے نزع میں اپنے کو رو دیا آپ میں

شہ جہاں آباد سارا نجد کا بن ہوگیا
تھا چراغِ خانہ ہم کو برق خرمن ہوگیا
دم جو کچھ باقی رہا تھا صرف شیون ہوگیا

اپنے ڈھب کی کیا پڑھی اک اور مومن نے غزل
دو ہی دن میں یہ تو کیسا ماہرِ فن ہوگیا

۳۸

میں[1] ہلاکِ اشتیاقِ طرزِ کشتن ہوگیا
دھو دیا اشکِ ندامت نے گناہوں کو مگر
ہوگیا سنکر نویدِ وصل شادی مرگ میں
کونسا گذرا یہاں سے شہسوارِ نازنیں
زخم نو[4] بھی مرہمِ زخمِ کہن ہے چارہ گر
نیم[5] جلوہ کو بھی وہ کہتے ہیں اب بے پردگی
بسکہ میں سارے برس روتا رہا غم میں ترے
اُف ترے سوزِ عشق بریاں دل کی تسکیں کے لیے

دوستی کیا کی کہ اپنا آپ دشمن ہوگیا
تر[2] ہوا دامن تو بارے پاکدامن ہوگیا
لب تلک یہ زمزمہ آیا کہ شیون ہوگیا
سبزۂ[3] تربت مرا پامالِ توسن ہوگیا
بند تیرِ یار سے سینہ کا روزن ہوگیا
جسم کاہیدہ یہ کس کا صرفِ چلمن ہوگیا
جیٹھ اور بیساکھ کا بھی چاند ساون ہوگیا
خرمنِ گل پر جو لوٹا وہ بھی گلخن[6] ہوگیا

۳۸ ۱ محبوب کے اندازِ قتل کے اشتیاق نے مجھے مار رکھا ہے۔ ۲ دامن کا تر ہونا گنہگار ہونے سے عبارت ہے۔ ۳ سبزہ کے دوسرے معنی ایک قسم کے گھوڑے کے ہیں اس لیے اس میں ایہام پیدا ہوگیا۔ توسن = گھوڑا۔ ۴ تیرِ یار سے عاشق کے سینہ میں روزن ہوگیا تھا۔ اب دوسرا تیر جو اُسی جگہ آکر لگا تو تیر کی وجہ سے زخم کا روزن بند ہوگیا۔ اس طریقہ سے نئے زخم نے پرانے زخم کو بھر دیا اور اُس کے لیے مرہم کا کام دیا۔ ایذا پسندی کی انتہا ہے۔ ۵ کسی عاشق کا تن لاغر تنکا ہوکر چلمن میں جا کر مل گیا۔ جبھی تو محبوب اِسی چلمن بیٹھ کر نیم جلوہ دکھانے کو بھی بے پردگی تصور کرتا ہے۔
۶ گلخن = بھاڑ۔

اور کی چاہت کا تو نے جب کیا مجھ پر خیال
تب مجھے بھی تجھ سے وہم ربط دشمن ہو گیا

ق

صاف تھا تو جب تلک مجھ سے تو میں بھی صاف تھا
بدگمانی سے تری اب میں بھی بدظن ہو گیا

مومنِ دیندار نے کی بت پرستی اختیار
ایک شیخِ وقت تھا سو بھی برہمن ہو گیا

۳۹

قابو میں نہیں ہے دلِ کم حوصلہ اپنا
اس جور پہ جب کرتے ہیں تجھ سے گلہ اپنا

لبیک حرم ہم ہیں نہ ناقوسِ کلیسا
پھر شیخ و برہمن میں ہے کیوں غلغلہ اپنا

تھا[۱] روزِ نخستیں غمِ شبہائے دراز آہ
طفلی سے ہے اختر شمری مشغلہ اپنا

ہل جاتے[۲] ہی ہی اغیار نکل آتے ہیں باہر
زنجیرِ درِ یار ہے یا سلسلہ اپنا

تھے[۳] دشت میں ہمراہ مرے آبلے چند
سو آپ ہی پامال کیا قافلہ اپنا

اس حال کو پہونچے ترے غصے سے کہ اب ہم
راضی ہیں گر اعدا بھی کریں فیصلہ[۴] اپنا

زندہ[۵] نہ ہوا ہائے دلِ مردہ اگرچہ
تھا شورِ قیامت سے فزوں ولولہ اپنا

صورت وہی عظمت وہی گردش وہی کیسے
حیراں ہیں کہ یہ چرخ ہے یا آبلہ اپنا

انصاف کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ زر ہم
تحسینِ سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

۳۹ ۱ روزِ نخستیں سے زمانۂ طفلی اور غم شبہائے دراز سے خوف شبہائے فراق مراد ہے۔ قاعدہ ہے کہ اطفال مشغلۂ بیکاری کے طور پر اختر شماری کیا کرتے ہیں اور ہجران نصیب غم غلط کرنے کی غرض سے۔ ۲ سلسلہ = زنجیر تعلق - ذریعہ - جوں ہی میں نے زنجیرِ درِ یار ہلا"ا ہوں اغیار جو گھر میں مصروف اختلاط ہوتے ہیں باہر نکل کر چلد بیتے ہیں۔ گویا زنجیرِ درِ یار میرے لیے ذریعۂ کامیابی ہے۔ ادھر زنجیر ہلائی ادھر میرے مراسم کی سلسلہ جنبانی شروع ہوئی۔ ۳ میں نے اس قدر دشت نوردی کی کہ آبلے پھوٹ گئے۔ آبلوں کو قافلہ قرار دیا ہے۔
۴ ہمارا فیصلہ کریں۔ ۵ ولولہ سے یہاں جوشِ نالہ مراد ہے۔ شورِ قیامت سے مردے زندہ ہو جائیں گے مگر میرے نالہ سے دلِ مردہ زندہ نہ ہوا پر نہ ہوا۔

۴۰ رازِ نہاں[1] زبانِ اغیار تک نہ پہونچا — کیا ایک بھی ہمارا خطِ یار تک نہ پہونچا

اللہ ری ناتوانی جب شدتِ قلق میں — بالیں[2] سے سر اُٹھایا دیوار تک نہ پہونچا

روتے تو رحم آتا سو اُس کے روبرو تو — اِک قطرہ خوں بھی چشمِ خونبار تک نہ پہونچا

عاشق[3] سے مت بیاں کر قتلِ عدو کا مژدہ — پیغامِ مرگ ہے یہ بیمار تک نہ پہونچا

بے بخت رنگ خوبی کس کام کا کہیں تو — تھا گُل و لے کسی کی دستار تک نہ پہونچا

مفت[4] اوّلِ سخن میں عاشق نے جان دیدی — قاصد ترا بیانِ اقرار تک نہ پہونچا

تھی[5] خارِ راہ تیری مژگاں کی یاد شب بھر — تا صبح خوابِ چشمِ بیدار تک نہ پہونچا

بختِ رسا عدو کا جو چاہے[6] سو کہے اب — اِکبار یار مجھ تک مَیں یار تک نہ پہونچا

غیروں سے اُس نے ہرگز چھوڑی نہ ہاتھا پائی — جب تک اجل کا صدمہ دو چار تک نہ پہونچا

مومن اُسی نے مجھ سے دی برتری کسی کو — جو پست فہم میرے اشعار تک نہ پہونچا

۴۰ — ۱ عاشق کا خط جب محبوب کے پاس پہونچے گا تو لازماً اغیار کو محبوب کی زبانی مضمون خط کی خبر ہو جانے گی گویا اغیار کا واقف ہو جانا مکتوب کی رسید ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میرا رازِ نہاں رقیبوں کی زبان پر نہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ دوست تک کوئی خط نہیں پہونچا۔ ۲ دیوار سے پھوڑنے کے لیے بالیں سے سر اُٹھایا تو ضعف سے دیوار تک نہ پہونچا۔ ۳ قتل عدو کا مژدہ عاشق کے لیے باعث ہلاکت ثابت ہوگا کیونکہ وہ سُنتے ہی خوشی سے مر جانے کا اور یہ مژدہ اُس کے لیے اسی طرح مہلک ہوگا جیسے بیمار کے لیے پیغام مرگ۔ ۴ معشوق نے قاصد سے عاشق کی ملاقات کا وعدہ کیا۔ قاصد نے واپس آکر پیغام پہونچایا۔ مگر عاشق مرحوم جو قدرتاً مایوس واقع ہوا ہے ناکامی کے ڈر سے تمہید ہی سُنکر مر گیا۔ قاصد کو بیانِ اقرار کی نوبت نہ آنے پائی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عاشق نے قاصد کی بات سُنتے ہی خوشی میں جان دیدی ہو اور پوری بات (بیانِ اقرار) نہ سُن پایا ہو۔ اس وجہ سے مفت کا لفظ استعمال کیا۔ ۵ خواب چشم بیدار تک اس لیے نہ پہونچا کہ مژگانِ یار کی یاد خارِ راہ کی طرح حائل تھی۔ مژگاں کی مشابہت خار سے ظاہر ہے۔ ۶ یعنی عدو جس قدر چاہے ناز کرے۔

۴۱

وعدے[1] کی جو ساعت دمِ کشتن ہے ہمارا
جو دوست ہمارا ہے سو دشمن ہے ہمارا

یہ کاہ ربا[2] سے بھی ہیں کم اے کششِ دل
مذکور کچھ ایسا پسِ چلمن ہے ہمارا

افسوس[3] موے شمع شبِ وصل کی مانند
جو قہقہہ شادی ہے سو شیون ہے ہمارا

مہتاب[4] کا کیا رنگ کیا دودِ فغاں نے
احوال شبِ تار سے روشن ہے ہمارا

دیتا[5] نہیں اس ضعف پہ بھی جوشِ جنوں چین
ہر ریگ رواں دشت میں توسن ہے ہمارا

تفریح[6] نہ کیونکر ہو ہوا آ نہیں سکتی
گویا درِ دلدار نشیمن ہے ہمارا

آغشتہ[7] بخوں دست کو لو پونچھتے ہیں وہ
اُلٹے کفِ جلاد میں دامن ہے ہمارا

گر پاس[8] ہے لوگوں کا تو آجا کہ قلق سے
ہے لاش کہیں اور کہیں مدفن ہے ہمارا

۴۱ : [1] جو معشوق کے وعدۂ دیدار کی ساعت ہے - وہی ہمارا وقت قتل ہے یعنی ہم محویت جمال یا فرطِ مسرت سے وعدہ وفا ہونے پر مر جائیں گے - اس اعتبار سے اُس کی دوستی بھی دشمنی کا پہلو رکھتی ہے - [2] کاہ ربا گھاس کو کھینچ لیتی ہے - شاعر یہاں اپنی کشش دل کو غیرت دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ معشوق پسِ چلمن بیٹھا ہوا ہمارے جذب دل کی تحقیر کر رہا ہے کہ کاہ ربا سے تو کاہ کھنچ آتی ہے مگر ان عشاق کی کشش سے چلمن کی تیلیاں بھی نہیں ہٹ سکتیں [3] شبِ وصل میں شمع بجھا دیجاتی ہے اور ظاہر ہے کہ شمع کو شبِ وصل کے عیش سے کوئی تمتع نہیں ہوتا، مومن کا مطلب یہ ہے کہ اسی طرح ہم بدبخت بھی مسرت کے میسر ہوتے ہی ہلاک ہو گئے اور قہقہہ شادی ہمارے حق میں نوحہ ہو گیا -

[4] ہجر میں شبِ مہتاب دودِ فغاں کے اثر سے تاریک ہو گئی - اب یہ شبِ تاریک ہمارے حال زار (تاثیر فغاں) پر روشنی ڈال رہی ہے - تار اور روشن میں ایہام تضاد ہے - [5] ضعف کی یہ شدت ہے کہ ہر ذرۂ ریگ توسن کی طرح ہم کو اُڑائے پھرتا ہے اور وحشت کی یہ حالت ہے کہ اُس پر بھی ایک جگہ قرار نہیں -

[6] ہمارا نشیمن اس لحاظ سے درِ دلدار سے مشابہ ہے کہ اُس میں ہوا تک کا گزر نہیں اور جب نشیمن کو درِ دلدار سے اس قدر مناسبت ہے تو پھر وہاں تفریح کیوں نہ ہو - [7] چاہیئے تو یہ تھا کہ دھوئے خون کے بنا پر دامنِ جلاد میرے ہاتھ میں ہوتا - لیکن جلاد مجھے قتل کر کے میرا خون میرے ہی دامن سے پونچھ رہا ہے - نئی بات ہے کہ جلاد کے ہاتھ میں مقتول کا دامن ہے - [8] جوشِ بےتابی سے میری لاش مدفن سے دور جا پڑی ہے - اسلیے اب اگر تم لاش پر آئے تو لوگ بدنام نہیں کر سکتے کیونکہ میں قبر میں موجود نہیں - قبر پر تم آتے تو لوگ چرچا کرتے - یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ لاش اور مدفن کے تفرقہ سے لوگوں میں چرچا ہے جس سے تمھاری بدنامی کا ڈر ہے - اگر بدنامی سے بچنا منظور ہے تو آؤ تاکہ جوشِ بےتابی کی یہ کیفیت اور جسد و لحد کا تفرقہ موقوف ہو -

جذبِ[9] دل اُسے کھینچ کے لائے تو کہاں لائے		جو غیر کا گھر ہے وہی مسکن ہے ہمارا

مقطع

بتخانے[10] سے کعبے کو چلے رشک کے مارے
مومن بلدِ راہ برہمن ہے ہمارا

ہمسری اس زلف[11] سے اب یہ بھی ایسا ہوگیا	۴۲	لو مرے بختِ سیہ کو اور سودا ہوگیا
گو[12] جنازے پر عدو کے وہ خود آرا ہو گیا		پر ہمارا بھی تو مرجانا تماشا ہو گیا
کس طرح معلوم ہو حالِ دلِ گم گشتہ ہائے		جو کبوتر لے گیا واں نامہ عنقا ہوگیا
مرگ[13] سے تھی زندگی کی آس سو جاتی رہی		کیوں بُری حالت نہ ہووے غیر اچھا ہوگیا
ظلم کا ثمرہ یہی تھا دیکھکر گلہائے داغ		بید[14] مجنوں شرم سے وہ سرو رعنا ہوگیا
چشمۂ[15] حیواں بنا اسکے لبوں کی شرم سے		پانی پانی بسکہ اعجازِ مسیحا ہوگیا
روزِ محشر کیا ہوا پھر کیوں شبِ دیجور ہے		کیا ہمارا[16] نامۂ اعمال کچھ وا ہوگیا
بیوفائی ہے سرشت اسکی سو وہ ہم میں کہاں		ہم مزاجی[17] کے سبب سے غیر اپنا ہوگیا

۹؎ محبوب کے اشتیاقِ دید میں ہم نے رقیب کے گھر کو اپنا مسکن بنا لیا ہے - اس لیے کہ وہ وہیں ملتا ہے - اب ہمارا جذبۂ دل اُسے کھینچکر لائے تو کہاں لائے - ۱۰؎ بتوں کی پرستاری میں ہم اور برہمن دونوں شریک تھے مگر ہماری غیرت نے اس رقابت کو گوارا نہ کیا اس لیے ہم نے بُتخانہ چھوڑ کر کعبہ کی راہ لی - اس لحاظ سے برہمن نے ہمارے حق میں خضر کا کام دیا جس سے راہ حق ملی - بعض نسخوں میں بلدِ راہ ہے بلد کے معنی ہیں رہبر -

۱۱؎ معشوق رقیب کے جنازے پر آیا جس کے رشک سے عاشق نے جان دیدی - اب عاشق شکوہ سنج ہے کہ ہمارا مرجانا بھی تو تماشے کی حیثیت رکھتا تھا - معشوق کو ہمارے جنازے پر بھی آنا تھا گو بتقریب تماشا ہی سہی - ۱۲؎ رقیب کی مرگ سے مجھے اپنی زندگی کی آس تھی - ۱۳؎ وہ سرو رعنا شرم سے بید مجنوں کی طرح خم ہوگیا - ۱۴؎ محبوب کے لبِ معجز نما کی شرم سے اعجازِ مسیحا پانی پانی ہوگیا اور اُسنے چشمۂ حیوان کی شکل اختیار کر لی - پانی پانی ہونا خجل ہونا شاعر نے یہاں پانی کے لفظ سے فائدہ لیا ہے - ۱۵؎ ہمارے نامۂ اعمال کی سیاہی کی وجہ سے روزِ محشر شبِ دیجور بنگیا - ۱۶؎ بیوفائی کے لحاظ سے معشوق اور رقیب دونوں کا مزاج یکساں واقع ہوا ہے - اسلیے دونوں میں اتحاد ہے - کند ہم جنس با ہم جنس پرواز -

جان و دل پر لشکر آرائی تھی جوشِ یاس کی
صفت اس بلوے میں شب خونِ تمنّا ہو گیا

ہٹ گیا ہوگا دوپٹہ مُنہ سے سوتے میں کہیں
شب یہاں رہنے کا تیرے سب میں چرچا[۷] ہو گیا

لگ گئی چُپ مجھکو تو بھی بات وہ کرتا نہیں
کیا کہوں قسمت کو کہنا دشمنوں کا ہو گیا

شربتِ[۸] مرگ آبِ حسرت شورِ بختی زہرِ غم
تلخ کامی سے مجھے کیا کیا گوارا ہو گیا

رو دیا[۹] اُس نے جو میری لاغری کو دیکھکر
قطرۂ اشکِ ندامت مجھکو دریا ہو گیا

ہے مشبّک[۱۰] بسکہ روتے روتے چشم اے مہرو
شب جو اشک آیا سو اِک عقدِ ثریا ہو گیا

حق تو یہ ہے کیا غزل اِک اور مومن نے پڑھی
آج باطل سارے استادوں کا دعویٰ ہو گیا

۴۳

میں تو دیوانہ تھا اُس کی عقل کو کیا ہو گیا
قیس کہتا ہے[۱] مجھے ناصح کو سودا ہو گیا

جوشِ[۲] عشق و حُسن نے کیا رنگ بدلا دیکھنا
اشکِ خونی سے مرے مُنہ زرد اُسکا ہو گیا

سینہ زن یا جامہ در ہوتا ہے بن ماتم کوئی
آپ اپنے ہاتھ سے میں ہائے رسوا ہو گیا

صور تھی منقارِ مرغِ صبح پہلو سے مرے
وہ قیامت قد جو اُٹھا حشر برپا ہو گیا

زخم کھایا زہر کھایا تو بھی کچھ ہوتا نہیں
دیر گذری مرگ کو کیا جانئے کیا ہو گیا

۷؎ چرچے کی وجہ یہ ہوگی کہ مُنہ کھُل جانے سے شب کی تاریکی روشنی سے مبدّل ہو گئی۔ اسیلیے لوگ واقف ہو گئے
۸؎ مصائب کے سبب سے مُنہ کا مزہ اس قدر بگڑ گیا کہ شربت مرگ وغیرہ کی تلخی بھی ناگوار نہیں معلوم ہوتی
۹؎ معشوق میری لاغری کو دیکھکر جو اُسکے جورِ پیہم کا نتیجہ تھی، رو یا مگر اُسکا قطرۂ اشکِ ندامت میرے حق میں ڈبونے کے لیے دریا ہو گیا یعنی مجھ سے اسکی شرمندگی نہ دیکھی گئی۔ ۱۰؎ مشبّک = سوراخ دار۔ عقد ثریا نظم پروین جو بہت سے ستاروں پر مشتمل ہے۔ رونے سے آنکھ میں سوراخ ہو گئے اور ہر سوراخ سے آنسو چھلکنے لگے جس سے عقد ثریا کی حالت پیدا ہو گئی۔

۴۴ ۱؎ ناصح کو سودا ہو گیا ہے کہ مجھے قیس کہتا ہے حالانکہ قیس کا جنون میرے جنون سے کہیں کم تھا۔ ۲؎ حُسن کے لیے سُرخی اور عشق کے لیے زردی لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن عشق و حُسن کا رنگ بدلنا دیکھو کہ میرے اشک سُرخ کو دیکھکر (ندامت یا خوفِ رسوائی سے) معشوق کا مُنہ زرد ہو گیا۔

یہ کس سے ہو کہ ان لطفوں پہ گستاخی نہ ہو — غیر ہم سا کب ہوا ہر چند ہم سا ہو گیا

یوں لبِ خنجر کے بوسے متصل لینے نہ تھے — زخم کاری کی ہنسی میں کام میرا ہو گیا

سرمۂ تسخیر سے ہم خود مسخر کیوں نہ ہوں — آنکھ کی پتلی جو تھی جادو کا پتلا ہو گیا

تو فلک میں کیا کرے یہ نالۂ آتش فشاں — ایک دشمن سر سے کھویا اور پیدا ہو گیا

کفر ہے بے گلرخِ ترسا تماشائے چمن
گلشن اپنے حق میں لے مومن کلیسا ہو گیا

۴۴

کیا رشکِ غیر تھا کہ تحمل نہ ہو سکا — میں جان کر حریفِ تغافل نہ ہو سکا

ہوتا ہے آہ صبح سے داغ اور شعلہ زن — کیسا چراغ تھا یہ کبھی گل نہ ہو سکا

اُس نے جو دل کو منہ نہ لگایا دو نیم ہے — یہ جامِ جم ہوا قدحِ مُل نہ ہو سکا

تمہارے کرم کے باوجود گستاخ نہ ہونا رقیب کے بس کی بات نہیں۔ ہر چند وہ ہماری طرح مورد الطاف ہو گیا لیکن ہمارا سا ظرف کہاں سے لاتے۔ زخموں نے لبِ خنجرِ قاتل کے بوسے لیے اور عاشق کی جان پہ بن گئی۔ اُن زخموں کی تو ہنسی ہوئی اس غریب کا کام ہو گیا۔ زخم کے لیے ہنسی کا لفظ بھی خالی از لطف نہیں۔ سرمۂ تسخیر = وہ سرمہ جس میں عمل یا سحر سے ایسی تاثیر ہو کہ جو اسے لگائے دوسرے اُسکے مطیع ہو جائیں، مطلب یہ ہے کہ ہم نے سرمہ تو اس لیے لگایا تھا کہ معشوق مسخر ہو۔ مگر اُلٹا اثر دیکھئے کہ ہم خود مسخر ہو گئے۔ گویا ہماری آنکھ کی پتلی نے جادو کے پتلے کا کام کیا اور ہمیں (معشوق کا) مطیع بنا دیا۔ ترسا = عیسائی چونکہ اُسکے بغیر تماشائے چمن کفر ہے۔ اسلیے چمن ہمارے حق میں کلیسا کا حکم رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کلیسا اہلِ کفر (عیسائیوں) کا معبد ہے۔

میں حریفِ تغافل نہ ہو سکا یعنی میں نے معشوق کے تغافل کو گوارا نہ کیا اور میرا یہ فعل بالارادہ تھا۔ اس کو میری کم حوصلگی پر محمول نہ کرنا چاہیئے۔ ورنہ یہ رشکِ غیر تو نہ تھا جس کا تحمل مجھ سے ممکن نہیں۔ اس میں عاشق نے معشوق کے تغافل پر اپنی بے تابی کی توجیہ کی ہے۔ ۴۴

چراغ ہوائے صبح سے گل ہو جاتے ہیں مگر یہ چراغ (داغِ دل) آہِ صبح سے اور شعلہ زن ہوتا ہے۔

اگر محبوب میرے دل کو منہ لگاتا تو یہ قدحِ شراب کا مرتبہ حاصل کرتا۔ مگر ایسے نصیب کہاں۔ اُسکے منہ لگانے کی وجہ سے یہ دو نیم ہو گیا اور جامِ جم ہو کر رہ گیا۔ جامِ جم سے مراد جمشید کا پیالہ ہے جو جامِ جہاں نما تھا اور جس میں کرۂ ارض کا نقشہ نظر آتا تھا یعنی میرا دل دو نیم جامِ جم تو بن گیا مگر محبوب کی بے التفاتی کے باعث قدحِ مل ہونے کی عزت حاصل نہ کر سکا۔ ظاہر ہے کہ قدحِ مُل کو وہ منہ لگاتا ہے۔

عاشق[۱] نہ ہو کہیں کہ انھیں قتل غیر میں
مشکل بنی کچھ ایسی تساہل نہ ہو سکا

کہتے[۲] ہیں گلشن اپنی گلی اُسکے دم سے تھی
دشمن جو ہم ترانۂ بلبل نہ ہو سکا

نفرت[۳] تھی اس قدر کہ نہ ٹھہرے وہ صبحدم
پاسِ درازیِ شبِ کاکل نہ ہو سکا

پروردۂ[۴] وفا سے ہو کب ترک عاشقی
کیا ناز تھے کہ مجھ سے تحمّل نہ ہو سکا

وہ عکس[۵] زلف چشم عدو میں پڑا نہ ہو
نظارہ مجھ سے جانبِ سنبل نہ ہو سکا

تنگی وہی[۶] رہی دلِ صدچاک کی ہوا
یہ غنچہ پاش پاش مگر گُل نہ ہو سکا

ہجرِ[۷] بتاں میں تجھکو ہے مومن تلاشِ زہر
غم پر حرام خوار توکّل نہ ہو سکا

۴۵

شوخ[۸] کہتا ہے بے حیا جانا
دیکھو دشمن نے تم کو کیا جانا

شعلۂ[۹] دل کو ناز تابش ہے
اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

---

[۱] معشوق کو قتل غیر میں کچھ ایسی مشکل بنی کہ دیر نہ لگا سکا اور فوراً ہی اُسکو ٹھکانے لگا دیا - اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ (غیر) کہیں اُس پر عاشق نہ ہو - اس لیے کہ معشوق کو اہل ہوس کے قتل سے کیا سروکار - اُسکے تختۂ مشقِ ستم تو صرف عشاق ہیں - [۲] رقیب کے بعد معشوق کو تاسف ہے اور وہ کہتا ہے کہ میری گلی اُسکے دم سے گلزار تھی - عاشق کو اس پر شکایت پیدا ہوئی کہ ایسے شخص کی نسبت جو نالہ کشی میں بلبل کی ہمسری بھی نہ کر سکا یہ کہنا (کہ میری گلی اسکے دم سے گلشن تھی) بالکل دور از حقیقت ہے - [۳] محبوب کو مجھ سے اس قدر نفرت تھی کہ صبح ہوتے ہی میرے پاس سے چلا گیا اور درازی شب کاکل کا بھی خیال نہ کیا - حالانکہ شب کاکل کی درازی اس قدر ہے کہ اُس کی صبح ہی نہیں - [۴] معشوق کے ناز ایسے تھے کہ میں برداشت نہ کر سکا - ورنہ اہل وفا سے عشق ترک نہیں ہوتا -

[۵] عاشق نے سنبل کی جانب نہ دیکھا گیا - اُس کی توجیہ یوں کرتا ہے کہ شاید رقیب نے زلف یار کا نظارہ کیا ہے جسکے اثر سے میں سنبل کی طرف (جو ہم شکل زلف ہے) دیکھنا گوارا نہ کر سکا - [۶] لفظ 'ہوا' کا تعلق مصرع ثانی سے ہے - مراد یہ ہے کہ غنچہ تنگ جب پاش پاش ہو جاتا ہے تو گل ہو جاتا ہے اور اُس کی تنگی دور ہو جاتی ہے - مگر دل صدچاک ہو کر بھی بدستور تنگ ہے - [۷] یعنی غم پر توکل کرنا چاہیے تھا کیونکہ زہر حرام ہے - اسی لیے حرام خوار کا لفظ استعمال کیا -

[۸] شوخ یعنی بے شوخ کہتا ہے دوسرے لفظوں میں اسکے معنی یہ ہوئے کہ وہ تمھیں بے حیا جانتا ہے - شوخ کے معنی بے حیا بھی ہیں -
[۹] یہ ہے شعلۂ دل کو اپنی چمک پر ناز ہے - ذرا آکر اپنا جلوہ دکھا دو کہ اسکا غرور مٹ جائے - اس شعر میں خاص تک شاعرانہ ہے -

شوق[1] نے دورباش اعدا کو / اُس کی محفل میں مرحبا جانا
گلے لگتا ہے دمبدم مجھکو / طوقِ گردن نے کیا خفا جانا
اُسکے اُٹھتے ہی ہم جہاں سے اُٹھے / کیا قیامت ہے دل کا آجانا
گھر[2] میں خودرفتگی سے دھوم مچی / کیونکہ ہو اُس تلک مرا جانا
پوچھنا[3] حالِ یار ہے منظور / مَیں نے ناصح کا مدعا جانا
مے نہ اُتری گلے سے جو اُس بن / مجھکو یاروں نے پارسا جانا

شکوہ[4] کرتا ہے بے نیازی کا
تو نے مومن بتوں کو کیسا جانا

۴۶

اس وسعتِ کلام سے جی تنگ آگیا / ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا گیا
ضد سے وہ پھر رقیب کے گھر میں چلا گیا / اے رشک میری جان گئی تیرا کیا گیا
یہ ضعف[1] ہے تو دم سے بھی کب تک چلا گیا / خودرفتگی کے صدمے سے مجھکو غش آگیا
کیا[2] پوچھتا ہے تلخیِ الفت میں پند گو / ایسی تو لذتیں ہیں کہ تو جان کھا گیا

[1] میرا شوق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ محفلِ یار میں جا پہونچا اور رقیبوں کی للکار کی پروا نہ کی۔ بلکہ اُنکی "دورباش" کو مرحبا جانا۔ [2] خودرفتگیِ عشق سے مجھے اُمید تھی کہ اُسکی بدولت محبوب تک رسائی ہو سکے گی۔ مگر میرے خودرفتہ ہوتے ہی تمام گھر میں چرچا ہوگیا۔ اب اُس تک کیونکر پہونچونگا۔ خودرفتگی کے لفظ سے خاص فائدہ لیا ہے۔
[3] ناصح نصیحت کے پردے میں چھیڑ چھیڑ کر مجھ سے حالِ یار پوچھنا چاہتا ہے۔ کہیں وہ بھی اُس پر عاشق ہوگیا ہو۔
[4] بت ذاتی اختیار نہیں رکھتے۔ جو کرتا ہے خدا کرتا ہے۔ اب تو جو بتوں کی بے نیازی کی شکایت کرتا ہے تو نے اُن کو کیا جانا۔ اگر وہ باوجود قدرت بے نیازی کرتے تو شکایت کا موقع تھا۔
[1] کہیں جانا تو درکنار۔ میں ذرا آپ سے گیا تھا (از خود رفتہ ہوا تھا) کہ فوراً غش آگیا۔ جب ضعف کی یہ شدت ہے تو دم کیونکر چل سکے گا۔ یہاں بھی لفظ خودرفتگی پر تمام شعر کی بنیاد رکھی ہے۔ [2] ناصح تو مجھے تلخیِ الفت یاد دلا کر عشق سے باز رکھنا چاہتا ہے۔ مگر اس تلخی میں ایسی لذتیں ہیں کہ تو ہر وقت اُسی کا ذکر کرتا رہتا ہے "جان کھا جانا" (بیہودہ گوئی سے پریشان کرنا) سے شاعر نے خاص فائدہ لیا ہے۔ تلخی و لذت۔ جان کھا جانا میں رعایت ہے۔

[۵۱] کچھ آنکھ بند ہوتے ہی آنکھیں سی کھل گئیں
جی اک بلائے جان تھا اچھا ہوا گیا

[۵۲] میرا گلا ہنسی سے یونہی گھونٹتے تھے وہ
کیا سوچ کر رقیب خوش آیا خفا گیا

آنکھیں جو ڈھونڈھتی تھیں نگہ ہائے التفات
گم ہونا دل کا وہ مری نظروں سے پا گیا

[۵۴] جلتی ہے جان آتشِ خس پوش دیکھکر
چلمن سے شعلہ رو کوئی جلوہ دکھا گیا

[۵۶] بوئے سمن سے شاد تھے اغیار بے تمیز
اس گل کو اعتبار نسیم و صبا گیا

آہِ سحر ہماری فلک سے پھری نہ ہو
کیسی ہوا چلی ہے کہ جی سنسنا گیا

آتی نہیں بلائے شبِ غم نگاہ میں
کس مہروش کا جلوہ نظر میں سما گیا

[۵۷] اے جذبۂ دل نہ تھم کہ نہ ٹھہرا وہ شعلہ رو
آیا تو گرم گرم ولیکن چلا گیا

[۵۸] مجھ خانماں خراب کا لکھا کہ جا بجا
وہ نامہ غیر کا مرے گھر میں گرا گیا

[۵۹] مہندی ملے گا پاؤں سے دشمن تو آن کر
کیوں میرے تفتہ سینے کو ٹھوکر لگا گیا

[۶۰] بوسہ صنم کی آنکھ کا لیتے ہی جان دی
مومن کو یاد کیا حجرالاسود آگیا

---

۵۱ موت آتے ہی آنکھوں سے پردۂ غفلت اٹھ گیا۔ ۵۲ رقیب اس خیال سے خوش تھا کہ معشوق میرا (مومن کا) گلا واقعی گھونٹ رہا ہے۔ مگر جب یہ معلوم ہوا کہ وہ ہنسی میں گلا گھونٹ رہا ہے تو خفا ہو کر چلا گیا۔ گلا گھونٹنا اور خفا میں رعایت ہے۔ کیونکہ خفا (خفہ) کے لغوی معنی گلو افشردہ ہیں۔

۵۴ آتش خس پوش سے مراد جلوۂ پسِ چلمن ہے۔ معشوق شعلہ رو کو آتش سے اور چلون کو خس سے تشبیہ دی ہے۔ ۵۶ نسیم وصبا نے اس گل (معشوق) کی بو اغیار تک پہونچائی مگر وہ اپنی بد ذوقی اور پست فطرتی کی بنا پر تمیز نہ کرسکے اور اسکو بوئے سمن سمجھکر شاد ہو گئے۔ اس پر معشوق کو نسیم و صبا کی جانب سے بھی بے اعتباری پیدا ہوگئی کہ انھوں نے میری بو نا اہلوں تک کیوں پہونچائی۔ شعر مرا بمدرسہ کہ برد۔

۵۷ وہ شعلہ رو دوراوری میں میرے پاس آیا مگر فوراً ہی واپس چلا گیا۔ اے جذب دل تیرا اثر تو ہوا۔ ابھی اپنی سعی عمل جاری رکھ۔ ۵۸ لکھا = نوشتۂ قسمت۔

۵۹ ٹھوکر لگانے کے لیے مَیں ہوں اور مہندی ملنے کو رقیب ہو۔ یہ کہاں کی منصفی ہے۔

۶۰ چشم سیاہ کو حجرالاسود سے مناسبت دی ہے۔

۴۷

وہ[1] ہنسے سن کے نالۂ بلبل کا ۔۔۔ مجھے رونا ہے خندۂ گل کا
دھیان[2] ہے غیر کے تحمل کا ۔۔۔ ہوش دیکھا ترے تغافل کا
ہم[3] کسی شانہ بیں سے پوچھیں گے ۔۔۔ سببِ آشفتگیِ کاکل کا
لاش کس کی ہے یہ عدو سے پوچھ ۔۔۔ مَیں ہوں کشتہ ترے تجاہل[4] کا
حال[5] ساقی سے کہکے روتا ہوں ۔۔۔ کہ محرک ہے خندۂ قلقل کا
نکہت اس زلف کی صبا میں نہ ہو ۔۔۔ اُڑ گیا رنگ[6] بوئے سنبل کا
جلوہ دکھلائے تا وہ پردہ نشیں ۔۔۔ مَیں[7] نے دعویٰ کیا تحمل کا
نالۂ[8] شب نے یہ ہوا باندھی ۔۔۔ ہو گیا گل چراغ بلبل کا

حیلہ[9] بے خودی سے ہے مومن
توڑنا ہم کو شیشۂ مُل کا

۱ معشوق اس قدر بے درد ہے کہ نالۂ بلبل سُنکر ہنستا ہے اور میں اس درجہ رقیق القلب ہوں کو خندۂ گُل پر مجھے رونا آتا ہے۔ اگر وہؔ سے گُل مراد لیا جائے تو یہ معنی ہونگے کہ گُل نالہ بلبل سُنکر ہنستا ہے اور مجھے اُسکی ہنسی پر رونا آتا ہے۔ رونے کی وجہ خندہ گُل کے انجام کا خیال ہے۔ ۲ تو تغافل تو کرتا ہے مگر پھر بھی بہ اندازہ تحملِ غیر کرتا ہے۔ یعنی یہ دھیان رکھتا ہے کہ غیر کی برداشت سے زیادہ نہ ہو۔ گویا تیری تغافل شعاری بھی اس قدر ہوش رکھتی ہے۔ ہوش اور تغافل میں تضاد ہے۔ ۳ شانہ بیں = فال بتانے والا۔ ایران میں قاعدہ ہے کہ شانۂ گوسفند پر نقش لکھکر اُس سے فال لیتے ہیں۔ ۴ تجاہل = انجان بننا۔ ۵ میں حالت مستی میں ساقی سے اپنا حال کہکر روتا ہوں۔ کیونکہ خندۂ قلقل میرے اس فعل کا محرک ہے۔ شراب کی آواز (قلقل) کو خندہ سے تسبیت دیتے ہیں اور قلقل صیغہ امر بھی ہے یعنی کہہ کہہ۔ مُراد یہ ہے کہ عرض حال کے بعد گریۂ مستی خندۂ قلقل کے اثر سے ہے ۶ بوئے سنبل کا رنگ شرم سے اُڑ گیا۔ انتشار بو کو رنگ اُڑجانا قرار دیا ہے۔ ۷ میں نے اپنے ضبط کا (غلط) دعویٰ کیا تاکہ محبوب ضد سے جلوہ دکھائے اور میرے دعوے کو باطل کرے۔ ۸ میرے نالۂ شب نے بُلبُل کی فغاں کو بھی مات کر دیا۔ ہوا اور چراغ گل ہونے میں رعایت ہے۔ ۹ مے نوشی سے مومن کی غرض صرف یہ ہے کہ حیلۂ بیخودی سے شیشہ شراب کو توڑے ورنہ میخوار توڑنے میں مزاحم ہونگے۔

۴۸

اشک[1] واژونہ اثر باعثِ صد جوش ہوا
ہچکیوں سے میں یہ سمجھا کہ فراموش ہوا

جلوہ[2] افزائی رُخ کے لیے مے نوش ہوا
میں کبھی آپ میں آیا تو وہ بیہوش ہوا

کیا یہ پیغامبر غیر ہے اے مرغِ چمن
خندہ[3] زن بادِ بہاری سے وہ گل گوش ہوا

ہے یہ غم گور میں رنجِ[4] شبِ اول سے فزوں
کہ وہ مہر و مرے ماتم میں سیہ پوش ہوا

مجھ[5] پہ شمشیر نگہ خود بخود آپڑتی ہے
عاجز احوال زبوں سے وہ ستم کوش ہوا

آفریں[6] دل میں رہی خنجرِ دشمن کے سبب
اپنے قاتل سے خفا تھا کہ میں خاموش ہوا

درد[7] شانہ سے ترا محو نزاکت خوش ہے
کہ میں ہمدوش ہوں گو غیر بھی ہمدوش ہوا

وہ[8] ہے خالی تو یہ خالی یہ بھرے تو وہ بھرے
کاسۂ عمرِ عدو حلقۂ آغوش ہوا

تو نے[9] جو قہر خدا یاد دلایا مومن
شکوۂ جورِ بتاں دل سے فراموش ہوا

۴۸ [1] واژونہ اثر = اُلٹے اثر والا۔ جب کسی کو ہچکیاں آتی ہیں تو خیال کیا جاتا ہے کہ کسی دوست نے اسکو یاد کیا ہے مگر چونکہ میرے گریہ کی تاثیر اُلٹی ہے میں ہچکیوں سے سمجھتا ہوں کہ محبوب نے مجھے فراموش کر دیا اور اس لیے میرا جوش بیتابی اور بڑھ جاتا ہے۔ [2] میں جلوۂ یار سے بیہوش تھا۔ جب ذرا ہوش میں آیا تو اُسنے مجھے دوبارہ بیخود کرنے کی غرض سے شراب پی تاکہ اپنی مے جلوہ کو دوآتشہ کرے۔ غرض میں تو ہوش میں آگیا مگر وہ (نشۂ شراب سے) بیہوش ہوگیا۔ [3] گل گوش = معشوق جسکے کان گُل سے مشابہ ہیں۔ [4] مشہور ہے کہ قبر کی پہلی رات بھاری ہوتی ہے۔
[5] وہ ظالم میرے احوال زبوں سے عاجز آگیا ہے کہ گو وہ خود مجھ پر وار نہ کرے مگر اسکا کیا علاج کہ مجھ پر شمشیر نگہ خود بخود آپڑتی ہے۔ [6] میرے قاتل نے مجھ پر رقیب کے خنجر سے وار کیا۔ میں نے چاہا کہ اُسکی چابکدستی اور صفائی پر آفریں کہوں مگر خنجر رقیب کی وجہ سے میں خاموش ہوگیا اور آفریں دل کی دل میں رہ گئی۔ عاشق کو قتل کی شکایت نہیں بلکہ خنجر دشمن سے قتل ہونے کی شکایت ہے۔ [7] محو نزاکت سے عاشق مراد ہے۔ ہمدوش کے دو معنی ہیں۔ ایک ہمسر اور دوسرے ہم بغل۔ مطلب یہ ہے کہ اُدھر غیر کے ہمدوش ہونے کی وجہ سے تیرے شانہ (یا دوش) میں درد پیدا ہوگیا ہے۔ اِدھر تیرا عاشق درد شانہ میں مبتلا ہے۔ اس اعتبار سے عاشق کو اطمینان ہے کہ تجھ سے یک گونہ نسبت حاصل ہوگئی اور تیری ہمدوشی میسر آئی (گو کسی معنی میں سہی)۔
[8] جب تک عمر عدو کا کاسہ (پیمانہ) خالی ہے میرا حلقۂ آغوش بھی خالی ہے اور جب اُسکا کاسۂ عمر بھر جائیگا میرا حلقہ آغوش بھی بھرے گا۔ یعنی دوست سے میرا وصال رقیب کے مرنے پر موقوف ہے۔
[9] یعنی قہر خدا جور بتاں سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔

۴۹ چلمن کے بدلے مجھکو زمیں پر گرا دیا | اُس شوخ بے حجاب نے پردہ اُٹھا دیا[۱]
برق آہ کو جو مَیں نے کہا مسکرا دیا | دل گرمیوں[۲] نے اُس کی کلیجا جلا دیا
فرماتے[۳] ہیں وصال ہے انجام کارِ عشق | کیا ناصحِ شفیق نے مژدہ سُنا دیا
دھوتا[۴] ہے عہد نامۂ غیر اپنا حال دیکھ | آبِ حیا نے خطِ جبیں کیا مٹا دیا
تاثیر[۵] سوزِ دل کُرّۂ نار ہے مگر | اُس شعلہ رو کو سینہ سے میرے لگا دیا
کیا[۶] شاد شاد ہوں کہ وہ ہے تلخکام تر | میری جو شورشوں نے عدو کو مزا دیا
دیکھا[۷] نہ میرے نالۂ آہن گداز نے | آئینہ دیکھنے کا تماشا دکھا دیا
رشکِ[۸] فغاں کی ہائے رقیب آفرینیاں | محشر نے خفتگانِ زمیں کو جگا دیا
مٹی[۹] نہ دی ہزار تلاش آ کے اس نے بھی | کہتے ہیں لوگ خاک میں اُس نے ملا دیا

۴۹ ۱؎ اُس شوخ بے حجاب نے چلمن اُٹھا کر مجھے جلوہ دکھا دیا جسکے اثر سے مَیں غش ہو کر گر پڑا۔ گویا اُسنے چلمن کے بدلے مجھے زمین پر گرا دیا۔ ۲؎ دل گرمی = شوخی۔ شرارت۔ ۳؎ شاعر نے وصال کے لفظ سے فائدہ لیا ہے۔ ناصح کی مراد تو یہ تھی کہ وصال (موت) انجام کارِ عشق ہے۔ عاشق نے یہ سمجھا کہ وصل کی اُمید دلاتا ہے۔ شعر میں صنعت القول بالموجب ہے۔ ۴؎ معشوق اپنی رسوائی دیکھکر شرمندہ ہوتا ہے اور غیر سے جو عہدِ محبت اُس نے کیا تھا اُسکو شکست کرتا ہے۔ گویا آبِ خجالت اُسکے خطِ جبیں کے مٹانے کا باعث ہوا۔ خطِ جبیں سے مراد عہدِ محبت ہے جس کو نوشتۂ قسمت کی طرح پہلے اُس نے اپنے ذمے لازم کر لیا تھا۔ ۵؎ میرے سوزِ دل کی تاثیر نے شعلہ رو معشوق کو میرے سینے سے لگا دیا۔ ہو نہ ہو میرا سوزِ دل کُرّۂ نار کا حکم رکھتا ہے چونکہ ہر چیز اپنے اصل کی طرف ضرور رجوع کرتی ہے۔ اسلیے شعلہ کا کُرّۂ نار کی جانب کھنچ آنا ضروری ہے۔ ۶؎ میری بیتابیوں سے دشمن نے لطف اُٹھایا۔ مگر چونکہ وہ بیتابیاں تلخکامی (غم) کا نتیجہ تھیں اسلیے اس سبب سے وہ (دشمن) مجھ سے بھی زیادہ تلخکام ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں شاد شاد ہوں تا تلخکام۔ شورش اور مزہ میں ایہام تناسب ہے۔ ۷؎ نالۂ آہن گداز = وہ نالہ جسکی گرمی لوہے کو پگھلا دے یعنی میں نے جو نالۂ آہن گداز کیا تو اُسکے اثر سے آئینہ پگھل گیا اور معشوق کو خود بینی کا نتیجہ مل گیا۔ واضح رہے کہ پہلے لوہے کو صیقل کر کے آئینہ بنایا کرتے تھے۔ ۸؎ میری فغاں کے رشک میں محشر نے شور برپا کر کے خفتگانِ زمیں کو جگا دیا اور اس طریقہ سے میرے لاکھوں رقیب پیدا ہو گئے کیونکہ قیامت کے مجمعِ عام میں سب نے معشوق کو دیکھ لیا اور فریفتہ ہو گیا۔ رقیب آفرینیاں کی ترکیب اور تخیل دونوں مومن کا حصہ ہیں۔ ۹؎ خاک میں ملا دینا دو معنی رکھتا ہے۔ پہلے حقیقی اور دوسرے مجازی یعنی تباہ کر دینا۔ لوگوں نے اسکو مجاز میں بیان کیا مگر شاعر حقیقت کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ شعر میں خاص شوخی اور طنز ہے۔

ہمدم دکھا اب اس کو کسی ڈھب کہ رحم آئے
ناصح کو میرے حالِ زبوں نے رلا دیا

اُس کی شرارتوں[۱۰] سے جگر داغ داغ ہے
گُل کھانے کو رقیب کا پھلا منگا دیا

ایسی غزل کہی یہ کہ جھکتا ہے سب کا سر
مومن نے اس زمین کو مسجد بنا دیا

۵۸

دل قابلِ محبّت جاناں نہیں رہا
وہ ولولہ وہ جوش وہ طغیاں نہیں رہا

ٹھنڈا[۱۱] ہے گرمجوشیِ افسردگی سے جی
کیسا اثر کہ نالہ و افغاں نہیں رہا

کرتے[۱۲] ہیں اپنے زخمِ جگر کو رفو ہم آپ
کچھ بھی خیالِ جنبشِ مژگاں نہیں رہا

دل[۱۳] سختیوں سے آئی طبیعت میں نازکی
صبر و تحمّلِ قلقِ جاں نہیں رہا

کیا[۱۴] اچھے ہو گئے کہ بھلوں سے بُرے ہوئے
یاروں کو فکر چارہ و درماں نہیں رہا

غش[۱۵] ہیں کہ بے دماغ ہیں گُل پیرہن نمط
ازبس دماغ عطرِ گریباں نہیں رہا

آنکھیں نہ بدلیں شوخ نظر کیونکہ اب کہیں
مفتونِ[۱۶] لُطفِ نرگسِ فتّاں نہیں رہا

ناکامیوں[۱۷] کا گاہ گلہ گاہ شکر ہے
شوقِ وصال و اندوہِ ہجراں نہیں رہا

ف۱۰ گُل کھانا = لوہے وغیرہ کو گرم کر کے اپنے جسم پر داغنا۔ شرارت یہ ہے کہ میرے گُل کھانے کو اپنے چھلّے کے بدلے اُس نے رقیب کا چھلّا منگا دیا۔

ف۱۱ گرمجوشیِ افسردگی یعنی افسردگی کی شدت سے جی ٹھنڈا ہے (طبیعت کو سکون ہو گیا ہے) یہ پوری غزل مسلسل ہے اور ترکِ عشق مشعر ہے۔ ۵۰

ف۱۲ ہم اپنے زخمِ جگر کو خود رفو کر رہے ہیں اور جنبشِ مژگاں (التفاتِ نگاہِ یار) سے جو رفو کی توقعات وابستہ تھیں سب چھوڑ بیٹھے۔ ف۱۳ محبوب کی سخت دلی سے ہماری طبیعت میں قوتِ برداشت نہ رہی۔

ف۱۴ ہم تندرست ہو کر دوستوں کی نظرِ التفات سے بھی محروم ہو گئے کیونکہ اب دردہی نہیں جو وہ فکرِ درماں کریں۔ ف۱۵ غش یہاں خوش کے معنی میں ہے۔ گُل پیرہن نمط = معشوقِ گُل پیرہن کی طرح۔ یعنی ہم اس سے خوش ہیں کہ معشوق کی طرح بے نیاز و مغرور ہیں کیونکہ اب ہمیں معشوق کے گریبان کے عطر سے لطف اُٹھانے کا ارمان باقی نہیں رہا۔

ف۱۶ مفتوں = فریفتہ۔ فتّاں = فتنہ انگیز۔

ف۱۷ شوقِ وصال باقی نہ رہنے کا گلہ ہے اور اندوہِ ہجراں نہ رہنے کا شکر ہے اور یہ سب ناکامیِ محبت کی بدولت ہوا۔ نہ یہ مایوسی ہوتی نہ ہم شوقِ وصال و اندوہِ ہجراں سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔

ش۸ بے تو وہ تودہ خاک سبکدوش ہو گئے — سر پر جنون عشق کا احساں نہیں رہا

ش۹ ہر لحظہ مہر جلووں سے ہیں چشم پوشیاں — آئینہ زار دیدۂ حیراں نہیں رہا

ش۱۰ پھرتے ہیں کیسے پردہ نشینوں سے منہ چھپائے — رسوا ہوئے کہ اب غمِ پنہاں نہیں رہا

ش۱۱ آسیب چشم قہر پری طلعتاں نہیں — اے انس اک نظر کہ میں انساں نہیں رہا

ش۱۲ بیکاریِ اُمید سے فرصت ہے رات دن — وہ کاروبار حسرت و حرماں نہیں رہا

ش۱۳ بے سیر دشت و بادیہ لگنے لگا ہے جی — اور اُس خراب گھر میں کہ ویراں نہیں رہا

ش۱۴ کیا تلخکامیوں نے لبِ زخم سی دیئے — وہ شور اشتیاق نمکداں نہیں رہا

بے اعتبار ہو گئے ہم ترک عشق سے — از بسکہ پاس وعدہ و پیماں نہیں رہا

ش۱۵ نیند آ گئی فسانۂ گیسو و زلف سے — وہم و گمانِ خواب پریشاں نہیں رہا

ش۸ جب تک سر پر جنون عشق کا احسان تھا خاک اڑاتے تھے۔ اب کہ عشق سے طبیعت سیر ہو گئی ہے اور خاک اڑانا موقوف ہو گیا ہے سبکدوشی کیوں نہ حاصل ہو۔ تودہ تودہ خاک = خاک کی کثرت۔ ش۹ مہر جلوہ = وہ معشوق جسکا جلوہ آفتاب جیسا ہے۔ میں اب ہر لحظہ حسینوں سے آنکھ چرانے لگا ہوں اسلیے میرے دیدہ حیراں میں آئینہ زار کی کیفیت نہیں رہی۔ حیرت یا تجلی جمال کی وجہ سے آنکھ کو آئینہ زار کہا ہے۔ ش۱۰ ترک محبت کی وجہ سے میں انگشت نما ہو گیا ہوں اور اسی انگشت نمائی یا رسوائی کے باعث حسینوں کا سامنا کرتے ہوتے حجاب آتا ہے۔ پردہ نشینوں کے لفظ کی رعایت سے غم عشق کو غم پنہاں قرار دیا ہے۔ ش۱۱ جب تک میں انسانیت سے متصف تھا اور دولت عشق سے مالا مال۔ اس وقت تک پری رخوں کی نگاہ غضب سے ڈرتا تھا۔ لیکن اب مجھ پر کچھ اثر نہیں ہوتا اے عشق (اُنس) مدد کر کہ پھر وہی انکا سامنا پیش نظر ہو۔ آسیب۔ پری۔ انسان۔ اُنس میں رعایت شاعرانہ ہے۔ ش۱۲ یعنی پہلے عشق میں امیدوں کے ہوائی قلعے بنایا کرتے تھے جو آخر میں حرمان (مایوسی) کے ہاتھوں زمین پر آ رہتے تھے غرض اچھا خاصا مشغلہ رہتا تھا۔ اب اُمید یکسر بیکار ہے اور کوئی شغل نہیں ملتا۔ ش۱۳ عاشق یا شاعر کے نزدیک گھر کی ویرانی ہی عین آبادی ہے۔ اب گھر ویران نہیں وہ اُس کو "خراب" قرار دیتا ہے۔ ش۱۴ پیشتر لب ہائے زخم نمک کے طالب تھے یعنی محبت کی ایذا میں لذت محسوس ہوتی تھی لیکن آخر اس قدر تلخکامیاں اٹھائیں کہ زخموں کو نمکدان کی خواہش نہیں رہی۔ تلخ۔ شور۔ نمکداں کی رعایت ظاہر۔ ش۱۵ عشق میں ہمیشہ خواب پریشاں سے کام رہا۔ ادھر سوتے اُدھر گھبرا کر چونک پڑے اب افسانہ زلف سنکر بھی نیند آ جاتی ہے۔ خواب پریشان کا تو کہیں نام و نشان بھی نہیں۔

کس کام کے رہے جو کسی سے رہا نہ کام		سر ہے مگر غرور کا ساماں نہیں رہا

مومن یہ لاف الفتِ تقویٰ ہے کیوں مگر
دلّی میں کوئی دشمنِ ایماں نہیں رہا

کیا[1] رم نہ کروگے اگر ابرام نہ ہوگا	۵۱	الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہوگا
کاش آپ وہ آئیں جو سنوں ناز کی باتیں		قاصد سے ادا پاسخِ پیغام نہ ہوگا
ہاں[2] جوشِ طپش چھیڑ چلی جائے کہ پرتو		جھڑ جائیں گے فرسودہ اگر دام نہ ہوگا
ناکامیِ[3] اُمید پہ صبر آئے تو کیا آئے		ہر بات پہ کہتے ہو کہ یہ کام نہ ہوگا
منقوش[4] دلِ خلق ہے پرہیز کی خوبی		کتنا ہی کرے ظلم وہ بدنام نہ ہوگا
بیٹھا[5] رہوں کیا منتظرِ دور میں ساقی	مستثنوی	اتنوں میں کوئی میکدہ آشام نہ ہوگا

۵۱ سلہ ابرام = اصرار۔ رم = وحشت۔ گریز۔ یعنی جب میں تم سے ملنے پر اصرار کرتا ہوں تو تم گریز کرتے ہو اور مجھ پر ابرام کرنے کا الزام رکھتے ہو کہ اسی سے مجھکو (معشوق کو) نفرت ہوتی ہے۔ مگر دقت یہ ہے کہ جب میں ابرام نہ کرونگا تو بھی تم رم سے باز آنے والے نہیں۔ غرض اس الزام کا نتیجہ بجز الزام کچھ نہیں۔ یعنی پھر تم موردِ الزام ٹھہروگے اور یہ ثابت ہو جائے گا کہ کوئی ابرام کرے نہ کرے تمھاری عادت ہی رم کرنے کی ہے۔ یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ پھر تم مجھے الٹا الزام دوگے کہ یہ (عاشق) خود ابرام نہیں کرتا۔ میری بلا کو کیا غرض جو ایسے شخص سے التفات کرے۔ سلہ جوشِ تپش سے کم از کم اتنا فائدہ تو ہوگا کہ پر گر جائیں گے اور حسرت پرواز جاتی رہے گی۔ سلہ میں ناکامیِ اُمید پر صبر کر لیتا مگر مشکل یہ ہے کہ تم ہر بات پر کہتے ہو کہ یہ کام نہ ہوگا۔ اسلیے گمان ہوتا ہے کہ شاید اس موقع پر بھی تمھارا یہ کہنا بربنائے مقتضائے عادت ہو نہ بربنائے واقعیت اور دراصل حصول اُمید کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ سلہ دنیا پرہیز کو قابلِ ستایش سمجھتی ہے۔ اسلیے معشوق جو عاشق سے پرہیز کرتا ہے (کہ دراصل عاشق کے حق میں ظلم ہے) بدنام نہیں ہو سکتا۔ دنیا سمجھے گی کہ یہ پرہیز کرتا ہے کوئی جرم نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ پرہیز خلق کے نزدیک مذموم نہیں بلکہ محمود ہے۔ شہ میکدہ آشام = وہ بلا نوش جو میکدہ کا میکدہ چڑھا جائے۔ مومن کی خاص ترکیب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر میں دورِ شراب کا انتظار کروں اور کوئی رند میکدہ کا میکدہ خالی کر جائے تو میں محروم ہی رہ جاؤنگا۔

اس جوش تپش پر ہوئی مشکل سے رسائی ۵۶ — صد شکر گذر غیر کا تا بام نہ ہوگا

کیا کیجیے دل شوخیِ فطرت پہ جو آجائے ۵۷ — یہ تو میں سمجھتا تھا کہ وہ رام نہ ہوگا

گلرنگ ہوا گریۂ خوں سے مرا دامن — کیا اب بھی تجمل چرخ سیہ فام نہ ہوگا

خو ہوگئی ہجراں میں تڑپنے کی شب وصل ۵۸ — گو چین ہو دل کو مجھے آرام نہ ہوگا

ہیں پاک نظر ہم تو ہے ذوق فراغت — بے چاشنیِ بوسۂ دشنام نہ ہوگا

کم ظرفیِ اغیار پہ ساقی کو نظر ہے ۵۹ — افسوس کہ آلودہ لب جام نہ ہوگا

وہ شوخ فریبِ قلقِ غیر میں آیا ۶۰ — اب مجھ سے تو صبر اے دل ناکام نہ ہوگا

کیا فتنۂ محشر کو قدِ یار سے نسبت ۶۱ — ہے خاص کشی ولولۂ عام نہ ہوگا

اغیار سے بے فائدہ ہے گرمیِ صحبت ۶۲ — کاہے کو جلے گا جو کوئی خام نہ ہوگا

ہے مہر تجھے دیکھ کے شرمندہ و مشتاق ۶۳ — اتنا کہ ظہورِ سحر و شام نہ ہوگا

---

۵۶ یعنی رقیب کا عشق صادق نہیں اس لیے میرا سا جوش تپش اُس کو کہاں نصیب۔ جب مجھے اس جوش تپش کے باوجود بمشکل رسائی حاصل ہوئی تو اس کی کامیابی معلوم۔ ۵۷ محبوب میں فطرۃً شوخی ہے اسلیے اُس کا قابو میں آنا محال ہے۔ میں جو عاشق ہوا تو اس اُمید پر نہیں کہ وہ میرے قابو میں آجائے گا۔ بلکہ مجبور تھا کہ شوخی ہی پر میرا دل آگیا۔ ۵۸ یعنی ترک عادت باعثِ اذیت ہوتا ہے۔ شب وصل کا تعلق مصرع ثانی سے ہے۔ ۵۹ ساقی اغیار کی کم ظرفی کا خیال پیش نظر رکھتا ہے اس لیے اُن کو جام لبریز نہیں دیتا۔ اندیشہ یہ ہے کہ اُن کمظرفوں پر قیاس کرکے ہمارے ساتھ بھی وہی سلوک نہ کرے۔ لب جام کا سے آلودہ ہونا جام کا لبریز ہونا۔ ۶۰ میں پاس ضبط سے صبر کیے بیٹھا ہوں لیکن جب دیکھتا ہوں کہ وہ شوخ غیر کی مصنوعی بیتابی کے دھوکے میں آگیا اور اُسکی جانب ملتفت ہوگیا۔ تو اب مجھ سے بھی صبر ناممکن ہے۔

۶۱ فتنۂ محشر کا کام عام کشی (قتل عام) ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جب سب بلاتخصیص ہلاک ہوجائیں گے ولولۂ عام پیدا نہیں ہوسکتا۔ مگر قد یار خاص خاص عشاق کو قتل کے لیے منتخب کرتا ہے۔ اس لیے باقی لوگوں میں شوق شہادت پیدا ہوتا ہے اور جوش پھیلتا ہے۔ اس لیے فتنۂ محشر قد یار کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ ۶۲ تمہاری اغیار سے بے تکلفی اس غرض سے ہے کہ مجھے جلاؤ۔ مگر اس سے منہ دھو رکھو۔ میں جلنے والا نہیں جو چیز خام ہوتی ہے وہ جلتی ہے اور میں ٹھہرا پختہ کار۔ ۶۳ آفتاب تیرے جلوہ سے شرمندہ ہے اس لیے سامنے نہیں آئیگا کہ طلوع سحر ہو اور تیرا مشتاق بھی ہے۔ اس لیے غروب نہ ہوگا کہ ظہور شام ہو۔

بُلبل کے سے نالے کہ صبا کی سی کروں سعی	میرا نہ ہوا ہے وہ گلُ اندام نہ ہوگا

وہ مشق رہی اور نہ وہ شوق ہے مومن
کیا شعر کہیں گے اگر الہام نہ ہوگا

۵۲

گر میں کمبخت وہ بخیل ہوا	مجھکو چھیڑ آسماں ذلیل ہوا
گر یہی بیخودی ہے صہبا میں	کون مشتاق سلسبیل ہوا
آسماں راہ پر نہیں آتا	دعویٔ خضرؑ بے دلیل ہوا
ہائے وہ لاف ہائے خودکامی	غیر ہر کام میں دخیل ہوا
اب تغافل ہے واں مگر گردوں	میرے آزار کا کفیل ہوا
کس قدر تیز رو ہے سوئے صنم	نامہ بر میرا جبرئیل ہوا
اثرِ حسن و عشق تھا بے مثل	میں ترا تو مرا عدیل ہوا
العطش زن سپہر و یار و عدو	بے گنہ خوں مرا سبیل ہوا

یعنی اب اگلی سی مشق و شوق تو ہے نہیں ہاں الہام کی مدد ہوتی ہے تو شعر کہہ لیتا ہوں۔ اگر الہام نہوگا تو میرا شعر کہنا معلوم۔

۵۲ حضرت خضرؑ گم کردہ راہوں کو راہ بتاتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ دعویٰ بے دلیل ہے۔ اگر صحیح ہوتا تو آسمان کبھی تو راہ آتا۔ ہائے اب معشوق کے وہ دعویٰ ہائے خودرائی کہاں گئے۔ اب تو یہ حال ہے کہ غیر اُسکے ہر معاملے میں دخیل ہوگیا ہے اس سے تو وہی خودرائی اچھی تھی۔ کہ کسی کی نہیں سُنتا تھا۔ یہی مضمون دوسرے جگہ لکھتے ہیں۔ حیف صد حیف اگر غیر کے دم میں آئے + میں اسی بات پہ مرتا تھا کہ تم ہو عیار۔ محبوب کی توجہ کا مقصد محض مجھپر ظلم کرنا تھا۔ اب توجہ کی عوض مجھ سے تغافل ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہوگی کہ اُسکو اطمینان ہوگا کہ اب آسمان نے ستم کرنے کی خدمت اپنے ذمے لیلی ہے۔ میں آزار دینے کی زحمت کیوں اُٹھاؤں۔ یہ پہلو بھی ہوسکتا ہے کہ محبوب مجھ سے تغافل کرتا ہے۔ پھر بھی میں مورد بیداد ہوں۔ شاید اسکی وجہ یہ ہوگی کہ اب آسمان نے اپنے ذمہ یہ کام لے لیا ہے۔ تو حُسن کی وجہ سے اور میں عشق کی بدولت بے مثل تھا۔ اسلیے بے مثل ہونے میں میں تیرا عدیل (مثل) ہوا اور تو میرا۔ یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ تیرے حُسن کے اثر نے مجھکو ہمہ تن حُسن بنا دیا اور میرے عشق کے جذبے نے تجھکو یکسر عشق کر دیا۔ اسلیے جو تو تھا وہ اب میں ہوں اور جو میں تھا وہ تو ہے۔ العطش زن = العطش کہنے والا پیاسا۔

آپ کی کون سی بڑھی عزت | مَیں اگر بزم میں ذلیل ہوا
آتشِ[1] آہ بے اثر سے مری | آسماں گلشنِ خلیل ہوا
کوتہی کی جواب میں جوں جوں | اور بھی خط مرا طویل ہوا

ہائے[2] مومن شہادتِ بے اجر
بہرِ وصلِ صنم قتیل ہوا

۵۳
غصہ بیگانہ وار ہونا تھا | بس یہی تجھ سے یار ہونا تھا
کیا شبِ انتظار ہونا تھا | ناحق اُمیدوار ہونا تھا
کیوں نہ ہوتے عزیز غیر تمھیں | میری قسمت میں خوار ہونا تھا
مجھے[3] جنت میں وہ صنم نہ ملا | حشر اور ایک بار ہونا تھا
گر نہ تھی اے دل اُسکے رنج کی تاب | کیوں شکایت گذار ہونا تھا
خاک ہوتا نہ میں تو کیا کرتا | اس کے در کا غبار ہونا تھا
ہرزہ[4] گردی سے ہم ذلیل ہوئے | چرخ کا اعتبار ہونا تھا
مرگ[5] شامِ وصال حرماں ہائے | صبحدم جاں نثار ہونا تھا

[1] گلشن خلیل سے مُراد وہ آگ ہے جو حضرت ابراہیمؑ پر باغ و بہار ہوگئی تھی مطلب یہ ہے کہ میرے آہ کی آگ آسمان تک گئی مگر چونکہ بے اثر تھی اسلیے آسمان کو جلا نہ سکی۔ گویا آسمان کی وہی کیفیت ہوئی جو گلشن خلیل کی تھی یہی تشبیہ ہے۔ [2] شاعر نے اپنے قتل کو شہادت اسلیے کہا کہ "مومن" کا قتل تھا اور بے اجر اسلیے کہ اس شہادت کا صلہ کہ اُسکے نزدیک وصل صنم تھا۔ حاصل نہ ہوا۔

۵۳ [3] حشر کے بعد مومن کو جنت ملی مگر صنم نہ ملا۔ اسلیے کہتا ہے کہ حشر اور ایکبار ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ شاعر کے نزدیک جو حشر کا مقصود تھا وہ تو حاصل نہ ہوسکا۔ [4] میں نے اتنی ہرزہ گردی کی کہ ذلیل ہوگیا ورنہ اس سے پہلے آسمان ہرزہ گردی میں بدنام تھا۔ اب میرے مقابلہ میں اُس کی آوارہ گردی کی شہرت کم ہوگئی۔ دراصل یہ مقدر ہوچکا تھا کہ اُسکی یہ بدنامی دور ہو اور عزت بڑھے۔ [5] عاشق اپنی محرومی کا شکوہ سنج ہے کہ شام وصل خوشی سے کیوں مرگیا۔ اگر مرنا تھا تو صبح شبِ وصال مرتا۔ کہ وصال یار سے محروم تو نہ رہتا۔

اور سے ہمکنار ہے دشمن	آج تو ہمکنار ہونا تھا
شکوۂ دہر پر کہا تم کو	آفتِ روزگار ہونا تھا
چشم بے اعتبار جاناں میں	کیا مرا اعتبار ہونا تھا
صبر کر صبر ہو چکا جو کچھ	اے دلِ بیقرار ہونا تھا
کوئے[۷] دشمن میں جا پکڑتا کیوں	کیا مجھے شرمسار ہونا تھا
وہ نمک پاش کبھی نہیں ہوتے	یوں ہی دل کو فگار ہونا تھا
خاک[۸] میں حیف یہ شراب ملے	محتسب بادہ خوار ہونا تھا
نہ گیا[۹] تیر نالہ سوئے رقیب	مرغِ عرشی شکار ہونا تھا

رات دن بادۂ و صنم مومن
کچھ تو پرہیزگار ہونا تھا

۱ اثر[۱] اس کو ذرا نہیں ہوتا	۵۴	رنج راحت فزا نہیں ہوتا
بیوفا کہنے کی شکایت ہے		تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا
ذکر[۲] اغیار سے ہوا معلوم		حرفِ ناصح برا نہیں ہوتا

۷ جا پکڑنا = سکونت اختیار کرنا۔ ۸ اے محتسب اگر تو بادہ خوار ہوتا تو شراب کی ایسی بیقدری نہ کرتا۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ خدمت احتساب کسی بادہ خوار کو سپرد ہونی چاہیئے تھی تاکہ اگر محتسب ہونے کی بنا پر شراب کو ضبط کرتا تو بادہ خوار ہونے کی وجہ سے اس کو پی جاتا۔ شراب ضائع تو نہ جاتی۔ ۹ مرغ عرشی = فرشتہ۔ یہ قسمت میں تھا کہ میرے نالے کے تیر سے طائر عرش شکار ہو۔ سو وہی ہوا۔ مگر جو اصل نشانہ تھا (یعنی رقیب) وہ بچ گیا۔

۵۴ ۱ اگر محبوب میرے رنج سے متاثر ہو کر مجھ پر مہربان ہو تو یہ رنج میرے حق میں راحت فزا ہو جائے مگر آہ ایسے نصیب کہاں۔ ۲ میں ناصح کی باتوں کو برا سمجھتا تھا مگر ذکر اغیار ان سے بڑھکر دلخراش ہے۔ اب ذکر اغیار کے مقابلے میں حرف ناصح کی مجھے قدر ہوئی کہ وہ اس قدر برا نہ تھا۔

کس[۵۳] کو ہے ذوقِ تلخکامی لیکن — جنگ بن کچھ مزا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا

اُس نے کیا جانے کیا کیا لیکر — دل کسی کام کا نہیں ہوتا

امتحاں[۵۴] کیجیے مرا جب تک — شوق زور آزما نہیں ہوتا

ایک[۵۵] دشمن کہ چرخ ہے نہ رہے — تجھ سے یہ اے دعا نہیں ہوتا

آہ طولِ[۵۶] امل ہے روز افزوں — گرچہ اک مدعا نہیں ہوتا

نارسائی[۵۷] سے دم رُکے تو رُکے — میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

تم[۵۸] مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حالِ دل یار کو لکھوں کیونکر — ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

رحم[۵۹] کر خصم جانِ غیر نہ ہو — سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا

دامن[۶۰] اُس کا جو ہے دراز تو ہو — دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا

۵۳ جنگ کی تلخی کس کو اچھی لگتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جنگ کے بغیر صلح میں لُطف بھی نہیں آتا۔ کہ الاشیاء تُعرف باضدادہا۔ ۵۴ جب تک میرا شوق اپنا اثر نہیں دکھاتا اُس وقت تک آپ میرا امتحان محبت کیجیے جب میرے شوق کی کشش ہوگی آپ خود کھنچے چلے آئیں گے۔ پھر امتحان کی کیا ضرورت ہوگی۔ ۵۵ اے دعا تجھ سے یہ بھی نہیں ہوتا کہ منجملہ میرے اور دشمنوں کے ایک اِس دشمن ہی کو (کہ چرخ ہے) فنا کردے۔ مصرعہ اول کی بندش اچھی نہیں۔ ۵۶ اگرچہ ایک مدعا بھی پورا نہیں ہوتا تاہم آرزوئیں ہیں کہ بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ ۵۷ خفا (خفہ) کے لفظ میں ایہام ہے کیونکہ اُسکے لغوی معنی دم گھٹے ہوئے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میرا دم اپنی نارسائی کی وجہ سے رُکے تو اُس پر تو (لغتہً) خفگی کا اطلاق ممکن ہے۔ ورنہ میری عادت خفگی کی نہیں۔ ۵۸ جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو میرا تصور تم کو لاکر میرے پیش نظر کر دیتا ہے۔ یہ شعر اس قدر مطابق فطرت اور بلیغ ہے کہ بقول مولانا حالی مرزا غالب کہا کرتے تھے "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھکو دیدیتا"
۵۹ رقیب کے ساتھ دشمنی نہ کر ورنہ وہ کم ہمت ترک عشق کر بیٹھے گا کیونکہ سب میری طرح باوفا نہیں ہوتے
۶۰ اُس کا فیض عام سہی مگر عاشق اپنی بدقسمتی کا کیا علاج کرے۔

ہرچہ ہست از قامتِ ناسازِ بے اندامِ ماست ✦ ورنہ تشریفِ تو بر بالاے کس کوتاہ نیست

چارۂ دل سوائے صبر نہیں ‏ ‏ ‏ سو تمھارے سوا نہیں ہوتا

کیوں؎ سُنے عرضِ مضطر اے مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

۵۵

کیا؎ ہوا ہو اگر وہ بعدِ امتحاں اپنا ‏ ‏ ‏ بیگنہ سزا پائے اب وہ دل کہاں اپنا
خار؎ و خس میں گلشن کے بوئے گل جو آتی تھی ‏ ‏ ‏ رشک سے کیا برباد آپ آشیاں اپنا
روز کا بگاڑ آخر جان پر بنا دے گا ‏ ‏ ‏ ان کو شوقِ آرایش دل ہے بدگماں اپنا
دشنہ چھین لیگا کیا ہمنشیں شبِ فرقت ‏ ‏ ‏ آپ جب نہیں اپنے کون میری جاں اپنا
بعد؎ مدت اس کوُ سے یوں پھرے ہیں تنگ آکر ‏ ‏ ‏ جائے جائے پھرتے ہیں پوچھتے مکاں اپنا
صبر؎ بعد آسایش اس قلق پہ مشکل تھا ‏ ‏ ‏ عیشِ جاوداں نکلا رنجِ جاوداں اپنا
عشق؎ بُت میں خود ابتو در خورِ پرستش ہیں ‏ ‏ ‏ نام ہو گیا اتنا گم کیا نشاں اپنا
دل؎ کے لینے تک ہے بس آپ کی خریداری ‏ ‏ ‏ کیوں کریں وہ سودا ہم جس میں ہو زیاں اپنا

؎ قرآن مجید میں ہے اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ یعنی (خدا کے سوا) کون ہے جو مضطر کی دعا کو سُنے
شاعر کہتا ہے یہ تو خدا ہی کی صفت ہے۔ صنم آخر خدا تو نہیں جو عرضِ مضطر سُنے۔
؎ اگر دوست امتحانِ وفا کے بعد مہربان ہو گا تو کیا حاصل۔ کیونکہ اب دل میں وہ طاقت نہیں رہی کہ امتحان ۵۵
کے لیے آمادہ ہوا اور اس طرح بے گناہ سزا جھیلے۔ ؎ میں نے اپنے آشیان کے خار و خس کو اس رشک سے خود
برباد کر دیا کہ اُن میں گُل کی بو آتی تھی۔ ؎ اتنے عرصہ کے بعد کوئے یار سے واپسی ہوئی کہ اپنا گھر بھول
گئے۔ جائے جائے = جگہ جگہ۔ ؎ اگر پہلے آسائش نصیب ہو چکی ہوتی پھر یہ قلق پیش آتا تو صبر کرنا دشوار
تھا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ شروع سے رنجِ جاوداں سے کام پڑا۔ جس نے درحقیقت عیشِ جاوداں کا اثر
دکھایا۔ ع "مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں"۔ ؎ ہم نے بت کے عشق میں اپنی ہستی اسقدر مٹادی کہ خلق میں شہرت
ہو گئی اور ہماری بے نشانی مستحقِ پرستش ٹھہری۔ عاشق نے بے نشانی کی بنا پر اپنے کو معبودِ برحق کا مماثل قرار دیا ہے
؎ خریداری سے یہاں التفاتِ یار مراد ہے۔

دل کی بیقراری سے ہر تپش زمیں فرسا	ق	بہر خرمن گردوں شعلہ ہر فغاں اپنا
دیکھئے پس مردن حال جسم وجاں کیا ہو		مدعی زمین اپنی دشمن آسماں اپنا

دیر و کعبہ یکساں ہے عاشقوں کو اے مومن
ہو رہے وہیں سکے ہم جی لگا جہاں اپنا

ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا	۵۶	مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا
اس حسن پہ خلوت میں جو حال کیا کم تھا		کیا جانئے کیا کرتا گر تو مری جا ہوتا
ایک ایک ادا سو سو دیتی ہے جواب اسکے		کیونکر لب قاصد سے پیغام ادا ہوتا
اچھی ہے وفا مجھ سے جلتے ہیں جلیں دشمن		تم آج ہوا سمجھو جو روز جزا ہوتا
جنت کی ہوس واعظ بیجا ہے کہ عاشق ہوں		ہاں سیر میں جی لگتا گر دل نہ لگا ہوتا
اس تلخی حسرت پر کیا چاشنی الفت		کب ہم کو فلک دیتا گر غم میں مزا ہوتا
سنکے کوسنے یا گالی طعنوں کا جواب آخر		لب تک غم غیر آتا گر دل میں بھرا ہوتا
ہے صلح عدو بیجا تھی جنگ غلط فہمی	مقطع	جینا ہے تو آفت ہے مرتا تو بلا ہوتا

ش میری ہر تڑپ زمین کو پامال کئے ڈالتی ہے اور میری ہر فریاد شعلہ بنکر آسمان کو جلا دیتی ہے یہ اور شعر مابعد قطعہ بند ہیں۔ فغاں و افغاں کو مومن نے مذکر باندھا ہے۔

۵۶ ۱ ہم اس وقت ہجر یار میں جان دے رہے ہیں۔ اگر وہ آتا تو اسکے مقدم کی خوشی میں جان فدا کرتے۔ غرض جان ہر طرح جانے والی تھی۔ وہ وعدہ وفا کرتا یا نہ کرتا۔ ۲ تیرے اس حسن پر خلوت میں ہم نے جو بے باکی اور بے تکلفی کا اظہار کیا تھوڑا تھا۔ اگر تو ہماری جگہہ ہوتا تو نجانے کیا کرتا۔ ۳ تم مجھ سے وفا کرتے ہو اسپر دشمن اگر جلتے ہیں تو جلنے دو آخر روز جزا دوزخ میں جلنا انکے نصیب میں تھا ہی۔ آج نہ جلے کل ہی۔ ۴ فلک کی عداوت اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ اگر غم میں مزا ہوتا تو وہ ہمیں غم بھی نہ دیتا۔ جب یہ حالت ہے تو پھر غم عشق سے ہمارا لطف اندوز ہونا کیونکر ممکن ہے کیونکہ اس کو تلخی حسرت نے بدمزہ کر دیا ہے۔ ۵ عاشق اپنے دل کو تسلی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے معشوق کو طعنۂ الفت غیر دیا جسکے جواب میں گالی کوسنے سنے اس سے معلوم ہوا کہ یہی اسکے دل میں بھرے تھے۔ اگر عشق رقیب اسکے دل میں ہوتا تو وہ ضرور زبان تک آتا کیونکہ کُلُّ اِنَاءٍ یَتَرَشَّحُ بِمَا فِیْهِ۔ ۶ رقیب سے صلح تو بے لطف ہے ہی جنگ بھی نادانی ہے کیونکہ وہ زندہ ہے تو آفت ہے۔ مرتا تو بلا ہوتا۔

ہوتا تھا وصال اک شب قسمت میں بلا سے گر — تو مجھ سے خفا ہوتا میں تجھ سے خفا ہوتا

ہے بیخودیٔ دائم کیا شکوہ تغافل کا — جب میں نہ ہوا اپنا وہ کیونکہ مرا ہوتا

اس بخت پہ کوشش سے تھکنے کے سوا حاصل — گر چارۂ غم کرتا رنج اور سوا ہوتا

اچھی مری بدنامی تھی یا تری رسوائی — گر چھوڑ نہ دیتا میں پامال جفا ہوتا

دیوانے کے ہاتھ آیا کب بند قبا اسکا — ناخن جو نہ بڑھ جاتے تو عقدہ وا ہوتا

ہم بندگیٔ بت سے ہوتے نہ کبھی کافر
ہر جائے گر اے مومن موجود خدا ہوتا

۵۶

دم میں رہتے تو شاد رہتے اسے بھی فکر ستم نہ ہوتا — جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا

ہوئی خجالت سے نفرت افزوں گلے کیے خوب آخر دم — وہ کاش اک دم ٹھہر کے آتے کہ میرے لب پر بھی دم نہ ہوتا

پڑا ہے مرنا بس اب تو ہم کو جو اسنے خط پڑھ کے نامہ بر سے — کہا کہ گر سچ یہ حال ہوتا تو وہ قرار ستم نہ ہوتا

کسی کے جلنے کا دھیان آیا وگر نہ دود فغاں سے میرے — اگر ہزاروں سپہر بنتے تمہاری آنکھوں میں نم نہ ہوتا

قسمت میں ایک رات تو وصال ہونا چاہیے تھا۔ خواہ باہمی رنجش ہی میں گذر جاتی۔ سلسلۂ محبت قائم رکھنے میں عاشق پامال جفا ہوتا۔ یہ ظلم درحقیقت معشوق کے لیے موجب رسوائی ہے۔ رہا ترک محبت۔ سو یہ عاشق کے لیے باعث بدنامی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں نے محبت جو ترک کی اسکی وجہ یہ تھی کہ میں نے اپنی بدنامی کے مقابلے میں تمہاری بدنامی کا پاس کیا۔ یہ مومن کا مکر شاعرانہ ہے۔ قاعدہ ہے کہ ناخن سے گرہ کھل جاتی ہے۔ عشق میں اسکے برعکس صورت پیش آئی۔ یعنی جب عاشق دیوانہ کے ناخن بڑھے معشوق کو اسکی دیوانگی سے اور نفرت ہوئی اور بند قبا تک رسائی اور دشوار۔ گویا ناخنوں کے بڑھ جانے سے دیوانہ کا عقدہ یکسر لاینحل ہوگیا۔ اس شعر میں مومن نے اہل حدیث کے عقیدہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ خدا ہر جگہ نہیں۔ البتہ اس کا علم ہر جگہ ہے۔

۵۶ جب دم آخر وہ میرے دیکھنے کو آئے تو میں نے خوب گلے کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو خجالت ہوئی اور خجالت سے نفرت بڑھی۔ کاش وہ میرے مرنے کے بعد آتے تو یہ نوبت نہ پہونچتی۔ میری آہوں کے دھوئیں سے ہزاروں آسمان بنتے تو بھی تمہاری آنکھیں پرنم ہونے والی نہ تھیں۔ پرنم ہونا تمہارے آب دیدہ ہونے کا باعث یہ ہے کہ کہیں رقیب ان آہوں کے اثر سے نہ جل جائے۔ ظاہر ہے کہ دھوئیں سے آنکھیں پرآب ہو جاتی ہیں۔

جو آپ[۱] در سے اُٹھا نہ دیتے کہیں نہ کرتا میں جبہہ سائی
اگرچہ یہ سرنوشت میں تھا تمہارے سر کی قسم نہ ہوتا

وصال کو ہم ترس رہے تھے جو اب[۲] ہوا تو مزا نہ پایا
عدو کے مرنے کی جب خوشی تھی کہ اُسکو رنج و الم نہ ہوتا

جہاں تنگ و ہجوم وحشت غرض کہ دم پر بری بنی تھی
کہاں میں جاتا نہ جی ٹھہرتا کہیں جو دشتِ عدم نہ ہوتا

مگر[۳] رقیبوں نے سر اُٹھایا کہ یہ نہ ہوتا تو بے مروت
نظر سے ظاہر حیا نہ ہوتی حیا سے گردن میں خم نہ ہوتا

وہاں[۴] ترقی جمال کو ہے یہاں محبت ہے روز افزوں
شریک ہوتا تھا بوالہوس بھی جو بیوفائی میں کم نہ ہوتا

غلط[۵] کہ صانع کو ہو گوارا خراش انگشت ہائے نازک
جواب خط کی اُمید رکھتے جو قول جَفَّ القلم نہ ہوتا

یہ بے تکلف پھرا رہی ہے کشش دلِ عاشقاں کی اُسکو
وگرنہ ایسی نزاکتوں پر خرام ناز اک قدم نہ ہوتا

وصال[۶] تو ہے کہاں میسر مگر خیالِ وصال ہی ہیں
مزے اُڑاتے ہوس نکلتی جو ساتھ انداز رم نہ ہوتا

ہوا[۷] مسلماں میں اور ڈر سے نہ درس واعظ کو سُن کے مومن
بنی تھی دوزخ بلا سے بنتی عذاب ہجرِ صنم نہ ہوتا

۱ آپ نے مجھے اپنے در سے اُٹھا دیا۔ اگر ایسا نہ کرتے تو میں ہرگز کسی دوسرے (حسین) کے در پر جبیں سائی نہ کرتا۔ دوسرے در کی ناصیہ فرسائی اگر میرے مقدر میں ہوتی تو بھی میں یقیناً اُس صورت میں اُس کا مرتکب نہ ہوتا۔ ۲ اب یعنی عدو کے مرنے کے بعد ہمیں وصال یار میسر ہوا۔
۳ تیری حیا در پردہ رقیبوں کے اختلاط و بیباکی کی پردہ دری کر رہی ہے۔
۴ اگر معشوق کے جمال میں روز افزوں ترقی ہے۔ تو میری محبت بھی روز افزوں ہے۔ یعنی دونوں اپنے وصف میں کامل ہیں وہ حُسن میں۔ تو میں عشق میں۔ رہا رقیب۔ سو اُس کو بھی ہم شریک کر لیتے بشرطیکہ اُس میں بھی کوئی کمال ہوتا۔ مگر خرابی یہ ہے کہ وہ بے وفائی میں بھی کامل نہیں۔ ۵ حدیث شریف میں ہے جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ کَائِنٌ یعنی قلم قدرت تمام امور کو لکھکر خشک ہو گیا۔ اب تغیر محال ہے۔ شاعر کی مراد یہ ہے کہ محبوب سے جواب خط کی امید رکھنی عبث ہے کیونکہ صانع تقدیر کو اُس کی انگشت نازک کی خراش گوارا نہ ہو گی اور امور تقدیر میں ردّ و بدل ٹھہرا ناممکن۔ ۶ رم = گریز۔ یعنی خیال وصال میں بھی رم کی کیفیت ہے۔ اِدھر آیا اُدھر چلدیا۔ ورنہ اسی سے متمتع ہوتے۔ ۷ واعظ نے کہا تھا کہ مسلمان عذاب سے محفوظ رہیں گے۔ میں یہ سُنکر اس خیال سے مسلمان ہو گیا کہ شاید اسلام کی برکت سے عذاب ہجر صنم سے (جو عذاب کی سخت ترین قسم ہے) بچ جاؤں ورنہ عذاب دوزخ کی مجھے پروا نہیں۔

ردیف الباء

۵۸ جگایا

گئے وہ خواب سے اُٹھ غیر کے گھر آخرِ شب[1] — اپنے نالے نے دکھایا یہ اثر آخرِ شب

صبحدم وصل کا وعدہ تھا یہ حسرت دیکھو[2] — مر گئے ہم دمِ آغازِ سحر آخرِ شب (ق)

سوزِ دل سے گئی جاں بخت چمکنے کے قریب — کرتے ہیں موسمِ گرما میں سفر آخرِ شب

شعلۂ آہ فلک رتبہ کا اعجاز تو دیکھ[3] — اوّل ماہ میں چاند آئے نظر آخرِ شب

ملے ہو غیر سے بے پردہ تم انکار کے بعد[4] — جلوہ خورشید کا سا تھا کچھ اُدھر آخرِ شب

صبحدم آنے کو تھا وہ کہ گواہی دے ہے[5] — رجعتِ قہقری چرخ و قمر آخرِ شب

غیر نکلا ترے گھر سے گئی اس وہم میں جان — غُل ہوئے چور کے اس کوچے میں گر آخرِ شب

دی تسلی بھی تو ایسی کہ تسلی نہ ہوئی — خواب میں تو مرے آئے وہ مگر آخرِ شب

مو[6] سفیدی کے قریب اور ہے غفلت مومن
نیند آتی ہے یہ آرام دگر آخرِ شب

[1] میرے نالے نے یہ اُلٹا اثر دکھایا کہ وہ آخرِ شب خواب سے اُٹھ کر اپنے گھر سے غیر کے گھر چلے گئے۔ ۵۸

[2] یہ شعر اور شعر مابعد قطعہ بند ہیں۔ سوزِ دل کو موسمِ گرما سے اور بخت چمکنے کے قریب ساعت کو (جبکہ صبح وصل کی آمد آمد تھی) آخرِ شب سے تعبیر کیا ہے۔ [3] میری آہِ شبگیر کے شعلہ کا معجزہ دیکھو کہ اُس پر خلق کو مہینہ کے آغاز میں باوجود آخرِ شب چاند کا دھوکا ہونے لگا۔ عام قاعدہ تو یہ ہے کہ مہینہ کے آغاز میں چاند اوّل حصّۂ شب میں نظر آتا ہے مگر میری آہ نے (جو آخر حصّۂ شب میں بلند ہوئی) معجزہ کا اثر دکھایا۔ شکل کے اعتبار سے خود آہ کو فلک سے اور شعلۂ آہ کو چاند سے تشبیہ دی گئی۔ [4] رقیب یا معشوق کے یہاں آخرِ شب آفتاب کی سی جھلک تھی جس سے عاشق نے یہ نتیجہ نکالا کہ معشوق رقیب سے بے پردہ ملا ہوگا ورنہ جلوۂ خورشید کی کوئی وجہ نہ تھی اور انکار کے بعد ملا ہوگا ورنہ آخرِ شب کی بجائے اوّل شب ہی جلوہ خورشید نظر آتا۔ [5] رجعت قہقری: اُلٹے پاؤں واپس جانا۔ اصطلاحِ نجوم میں سیاروں کا اپنی سیرِ طبعی سے مشرق کی بجائے مغرب کی طرف واپس جانا رجعت کہلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخر حصّۂ شب میں چرخ و قمر کا (جو رجعت سے مستثنیٰ ہیں) اُلٹے پاؤں پھرنا اور اوّل حصّۂ شب کی طرف واپس جانا اس امر کی علامت ہے کہ معشوق کا قصد میرے یہاں صبحدم آنے کا تھا ورنہ یہ اُلٹے پیچ کیوں پڑتے صبح کے بجائے پھر شام کے آثار پیدا ہونا میری برگشتگیِ تقدیر کا کرشمہ ہے۔ [6] بڑھاپے کے قریب غفلت اور آخرت سے بیخبری اور بھی بڑھ گئی ہے جس طرح کہ صبح کے قریب زیادہ گہری نیند آتی ہے۔ بالوں کی سفیدی کو سفیدۂ سحر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۵۹

قتلِ [۱] عدو میں عذرِ نزاکت گراں ہے اب
مجھ میں ستم اُٹھانے کی طاقت کہاں ہے اب

وحشت سے میری سارے اَحبا چلے گئے
آنا ہے گر تو آؤ کہ خالی مکاں ہے اب

سجدے [۲] پہ سر قلم ہو دعا پر زباں کٹے
گویا نہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے اب

قتلِ [۳] عدو نے شوقِ شہادت مٹا دیا
لب پر ہمارے غلغلۂ الاماں ہے اب

پیری [۴] میں وصل غیرتِ یوسف ہوا نصیب
بختِ وفا مثالِ زلیخا جواں ہے اب

کھینچیں [۵] رقیب نے تری بے التفاتیاں
ناصح ہمارے حال پہ کچھ مہرباں ہے اب

رکھ [۶] لے سر اپنے زانوے نازک پہ شوق سے
تیرا مریضِ عشق بہت ناتواں ہے اب

چشمِ غضب سے مشورۂ قتل کھل گیا
جو بات دل میں تھی سو نظر سے عیاں ہے اب

بے [۷] طاقتی سے مجھ میں نہیں تابِ التفات
بیہودہ فکرِ جور و سرِ امتحاں ہے اب

وہ دن گئے کہ لاف و گزافِ جہاد تھا
مومن ہلاکِ خنجرِ نازِ بتاں ہے اب

۵۹ [۱] تم قتلِ عدو میں جو نزاکت کا عذر کرتے ہو یہ مجھکو گراں گزرتا ہے۔ کیونکہ اب شدت ضعف سے مجھ میں اس قسم کے ستم اُٹھانے کی طاقت نہیں رہی۔ عذرِ نزاکت کو ستم قرار دیا ہے اور نزاکت کی رعایت سے گراں کا لفظ استعمال کیا ہے۔ [۲] سجدہ و دعا اور زمین و آسمان میں لف و نشر مرتب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب ایسا انقلاب ہوگیا ہے کہ پہلے جن باتوں کی قدر ہوتی تھی اب تمھارے نزدیک وہی مستوجب عقوبت ٹھیرتی ہیں۔ [۳] یعنی اب اگر ہم قتل ہوئے تو بوالہوس کی ہمسری ٹھیرے گی جو ہمارے جذبۂ غیرت کے لیے باعث ننگ ہے۔ [۴] زلیخا کو پیری میں شباب عطا ہوا تھا اور حضرت یوسفؑ کی ملاقات نصیب ہوئی تھی۔ اسی طرح مجھے پیری میں وصالِ یار میسر ہوا۔ گویا اب میری وفا کا نصیب بھی زلیخا کی طرح جوان ہے۔ [۵] تیری نامہربانیاں سُنکر اب ناصح کو بھی میرے حال پر ترس آنے لگا ہے۔ [۶] تیرا مریضِ عشق اس قدر "ناتواں" ہوگیا ہے کہ اب اُسکا سر تیرے زانوے "نازک" پر بار نہیں ہوسکتا۔ [۷] اب ظلم کی فکر یا آزمایش کا خیال بیکار ہے۔ میری بے طاقتی اس درجے کو پہونچ گئی ہے کہ تمھارا انداز التفات ہی میرے ہلاک کرنے کو کافی ہے۔

۶۰ تم بھی[1] رہنے لگے خفا صاحب
کہیں سایہ مرا پڑا صاحب

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب
غیر اور تم بھلے بھلا صاحب

کیوں اُلجھتے ہو جنبشِ لب سے
خیر ہے مَیں نے کیا کہا صاحب

کیوں لگے دینے خطِ آزادی
کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب

ہائے ری چھیڑ رات سُن سُن کے
حال میرا کہا گیا صاحب

دمِ آخر بھی تم نہیں آتے
بندگی اب کہ مَیں چلا صاحب

ستم آزار و ظلم و جور و جفا
جو کیا سو بھلا کیا صاحب

ق
کس سے بگڑے تھے کس پہ غصّہ تھا
رات تم کس پہ تھے خفا صاحب

کس کو دیتے تھے گالیاں لاکھوں
کس کا شب ذکر خیر تھا صاحب

نام عشقِ بُتاں نہ لو مومن
کیجئے بس خدا خدا صاحب

۶۱ تھا
تھی وصل میں بھی فکر[2] جدائی تمام شب
وہ آئے تو بھی نیند نہ آئی تمام شب

واں طعنہ تیر بار یہاں شکوہ زخم ریز
باہم تھی کس مزے کی لڑائی تمام شب

رنگیں[3] ہے خون سر سے وہ ہاتھ آج کل جسے
جس ہاتھ میں وہ دست حنائی تمام شب

۶۰ [1] جس طرح میں اپنے سے خفا رہتا ہوں تم بھی مجھ سے خفا رہنے لگے۔ سایہ پڑنا = اثر پڑنا۔ صاحب مومن کی منظور نظر کا تخلص ہے۔ شاید اُسی کی طرف اشارہ ہے۔

۶۱ [2] تعجب ہے کہ اہل دہلی کے خلاف مومن اس جگہ فکر کو مونث باندھ گئے ہیں بعض نسخوں میں مذکر استعمال ہوا ہے

[3] کل رہے کا تعلق مصرع ثانی سے ہے یعنی میرا وہ ہاتھ جس میں کل تک محبوب کے دست حنائی رہے آج سر پھوڑنے کی وجہ سے سر کے خون سے رنگین ہے۔

تالو سے یاں زبان سحر تک نہیں لگی
تھا کس کو شغل نغمہ سرائی تمام شب

یکبار دیکھتے ہی مجھے غش جو آگیا
بھولے تھے وہ بھی ہوش ربائی تمام شب

مرجاتے کیوں نہ صبح کے ہوتے ہی ہجر میں
تکلیف کیسی کیسی اُٹھائی تمام شب

گرم[۱] جواب شکوۂ جورِ عدو رہا
اُس شعلہ خو نے جان جلائی تمام شب

کہتا[۲] ہے مہروش تمھیں کیوں غیر گر نہیں
دن بھر ہمیشہ وصل جدائی تمام شب

دھر[۳] پاؤں آستاں پہ کہ اس آرزو میں آہ
کی ہے کسی نے ناصیہ سائی تمام شب

مومن میں اپنے نالوں کے صدقے کہ کہتے ہیں
اُس کو بھی آج نیند نہ آئی تمام شب

ردیف الباء الفارسی

٦٢

یاں سے کیا دنیا سے اُٹھ جاؤں اگر رُکتے ہیں آپ
رُک گیا میرا بھی دم کیوں اس قدر رُکتے ہیں آپ

ضبط[۱] نالہ بوالہوس کا ننگ کے باعث نہیں
شرم سے آہ و فغانِ بے اثر رُکتے ہیں آپ

سنگ[۲] رہ ہے امتحاں تاثیرِ حُسن و عشق کا
ہم اِدھر رُکتے ہیں آپ اور وہ اُدھر رُکتے ہیں آپ

جذب دل نے غیر کے بھی کیا کہیں تاثیر کی
آج کیوں آتے ہوئے ہر گام پر رُکتے ہیں آپ

[۱] گرم شعلہ خو - جان جلانا رعایتہً شاعر نے استعمال کیے ہیں پہلے مصرعے میں توالی اضافات ہے - [۲] چونکہ مہر دن بھر ظاہر رہتا ہے اور شب کو غائب ہو جاتا ہے - اسلیے رقیب معشوق کو مہروش کہتا ہے - اس میں معشوق کی ہرجائی روش کی طرف اشارہ ہے کہ وہ شب میں کسی اور کے پاس جاتا ہے - شب خدا جانے کہاں وہ ستم ایجاد رہا - [۳] یعنی اپنے کاشانۂ ناز سے باہر آ-

٦٢ [۱] بوالہوس کا ضبطِ نالہ اس خیال سے نہیں کہ نالہ کرنا عشق کے لیے موجب ننگ ہے - بلکہ اُسکی آہ و فغاں بے اثر خود شرم نارسائی کے باعث رکی ہوئی ہے - [۲] ہمارے ارتباط باہمی میں تاثیرِ حُسن و عشق کا امتحان سد راہ ہے - یعنی اُدھر اُن کو یہ انتظار ہے کہ میری کشش حُسن سے عاشق خود کھنچ آئے - اِدھر میں یہ راہ دیکھ رہا ہوں کہ میرے جذب عشق سے وہ خود اس طرف متوجہ ہو -

جائیے پھر اسکے کوئے دلکشا میں کس لیے
حضرتِ دل سینے میں آٹھوں پہر رکتے ہیں آپ

سچ کہو ہے کس سے وعدہ آج جاؤ گے کہاں
خود بخود بیٹھے ہوئے کیوں اپنے گھر رکتے ہیں آپ

پاس تم کو ہی نہیں تو جائیے غیروں کے پاس
مَیں شہ رو کوں روکنے سے میرے گر رکتے ہیں آپ

وصلِ شیریں کی تمنّا کوہکن کو کیا کہوں
صحبتِ شاہاں سے اربابِ ہنر رکتے ہیں آپ

دل[۵۰] کسی بُت کو دیا اے حضرتِ مومن کہیں
وعظ میں کیوں برہمن کو دیکھکر رکتے ہیں آپ

ردیف التاء

۶۳

کیا دیکھتا[۵۱] خوشی سے ہے غیروں کے گھر بسنت
پھولی ہے یاں کچھ اور ہی لے بے خبر بسنت

واں تو ہے زرد پوش یہاں مَیں ہوں زرد رنگ
واں تیرے گھر بسنت ہے یاں میرے گھر بسنت

یہ کس کے زرد چیرہ[۵۲] کا اب دھیان بندھ گیا
میری نظر میں پھرتی ہے آٹھوں پہر بسنت

آوارگی ہے باعثِ نشو و نما کہ دیکھ
سر سبز[۵۳] جب ہوئی کہ پھری دربدر بسنت

ہم قیدیوں کو چاہئیں سونے کی بیڑیاں
اے چارہ گر جہان میں ہے جلوہ گر بسنت

اُس رشکِ گُل کے ہاتھ تلک کب پہونچ سکے
سرسوں[۵۴] ہتیلی پر نہ جمائے اگر بسنت

۵۰ مومن مصروفِ وعظ ہیں کہ برہمن آگیا جس کو دیکھکر مومن خاموش ہوگئے۔ اس خیال سے کہ مبادا وعظ میں بتوں کی مذمت آجائے اور برہمن کے ذریعہ سے بتوں کو خبر پہونچے۔

۵۱ بسنت پھولنا = نیا شگوفہ کھلنا ۔ ۵۲ چیرہ = دستار رنگین و منقش ۔ ۵۳ قاعدہ ہے کہ لوگ بسنت میں نئی بالی مبارکباد کے طور پر گھر گھر لے جاتے ہیں۔ ۵۴ ہتیلی پر سرسوں جمانا = کوئی مشکل کام جلد انجام دینا۔ واضح رہے کہ بسنت سرسوں پھولنے کا زمانہ ہے۔

کس کو بھلا خلل یرقاں[1] کا ہے اے طبیب
پھولی ہے باغِ عشق کی یاں آنکر بسنت

ہے اوّلِ بہار سیہ مستیوں کا جوش
دکھلائے ہے کچھ ایکی بہارِ دگر بسنت

مومن[2] یہ کیا کہا کہ ہے رسمِ ہنود اب
کاہیکو لائیں گے وہ مری گور پر بسنت

۶۴
سودا تھا بلا کے جوش پر رات
بستر پہ بچھائے نیشتر رات

بگڑے تھے یہاں وہ آنکر رات
بے طور بنی تھی جان پر رات

ہم تا سحر آپ میں نہیں تھے
کیا جانے رہے وہ کسکے گھر رات

افسانہ[1] سمجھ کے سو گئے وہ
کام آئی فغانِ بے اثر رات

آئینہ[2] میں ہو نہ مومِ جادو
سوتے نہیں اب وہ تا سحر رات

تارے آنکھیں جھپک رہے تھے
تھا بام پہ کون جلوہ گر رات

ق
اندھیر پڑا زمانے میں ہائے
نہ دن کو ہے مہر نہ قمر رات

اس لیل و نہار غم نے مارا
ہے روز سیہ سیاہ تر رات

ق
کیا پوچھو ہو منکر و نکیر آہ
بگڑے جو وہ طعنِ غیر پر رات

[1] یرقان = ایک مرض جس میں چہرہ اور جسم زرد ہو جاتا ہے۔ [2] بعض جگہ مسلمانوں میں رواج ہے کہ قبروں پر بسنت مناتے ہیں۔ حالانکہ بسنت کی رسم دراصل ہنود سے لیگئی ہے۔

۶۴ [1] ہماری فغاں بے اثر نے اتنا اثر تو کیا وہ اُسکو افسانہ سمجھ کے سوگئے۔ [2] قاعدہ ہے کہ جب جادو جگانا ہوتا ہے تو اُس میں مجملہ اور چیزوں کے موم بھی استعمال کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ غالباً معشوق کے آئینہ میں جادو کا موم لگا ہوا ہے جسکا اثر یہ ہے کہ اب اُسے رات بھر صبح تک نیند نہیں آتی۔ (یا وہ دن رات محوِ آرایش رہتا ہے) آئینہ کو جمانے کی غرض سے موم لگانے کا عام رواج تھا۔

یہ بات بڑھی کہ مر گئے ہم ۔۔۔ موت آئی تھی قصہ مختصرات

اُس[۵۳] گھر میں ہے عیش خلد مومن
کیا جانے کہاں ہے دن کدھر رات

۶۵

کرتے[۱] ہیں عدو وصل میں حرماں کی شکایت ۔۔۔ تھی بار سے موثر غمِ ہجراں کی شکایت
یوں کرتے تھے وہ کب دلِ نالاں کی شکایت ۔۔۔ کی ہوگی فلک نے مرے افغاں کی شکایت
اے پردہ نشیں چاہوں اُٹھا دے کہ نہ جل جائے ۔۔۔ کرتا ہوں میں سوزِ غمِ پنہاں کی شکایت
ہم خاک میں بھی مل گئے لیکن نہ ملے وہ ۔۔۔ دل ہی میں رہی رنجشِ جاناں کی شکایت
پامالِ ستم ہے دلِ ناکام کے ہاتھوں ۔۔۔ کس مُنہ سے کروں ولولۂ جاں کی شکایت
صد شکر وہ اُلجھی ہوئی تقریر نہ سمجھا ۔۔۔ تھی برہمیِ زلفِ پریشاں کی شکایت
ہے کس لیے مجھ سے اُسے دل دینے کا شکوہ ۔۔۔ کرتا ہے جہاں میں کوئی احساں کی شکایت
کیا باب[۲] اجابت پہ گذر ہووے دعا کا ۔۔۔ سُنتا ہے اثر کب ترے درباں کی شکایت
اے شور[۳] جنوں ڈر ہے زباں بند نہ ہو جائے ۔۔۔ گر آئے لبوں پہ مرے زنداں کی شکایت

۵۳ خلد میں دن رات کا امتیاز نہ ہوگا۔ کاشانۂ یار میں بھی فرطِ طرب یا محویت میں عاشق کو دن رات کی تمیز نہیں اسلیے اس کو خلد قرار دیتا ہے۔

۶۵ ۱ رقیب وصل میں بھی بے التفاتی یار کے شاکی ہیں۔ میں نے جو غم ہجر کی شکایت کی تھی شاید اُسی کا یہ اثر ہوا۔ ۲ میں تیرے درباں کی بے رُخی کی شکایت اور تیرے در تک رسائی کی دعا کیا کروں۔ کیونکہ اثر سے یہ اُمید نہیں کہ تیرے درباں کا شکوہ سُنے۔ ایسی صورت میں دعا کا مقرونِ اجابت ہونا معلوم۔
۳ شورِ جنوں میں آدمی بکا کرتا ہے۔ شاعر شورِ جنوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ زنداں کی پابندیاں اس حدتک پہونچ گئی ہیں کہ اگر مصائب زنداں کی شکایت کرونگا تو خوف ہے کہ مبادا زباں بندی ہو جاسے اور بولنے کی آزادی بھی جاتی رہے۔

کیوں ۵۴ طعنہ سمجھکر ہے گلہ شکر جفا کا	جانے دو کہ بیجا ہے پشیماں کی شکایت
کس ۵۵ واسطے اے شمع زباں کاٹتے ہیں لوگ	کیا تو نے بھی کی تھی شبِ ہجراں کی شکایت

حورانِ بہشتی کو بتوں کا سا نہ پایا
مومن مجھے کیونکر نہ ہو ایماں کی شکایت

ردیف الثاء

۶۶

اظہار شوق ۵۶ شکوہ اثر اُس سے تھا عبث	یعنی کہا کہ مرتے ہیں تم پر کہا عبث
میں ایک سخت جان ہوں گردونِ سے پوچھ لو	تم کو خیال ہے مرے آزار کا عبث
تھا ۵۷ ہم پہ لطف تو پئے افزائشِ الم	صد شکر غیر ہو گئے اُس سے خفا عبث
اے مہروش یہ حسن تو ہرگز نہ چھپ سکے	چلون تو کیا ہے پردے کا بھی چھوڑنا عبث
اُمید ۵۸ وعدہ بھی تو نہیں روزِ ہجر میں	ہم سے وفائے زندگیِ بیوفا عبث
اس ۵۹ ضعف میں تو سینے سے آتا ہے لب تلک	کہتے ہیں اپنے نالے کو ہم نارسا عبث

۵۴ میں تمھاری بیداد کا شکر کرتا ہوں اور تم طعنہ سمجھکر گلہ کرتے ہو - جانے دو میں اپنے کیے پر پشیمان ہوں جو شخص پشیمان ہو جاے اُسکی شکایت نہیں کیا کرتے - ۵۵ گلگیر سے شمع کے کترنے کو زبان کاٹنا قرار دیا ہے-
۶۶ ۵۶ شوق شکوہ اثر = وہ شوق جس کا اثر شکوہ کا سا تھا - مومن کی مخصوص ترکیب ہے -
۵۷ معشوق نے ہم پر جو لطف کیا تو اُس کا مقصد یہ تھا کہ ستم کی تکلیف کا احساس اور زیادہ ہو مگر صد شکر کہ رقیبوں نے اُس کو حقیقی التفات پر محمول کیا اور معشوق سے ناحق بگڑ بیٹھے - ۵۸ روز ہجر میں زندگیِ بیوفا نے وفا بھی کی تو بیکار - کیونکہ معشوق سے اُمید وعدہ بھی تو نہیں جس پر زندہ رہنا گوارا ہو -
۵۹ شاعر نے شعر میں طنز کا پہلو مدِ نظر رکھا ہے اور لفظ نارسا میں ایہام کام لیا ہے یعنی جب نالہ با وجود ضعف سینے سے نکلکر لب تک پہونچ جاتا ہے تو پھر اُسکو نارسا کہنا غلط ہے - گویا میرے حق میں اُسکا رسا ہونا اسی قدر ہے مرزا غالب نے بھی یہی مضمون باندھا ہے - دل میں آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے + اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں -

کیا ٨ اپنے دودِ دل کا بھی شکوہ نہ کیجئے — اُلجھے ہے بات بات پہ زلفِ دوتا عبث
گو چارہ ساز حضرتِ عیسیٰ ہی کیوں نہ ہوں — گر دردِ عشق ہے تو اُمیدِ شفا عبث
جس ٩ غم میں مر رہے تھے وہ غم ہی نہیں رہا — دیکھا — افسوس مر کے سمجھے کہ جینا ہے کیا عبث
اے روزِ حشر کچھ شبِ ہجراں بھی کم نہیں — بدنام ہو جہان میں تیری بلا عبث

ہرگز نہ رام وہ صنمِ سنگدل ہوا
مومن ہزار حیف کہ ایماں گیا عبث

ردیف الجیم

٦٧

ہو نہ ١ بیتاب ادا تمہاری آج — ناز کرتی ہے بیقراری آج
اُڑ گیا ٢ چرخ پر غبار اپنا — ہو گئی خاک خاکساری آج
نزع ٣ ہے اور روز وعدۂ وصل — ہے بہر طور دم شماری آج
مانعِ قتل کیوں ہوا دشمن — جان ہی جائے گی ہماری آج
تیرے آتے ہی دم میں دم آیا — ہو گئی یاس اُمیدواری آج
کوئی بھینچے ہے دل کو پہلو میں — کس نے کی اُس سے ہمکناری آج

٨ میں اپنے دودِ دل (آہ) کی شکایت کرتا ہوں۔ زلف کا گلہ نہیں کرتا۔ پھر وہ کیوں برہم ہوتی ہے۔ دود اور زلف کی مشابہت ظاہر ہے۔ ٩ زندگی بھر جس غم میں مرتے رہے وہ غم اب نہیں رہا۔ افسوس مر کر یہ تجربہ ہوا کہ زندگی بیکار تھی۔ اسلئے کہ غم جو حاصلِ زندگی تھا وہی جاتا رہا۔

٦٧ ١ کہیں تمہاری اداؤں میں (میری بیقراری کے اثر سے) بیتابی کی شان نہ پیدا ہو گئی ہو جو آج میری بیقراری اس قدر نازاں ہے۔ ٢ مجھے اپنی خاکساری پر ناز تھا مگر مرنے کے بعد جب میرا غبار اُڑ کر آسماں پر گیا تو دعوائے خاکساری باطل ہو گیا۔ ٣ وعدہ کے انتظار نے اس قدر طول کھینچا کہ نزع کی ساعت آگئی۔ اب تک تو ہم وعدہ کی وجہ سے دم شماری کر رہے تھے۔ اب نزع کے باعث دم شماری کر رہے ہیں۔

اُسکے شکوہ سے ہے اثر ظاہر
کچھ تو کہتی ہے آہ وزاری آج

اِک نئی آرزو کا خون ہوا
ہم ہیں اور تازہ سوگواری آج

چھوٹ گئے مر کے نیشِ ہجراں سے
کام آیا ہے زخم کاری آج

بیکسی کیوں ہے نعش پر مجمع
کیا ہوئی تو مری پیاری آج

کھولے حضرت نصیحت اے ناصح
ہے کسی کی تو یادگاری آج

مومن اُس بُت کو دیکھ آہ بھری
کیا ہوا لافِ دینداری آج

ردیف الجیم الفارسی

۶۸

پنجۂ شانہ سے تو زلف گرہ گیر نہ کھینچ
دل سے دیوانہ کو مت چھیڑ یہ زنجیر نہ کھینچ

ہم تو بچتے نہیں تا شام وہ آئے بھی تو کیا
اے دعائے سحری منتِ تاثیر نہ کھینچ

اے ستم پیشہ مرے بعد کہاں نشۂ عشق
دیکھ خمیازۂ حسرت ہے یہ شمشیر نہ کھینچ

ہے دوا میری وہی سو نہیں ممکن کہ ملے
چارہ گر رنج و مصیبت پئے تدبیر نہ کھینچ

سلہ میری آہ وزاری نے کچھ تو تاثیر کی ورنہ معشوق شکوہ کیوں کرتا۔ اسی سے آہ وزاری کا اثر ظاہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق نے میری فریاد و فغاں پر برہم ہوکر اُلٹی شکایت کی۔ اتنا اثر تو ضرور ہوا (اگر اسکو اثر کہہ سکتے ہیں) ورنہ حقیقت میں فریاد کا موثر ہونا معلوم۔ سلہ مرنے کے بعد نعش پر تماشائیوں کا مجمع ہے جس پر عاشق بیکسی سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ اے بیکسی! عمر بھر تیری بدولت میں اکیلا رہا آج تو کہاں ہے۔ تیرا تقاضا تو یہ تھا کہ آج میری نعش بھی تنہا رہتی۔ اسی سے ملتا ہوا مضمون مومن نے فارسی میں ادا کیا ہے ۔

بیکسی بنگر کہ بر تابوت من + چشم گریانست خاص و عام را

۶۸ سلہ دلِ عاشق کو جو زلف میں بندھا ہوا ہے دیوانہ اور زلف کو اُسکی زنجیر قرار دیا ہے۔ سلہ میرے بعد کوئی ایسا نہیں جو نشۂ عشق سے سرشار ہو۔ اسلیے تو مجھے قتل کرکے پچھتائے گا گویا یہ شمشیر کا کھینچنا نہیں خمیازۂ حسرت کھینچنا ہے۔ شمشیر کو خم کے لحاظ سے خمیازہ (انگڑائی) سے تشبیہ دی ہے۔ سلہ وہی = معشوق۔

میں[۵۹] نے کہا تھا مصور کہ وہ ہے شعلہ عذار / دیکھ تو صفحۂ قرطاس پہ تصویر نہ کھینچ

ہم جوانمرد محبت بھی سمجھ لیں گے بھلا / اپنی ایذا سے تو ہاتھ لے فلکِ پیر نہ کھینچ

روزِ غم کون بھلا اُن کے ہوتا ہے شریک / انتظارِ اثر اے نالۂ شبگیر نہ کھینچ

اتنی فرصت دے ستمگر کہ پہونچ جائے اجل / دم کے دم اور بھی سینے سے مرے تیر نہ کھینچ

مومن[۶۰] آ کیش محبت میں کہ ہے سب جائز
حسرتِ حرمتِ صہبا و مزامیر نہ کھینچ

ردیف الحاء

۶۹

گر[۶۱] چند سے اور یہ ہی رہی یار کی طرح / ہم بھی بنیں گے بوالہوس اغیار کی طرح

آواز[۶۲] گنبد اُس سے شکایت عدو کی تھی / ناچار چپ ہیں صورتِ دیوار کی طرح

سونے دیا نہ اُس نے شبِ وصل میں بھی کیا / ہم جاگتے ہیں طالعِ بیدار کی طرح

پھرتا ہے بہر کشتنِ عشاق کو بکو / گردش میں ہے وہ چرخِ ستمگار کی طرح

[۵۹] شعلہ عذار = شعلہ رخسار۔ یعنی میں نے پہلے ہی کہدیا تھا کہ اُسکی شعلہ رخساری کے اثر سے تصویر کا کاغذ جل جائے گا۔ [۶۰] صہبا = شراب۔ مزامیر = (مزمار کی جمع) بانسری۔ ساز موسیقی۔ اے مومن تو شراب اور موسیقی کے حرام ہونے کی تکلیف کیوں اُٹھاتا ہے۔ مذہب عشق اختیار کر اُس میں یہ سب چیزیں جائز ہیں۔

[۶۱] اغیار میں (جو معشوق کے مورد التفات ہیں) اور ہم میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ کہ وہ بوالہوس ہیں ہم عاشق صادق۔ آئندہ سے ہم بھی بوالہوس بنیں گے تاکہ اسی صورت سے اُسکی عنایت کے مستحق ٹھہریں۔ ۶۹
پہلے مصرع میں طرح بمعنی ادا ہے۔ [۶۲] آواز گنبد کی بازگشت مشہور ہے یعنی یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے میں نے اُس سے عدو کی شکایت کی جس پر وہ اُلٹی میری شکایت کرنے لگا۔ ناچار مجھے صورت دیوار کی طرح خاموشی اختیار کرنی پڑی۔

ہوتے ہیں پائمال گُل اے بادِ نو بہار
کس سے اُڑائی تو نے یہ رفتار کی طرح

چینِ جبیں بلاؤ نگاہِ غضب ستم
کرتی ہے قتل اُس بُتِ خونخوار کی طرح

خونریز رشک غیر کی بھی ہم کو ہو گئی
اب اور کچھ نکالئے آزار کی طرح

ہوتے ہیں قتل غیر[٣٩] اب اِدھر ہے نگاہ لطف
ارماں مرے نکلتے ہیں تلوار کی طرح

کرتا ہے ابر اپنا لہو پانی ایک کیوں
کب رو سکے گا دیدۂ خونبار کی طرح

بس نازکی ضعف کہ گلگشت باغ میں
چُبھتے ہیں میرے پاؤں میں گُلزار کی طرح

دِل[٤٠] میں ہوائے بُتکدہ ظاہر میں کیا حصول
رہنا حرم میں مومنِ مکّار کی طرح

۷۰ رویا کرینگے آپ بھی پہروں اسی طرح
اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح

آتا نہیں ہے وہ تو کسی ڈھب سے داؤ میں
بنتی نہیں ہے ملنے کی اُسکے کوئی طرح

تشبیہ کس سے دوں کہ طرحدار کی مرے
سب سے نرالی وضع ہے سب سے نئی طرح

مرچاٹ[٤١] کہیں کہ تو غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے
کہتے تو ہیں بھلے کی وہ لیکن بُری طرح

نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں
کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

لگتی ہیں گالیاں بھی ترے مُنہ سے کیا بھلی
قربان تیرے پھر مجھے کہہ لے اسی طرح

[٣٩] اب رقیب قتل ہوتے ہیں اور ہماری طرف دوست کی نگاہ لُطف ہے اور ہمارے ارمان اس طرح نکلتے ہیں جیسے رقیبوں پر تلوار نکلتی ہے۔ [٤٠] وضاحت مطلب کے لیے اس شعر کی ترتیب نثر کافی ہے یعنی دل میں ہوائے بتکدہ (اور) ظاہر میں مومن مکّار کی طرح حرم میں رہنا (آخر اس سے کیا حصول
۷۰ [٤١] مرکر غم ہجراں سے چھوٹ جانا میرے حق میں بھلائی ہے۔ وہ بھی یہی بات کہتے ہیں مگر اس بُرے انداز سے کہ سراسر دشمنی مترشح ہوتی ہے۔

پامال ہم نہ ہوتے فقط جورِ چرخ سے	آئی ہماری جان پہ آفت کئی طرح[۱]
نے جائے واں بنے ہے نہ بن جائے چین ہے	کیا کیجئے ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح
معشوق اور بھی ہیں بتا دے جہان میں	کرتا ہے کون ظلم کسی پر تری طرح

ہوں جاں بلبِ بتانِ ستمگر کے ہاتھ سے
کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومنؔ اسی طرح

ردیف الخاء

۱۷

عدو[۱] نے دیکھے کہاں اشکِ چشمِ گریاں سُرخ	نہ آستیں ہے نہ رومال ہے نہ داماں سُرخ
نمود[۲] حُسنِ خطِ یار سے نہ ہو کیونکر	بہار ہے جو تہِ سبزہ ہو نمایاں سُرخ
تمہارے[۳] دشنۂ دستِ خفہ نے کام کیا	ہے زرد رنگِ گلو حلقۂ گریباں سُرخ
زبس فگار ہوئے پاؤں خار و خارا[۴] سے	تمام دشت ہے جوں وسعتِ گلستاں سُرخ
ملی[۵] ہیں غیر نے پائے نگار سے آنکھیں	سرشکِ خوں سے نہیں پنجہ ہائے مژگاں سُرخ

۱؎ کئی طرح یعنی بیدادِ یار ۔ ظلم رقیب وغیرہ ۔

۷۱ ۱؎ یہ غم عدو کو کہاں نصیب ۔ ۲؎ سبز (مثلاً پتوں) کے نیچے سے سُرخ (پھولوں) کا نمایاں ہونا بہار دیتا ہے ۔ پھر خط (سبز) سے محبوب (کے روئے رنگیں) کا حُسن کیوں نہ ظاہر ہو۔

۳؎ دِشنہ = خنجر ۔ دستِ خفہ = وہ ہاتھ جس سے گلا گھونٹا جائے ۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے گلا گھونٹ کر اپنا کام تمام کیا اور اپنے ہاتھ سے خنجر کا کام لیا ۔ جس کے اثر سے (ضعف کے باعث) رنگِ گلو زرد ہے اور گلے کے نشان سُرخ ہیں ۔ ۴؎ خارا = سنگِ سخت ۔

۵؎ رقیب کے پنجہ ہائے مژگاں (پلکیں) اشک خون سے سرخ نہیں بلکہ اس نے معشوق کے (حنائی) پاؤں سے آنکھیں ملی ہیں جس کا یہ اثر ہے ۔

آج

گمانِ قہر سے اپنا تو رنگ زرد ہے اور
سیاہ مستیِ مے سے ہے چشمِ جاناں سرخ

موا ہوں عشق میں گل پیرہن کے لازم ہے
مرا کفن بھی ہو جوں جامۂ شہیداں سرخ

سرایتیں ہیں یہ طوفانِ اشکِ خونیں کی
کہ ایک ایک شجر ہے برنگِ[۶] مرجاں سرخ

کرم جو غیر پہ دیکھا لہو اتر آیا
نہ پوچھ کیوں[۷] تری آنکھیں ہیں بنکے ناداں سرخ

نویدِ مرگ انھیں جو ہیں زخمیِ لب یار
کہ رنگ پان سے ہوئے اور لعلِ خنداں[۸] سرخ

نظارۂ[۹] رخِ مردم سے کیوں نہ غم ہو کہ تھا
ہمارا رنگ بھی پیشِ وردِ ہجراں سرخ

ہمارے[۱۰] خون کا دھبہ نہ جائے حشر تلک
وہ لاکھ بدلے قبا پر رہیگا داماں سرخ

غریقِ[۱۱] گریۂ خونیں رہا نہ کر مومن
لباس یعنی پہنتے نہیں مسلماں سرخ

ردیف الدال

۷۲

ہم دامِ محبت سے ادھر چھوٹے ادھر بند
پرواز بھی کی آہ تو جوں طائرِ پر بند

دیکھا نہ[۱۲] کسی کی طرف ایماے حیا سے
جادو کو کیا نرگسِ جادو نے نظر بند

یہ مشتِ پرِ سوختہ پھونکیں گے قفس کو
تو ساتھ کسی کے مجھے صیاد نہ کر بند

[۶] مرجاں = مونگا۔ [۷] مصرعِ ثانی میں تعقید ہے۔ ترتیب نثر یوں ہے۔ ناداں بنکے نہ پوچھ (کہ) تیری آنکھیں کیوں سرخ ہیں۔ [۸] لبِ یار کو سرخی اور خندہ کے اعتبار سے لعلِ خنداں کہا ہے۔
[۹] اب ہجر کے ہاتھوں ہمارا سرخ رنگ زرد ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تندرست لوگوں کے چہروں کو دیکھکر ہمیں غم ہوتا ہے۔ [۱۰] وہ لاکھ قبا بدلے مگر ہمارے خون کا داغ (مجازی معنی میں) نہ جائیگا۔ اس لیے دامن ہمیشہ سرخ رہیگا۔ [۱۱] شرعاً سرخ لباس ممنوع ہے اور ظاہر ہے کہ گریہ خونیں میں غرق رہنے سے لباس سرخ ہو جائے گا۔
[۱۲] ایما = اشارہ۔ نرگسِ جادو = مراد چشمِ معشوق۔ یعنی آنکھ کا سحر آنکھ ہی میں بند رہا۔ ۷۴

وہ آخرِ شب آئے ہیں کچھ بات تو کرلوں
کیا ٹھہرے ؎۲ دلِ بوالہوساں میں تری اُلفت

جا ؎۳ سکتے نہیں جاتے ہیں اُس کو میں جو ناصح
شاید ؎۴ کہیں تو نے بھی اُسے خواب میں دیکھا

اے ؎۵ سوزشِ سینہ مجھے وہ سینہ دکھا دے

کر اپنی زباں دم کے دم لے مرغِ سحر بند
شیشہ میں پری کرتے ہیں اربابِ ہنر بند

چھُٹ جائینگے قصے سے کیا تو نے اگر بند
آنکھیں تری اے بخت ہیں کیوں آٹھ پہر بند

کھولے تری گرمی سے وہ گھبرا کے مگر بند

کیا حضرتِ مومن کہیں کعبے کو سدھارے
سنسان ہے گھر کس لئے کیوں آج ہے در بند

۴۳

غربت میں گُل کھلائے ہے کیا کیا وطن کی یاد
گلگوں قبا پہن کے کیا قتل غیر کو

از ؎۱ خویش رفتگی ہے عناں کش زماں زماں
تو ؎۲ آب زن نہ ہووے تو کیا جانے کیا کرے

جیسے قفس میں مُرغِ چمن کو چمن کی یاد
کیا آئی اپنے کشتۂ خونیں کفن کی یاد

دکھلائیگی عدم ہی کہیں اُس دہن کی یاد
دشمن کے دل سے میرے دمِ شعلہ زن کی یاد

؎۲ رقیبوں کے دل میں تیری محبت نہیں ٹھہر سکتی اسلیے کہ شیشہ میں پری بند کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ صرف اہل ہنر کرسکتے ہیں اور رقیب ٹھہرے بے ہنر (یہ مومن کے مسلمات میں سے ہے) دل کو شیشہ اور الفت کو پری سے تعبیر کیا ہے۔ ؎۳ ناصح! جب ہم دوست کی گلی میں جانے کا قصد کرتے ہیں تو رسائی نہیں ہوتی۔ اگر تو نے ہمیں قید کیا تو اس کشمکش سے چھوٹ جائیں گے۔ اور طبیعت یکسو ہو جائے گی۔ ؎۴ شاعر نے اپنے خفتہ بخت ہونے کی نئی توجیہ کی ہے۔ وہ اپنے بخت سے کہتا ہے کہ تو نے شاید محبوب کو خواب میں دیکھا ہے جو آٹھ پہر اس تمنا میں تیری آنکھیں بند رہتی ہیں کہ وہ جلوہ پھر نظر آجائے۔ بخت کے سونے سے مراد بدقسمتی ہے۔
؎۵ مومن اپنے سینہ کی جلن سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اپنی گرمی کا اثر دکھا۔ تاکہ اُسکی وجہ سے محبوب گھبرا کر بند قبا کھول ڈالے اور اُس کا سینہ نظر آجائے۔
۴۴ ؎۱ دہن یار کی یاد میں جو از خود رفتگی ہے وہ مجھے بار بار عدم کی طرف کھینچتی ہے۔ یہ واقعی کسی روز عدم ہی میں پہونچا کر رہیگی۔ دہن کو عدم سے نسبت دینا شعرا کے یہاں عام ہے۔ ؎۲ اگر تو آب زن نہ ہو تو میری آہِ شعلہ زن کی یاد دشمن کے دل کو جلا کر چھوڑ دے۔ آب زن = پانی چھڑکنے والا۔ بجھانے والا۔ یہاں تسکین دینے والا یا مہربانی کرنے والا مُراد ہے۔

اے محتسب نہ توڑ تو شیشہ کو دیکھنا — آتی ہے مجھکو سنگدلِ دلشکن کی یاد

تا شکوہ غیر کا نہ کروں مجھ سے کہتے ہیں — کیوں سرگذشت تم کو بھی ہے کوہکن کی یاد

پھر پیرہن کے ہوتے ہیں ٹکڑے برنگِ گُل — پھر مجھکو آگئی کسی گُل پیرہن کی یاد

ایسے ہی روز گر ستم نو بنو رہے — تم کو بھلا رہے گی سپہرِ کہن کی یاد

ہے کفر و بدعت ایک نہیں تارِ سبحہ سے — زنّار مومن آئے ہے کیوں برہمن کی یاد

ردیف الذال

۴۷

نامہ رونے میں جو لکھا تو یہ بھیگا کاغذ — کہ بنا ہم گہرِ صفحۂ دریا کاغذ

اُس کے کوچے سے چلا آئے ہے اُڑتا کاغذ — پھاڑ کر پھینک دیا کیا مرے خط کا کاغذ

کیا جواب آئے کہ کثرت سے خطوں کی میرے — کیمیا یاب سیاہی بنی عنقا کاغذ

۳۱ تیرے شیشہ توڑنے سے مجھے بُت سنگدل کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جس نے اسی طرح میرا شیشۂ دل توڑ دیا تھا
۳۲ خسرو وصل شیریں سے کامران تھا اور کوہکن محروم۔ معشوق مجھکو سرگذشت کوہکن یاد دلاکر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ یہ ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے۔ پھر شکوہ رقیب بے سود۔ ۳۳ اگر چرخ کہن کے ستم نو بنو ہم پر اسی طرح روزجاری رہے تو ہمکو تمھارے ظلموں کی یاد کیونکر رہ سکتی ہے۔ یعنی آسمان کے مقابلہ میں تمھاری بیداد کبھی فراموش ہوجائیگی اور اس میں تمھاری توہین ہے۔ اسلئے تمھیں چاہئے کہ عاشق کو آسمان کے تیرِ ستم کا ہدف بننے سے بچاؤ۔ نو اور کہن میں تضاد ہے۔ ۳۴ شعر میں تعقید ہے۔ اصل میں بندش یوں ہے۔ کفر و بدعت ایک ہے۔ ورنہ اے مومن تارِ سبحہ سے برہمن کی زنّار کیوں یاد آئے ہے۔ واضح رہے کہ سبحہ (تسبیح) بدعت ہے اور زنّار کفر ہے اور تارِ سبحہ کی مشابہت زنّار برہمن سے ظاہر ہے۔
۳۵ ہم گہر = ہم اصل۔

سب نوشتے ترے اغیار کو دکھلاؤں گا
جانتا ہے تو مرے پاس ہیں کیا کیا کاغذ

لکھ کے بدمستیِ غم تا کہ وہ میکش پڑھ لے[۱]
باندھ دیتا ہوں سرِ شیشۂ صہبا کاغذ

مشق کرتے ہیں وہ کیوں لفظِ نظربازی کی[۲]
پردۂ دیدۂ مشتاق ہے یہ یا کاغذ

رنگ اُڑ جانے کا احوال اُسے لکھنا ہے
زردیِ رُخ سے زرافشاں میں کروں گا کاغذ

وصف لکھوں میں تری آنکھ کے ڈوروں کا اگر
رگِ گل خامہ دے اور نرگسِ شہلا[۳] کاغذ

ہو گیا اس لبِ لعلِ دُرِ دنداں کے سبب
غیرتِ نسخۂ اکسیر مسی کا کاغذ

ضد یہ ہے خط سے مرے تاؤ ہزاروں کھائے
دستِ اغیار میں بھی گر کبھی دیکھا کاغذ

یاں تلک تو ہوں سیہ کار کوئی پڑھ نہ سکا
حشر میں جب مرے اعمال کا کھولا کاغذ

قبر میں چھوٹے عذابِ دلِ بیتاب سے ہم
نام جب لکھ کے ترا سینہ پہ رکھا کاغذ

تو غزل سنج ہے یا مرثیہ خواں اے مومن
رو دیا جس نے کہ دیکھا ترا لکھا کاغذ

۱؎ میں اپنی بدمستیِ غم لکھ کر کاغذ کو شیشۂ شراب پر باندھ دیتا ہوں تاکہ اُس میکش (معشوق) کی نظر پڑے اور وہ میری حالت سے آگاہ ہو۔

۲؎ معشوق کاغذ پر لفظ نظربازی کی مشق کرتا ہے گویا اُس نے کاغذ کو عاشق کا پردۂ چشم قرار دیا ہے جس پر نظربازی کی مشق کیجاتی ہے (مشق نظربازی سے مراد اس صورت میں عاشق سے آنکھیں لڑانا ہے)۔

۳؎ نرگسِ شہلا = وہ نرگس جس کا پھول سیاہی مائل ہوتا ہے اور جو چشمِ انسان سے مشابہ ہے بخلاف نرگسِ عبہر جس کا پھول زرد ہوتا ہے۔

ردیف الراء

۷۵
نہ کیونکر بس مر جاؤں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر — وہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر
کہاں لخت جگر ہیں سیل گریہ میں چڑھا دریا — چلے آتے ہیں یہ ڈوبے ہوؤں کے لاشے بہہ بہہ کر
بہار باغ دو دن ہے غنیمت جان لے بلبل — ذرا ہنس بول لے ہو زمزمہ پرداز چہ چہ کر
نوید[1] اے دل کہ رشک غیر سے چھوٹے کہ ہم نے — ستم کا کر دیا خوگر جفا و جور سہہ سہہ کر
ستم[2] ہے شدت گریہ سرایت خوں نے کی پر کی — رکھے رومال چشم خونفشاں پر لاکھ تہہ کر
لگی ہچکی ہے سر زانوئے غم پر ہے کہ یاد آیا — کسی کا ہاتھ ہر دم مارنا زانو پہ تہہ کر

خدا کو مان اپنی راہ لے کعبہ کو جا مومن
صنم خانہ میں کیا لیوے گا اے گم گشتہ رہ کر

۷۶
اے تند تو آجا کہیں تیغا کمر سے باندھکر — کن مدتوں سے ہم کفن پھرتے ہیں سر سے باندھکر
یا وہ ڈبوئیگا زمیں یا ہم ڈبوئیں گے فلک — آجائے تو روتے ہیں ہم شرط ابر تر سے باندھکر
خط[1] میں تو لکھ سکتا نہیں احوال سوز دل اُسے — پر بھیجدوں جی میں ہے پروانے کے پر سے باندھکر
دشمن[2] سگ کوچہ نہ ہو اُس شوخ آہو چشم کا — نادم ہوں کعب گرگ پائے نامہ بر سے باندھکر

۷۵ سلہ ہم نے ظلم سہہ سہہ کر معشوق کو ظلم کرنے کا خوگر بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غیر پر بھی ظلم و جفا کرے گا اور غیر کی ثابت قدمی معلوم۔ بالآخر وہ (غیر) دعوائے الفت سے کنارہ کرے گا اور ہمیں رشک سے نجات ملیگی۔ اُسے ہم نے کا تعلق مصرع دوم سے ہے۔ سلہ میرے گریہ خونیں کی شدت غضب ہے جسکی وجہ سے خون رومال کی تہوں میں سرایت کر گیا اور راز عشق رفتہ رفتہ افشا ہو گیا۔ [illegible]
۷۶ سلہ مطلب یہ ہے کہ میں خط میں تو معشوق کو احوال سوز دل لکھ نہیں سکتا اسلئے خط اُسکے اثر سے جل جائے گا۔ لہذا چاہتا ہوں کہ دل ہی کو پروانے کے پر سے باندھکر بھیجدوں کیونکہ وہ بھی سوختہ ہے یہ بھی۔ معشوق خود مطلب سمجھ لے گا۔ سلہ مشہور ہے کہ اگر بھیڑیئے کے ٹخنے (کعب) کی ہڈی نامہ بر کے پاؤں میں باندھ دیا جائے تو وہ تھکتا نہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے نامہ بر کے پاؤں سے کعب گرگ باندھکر شرمندہ ہوں۔ اسلئے کہ کہیں معشوق کی گلی کا کتا ہڈی کی بو پا کر نامہ بر کا دشمن نہ ہو جائے۔ سگ آہو۔ گرگ میں مراعاۃ النظیر ہے۔ سگ و گرگ کی دشمنی مشہور ہے۔

ہے سرخ پڑکا اور خونِ غیر میں رنگا ہوا ۔۔۔ کیا قتل[۳] پر میرے کمر نکلے ہو گھر سے باندھکر

آ جھانک[۴] تو بھی تو کہیں بے دید کیسی ٹکٹکی ۔۔۔ بیٹھے ہوئے ہیں روزنِ دیوار و در پہ باندھکر

جرّاح[۵] کیا سوچا بتا کیا رنگ دیکھا کیا ہوا ۔۔۔ کیوں کھول لی پٹّی مرے زخمِ جگر سے باندھکر

دیوانۂ[۶] نازک ہوں میں فصّادِ مژگاں نشتر ۔۔۔ لے فصد میرے ہاتھ کو تارِ نظر سے باندھکر

مومن سے اچھی ہو غزل تھا اسلیے یہ زور شور
کیا کیا مضامیں لائے ہم کس کس ہنر سے باندھکر

۶۷

جاتے[۱] تھے صبح رہ گئے بیتاب دیکھکر ۔۔۔ طالع ہمارے چونک پڑے خواب دیکھکر

پایا[۲] جو دشمنوں نے ترے پاس اعتبار ۔۔۔ آنکھیں چُراتے ہیں مجھے احباب دیکھکر

یہ تشنہ[۳] کامیِ نگہ گرم دیکھنا ۔۔۔ حسرت سے رو دیا طرفِ آب دیکھکر

۳ یہ سب میرے قتل کا سامان ہے کیونکہ میں اس آرائش کی ادا پر جذبۂ رشک سے ہلاک ہو جاؤنگا۔ پڑکا کمر میں ہوتا ہے اسلئے مصرعِ ثانی کے محاورے (کمر باندھکر نکلے ہو) نے لطف پیدا کر دیا۔ ۴ بے دید = بے مروت۔ کیسی ٹکٹکی کا تعلق مصرعۂ ثانی سے ہے۔ اس قسم کی بندش مومن کے یہاں کثیر الوقوع ہے۔ ۵ پہلے جراح نے عاشق کے زخمِ جگر سے پٹّی باندھی اور پھر لاعلاج سمجھکر فوراً کھول لی۔ اس پر عاشق سوال کرتا ہے۔ ۶ فصادِ مژگاں نشتر وہ فصّاد جس کے مژگاں نیشتر کا کام دیں۔ یہاں معشوق مراد ہے۔ قاعدہ ہے کہ دیوانہ کی فصد کھولی جاتی ہے اور فصد سے پہلے دورانِ خون روکنے اور رگ نمایاں کرنے کے لیے پٹّی باندھی جاتی ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ میں دیوانۂ نازک ہوں۔ اس لیے دیوانگی کے ساتھ نزاکت کی رعایت بھی ضروری ہے۔ اگر مژگاں نشتر ہے تو تارِ نظر پٹّی ہو۔ مراد یہ ہے کہ میرے جنون کا علاج تیری نگاہِ توجہ ہے

۱ معشوق صبحِ وصل رخصت ہو رہا تھا مگر ہمیں بیتاب دیکھکر رک گیا گویا ہمارے نصیب سو رہے تھے جاگ اُٹھے۔ جیسے سوتے میں کوئی شخص خواب دیکھکر چونک پڑے۔ معشوق کی تیاریِ رخصت کو اپنی خفتہ طالعی اور رک جانے کو طالع کی بیداری سے تعبیر کیا ہے۔ ۶۷
۲ اغیار مجھ سے اسلئے آنکھیں چراتے اور اغماض کرتے ہیں کہ میں تیری نگاہوں میں حقیر ہو گیا ہوں۔ ۳ میرا دل محبوب کی نگہ گرم (نظرِ عتاب) کے اثر سے جلنے لگا اور اس جلن نے اسقدر تشنگی پیدا کر دی کہ میں پانی کو دیکھکر حسرت سے رو دیا حسرت کی وجہ یہ ہے کہ یہ پیاس پانی سے بجھنے والی نہیں۔ مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں دوست کی نظرِ عتاب کا اسقدر پیاسا (طالب) تھا کہ پانی کو دیکھکر رو دیا کیونکہ یہ (پانی) دنیا کی پیاس بجھائے۔ مگر میری تشنہ کامی اس سے دور ہونے والی نہیں۔

توبہ کہاں کدورتِ باطن کے ہوش تھے — غش ہوگیا میں رنگ مے ناب دیکھکر
اُٹھی نہ نعش بھی ترے کوچے سے بعد قتل — ہم رہ پڑے زمین کو شاداب دیکھکر
روئے وہ میرے حال پہ حیران کیوں نہوں — آنکھیں ہی کھل گئیں دُرِ نایاب دیکھکر
شوقِ وصال دیکھ کہ آیا عدو کے گھر — سوجھا نہ کچھ مجھے شبِ مہتاب دیکھکر
بے ہے تمیزِ عشق و ہوس آج تک نہیں — وہ چھپتے پھرتے ہیں مجھے بیتاب دیکھکر

مومنؔ یہ تاب کیا کہ تقاضائے جلوہ ہو
کافر ہوا میں دین کے آداب دیکھکر

۷۸ یاد اس کی گرمیِ صحبت دلاتی ہے بہار — آتشِ گُل سے مرا سینہ جلاتی ہے بہار
کوہ و صحرا میں پئے فرحت پھراتی ہے بہار — میں تو کیا ان کو بھی دیوانہ بناتی ہے بہار
کھل چکی نرگس کہ شرمائی ہی جاتی ہے بہار — دیکھکر اس کی بہار آنکھیں چُراتی ہے بہار

؎ توبہ! مجھے اس قدر ہوش کہاں رہے کہ شراب ناب کی باطنی کدورت پر نظر کرتا۔ میں تو اُس کا رنگ دیکھتے ہی غش ہوگیا۔ باطنی کدورت سے شراب کی تلچھٹ وغیرہ بھی مُراد ہوسکتی ہے اور اُس کی اخلاقی مضرت بھی۔ ؎ آنکھیں کھُل جانا = حیران ہونا۔ محبوب کے اشکوں کو دُرِ نایاب کہا ہے اسلیے کہ اُسے شاذ و نادر کسی کے حال پر رونا آتا ہے۔ شکل کے لحاظ سے اشک کی مشابہت موتی سے ظاہر ہے۔
؎ شبِ مہتاب (جو محرکِ جذبات ہوتی ہے) دیکھکر مجھے انجام نہ سوجھا اور تیری تلاش میں سیدھا رقیب کے گھر پہونچا۔ ؎ یعنی پردہ بوالہوس سے چاہیے تھا۔ نہ کہ عاشق سے۔
؎ اہلِ دین کو یہ تاب نہیں کہ تقاضائے جلوۂ دوست (معشوقِ حقیقی) کرسکیں اور اگر کوئی جنابِ کلیمؑ کی طرح تقاضائے ارنی کر بیٹھتا ہے تو اُسے جواب لن ترانی سُننا پڑتا ہے۔ دین میں یہ پابندیِ آداب دیکھ کر میں کافر ہوگیا کہ بُتوں کے یہاں یہ قیود تو نہیں۔

۷۸ ؎ آتشِ گُل (سرخیِ گل) دیکھ کر گذشتہ محبوب کی گرمیِ صحبت یاد آتی ہے اور سینہ جلنے لگتا ہے۔ ؎ محبوب کے کوہ و صحرا میں پھرنے کو (خواہ بہ نیتِ تفریح کیوں نہو) دیوانگی سے مماثل ٹھہرایا۔ ؎ معشوق کی بہار دیکھ کر خود بہار شرم سے آنکھیں چُراتی ہے۔ نرگس کو بہار کی آنکھ قرار دیا ہے۔ کھل چکی = اب نہیں کھل سکتی۔

[۴] جلوۂ لالہ رقیبوں کو دکھاتی ہے بہار
داغ کھانے پر مرے کیا داغ کھاتی ہے بہار

آمد آمد ہے چمن میں کس سمن اندام کی
سبزۂ خوابیدہ سے مخمل بچھاتی ہے بہار

خاک تو مرغِ گلستاں کو خزاں ہی لے گیا
دیکھیے اب آنکر کیا خاک اُڑاتی ہے بہار

[۵] ہے خزاں میں بھی وہی جوشِ جنوں کیا ہو گیا
اب کہیں پاس اپنے ہم کو ہی بُلاتی ہے بہار

[۶] جوشِ گُل سے یاد آتی ہیں تری رنگینیاں
رنگ رفتہ سے مرے کیا رنگ لاتی ہے بہار

داغ اور زخم اس میں ہیں جو لالہ و گُل اُسمیں ہیں
فصل ہے یا آپکے عاشق کی چھاتی ہے بہار

[۷] امتیازِ دلدہی و دلبری میں فرق ہے
تم کو بھاتی ہے خزاں اور ہم کو بھاتی ہے بہار

محوِ حیرت کو وصال و ہجر دونوں ایک ہیں
[۸] بُلبلِ تصویر کو کب یاد آتی ہے بہار

[۹] میری ضد سے غیر پر تیری عنایت دیکھکر
سبزۂ بیگانہ کے قربان جاتی ہے بہار

ابتدائے فصل ہی میں غیر بھی کھاتے ہیں گُل [۱۰]
دیکھیے اس سال کیا کیا گُل کھلاتی ہے بہار

[۴] میں نے عشق میں جو داغ کھائے ہیں اُن کے غم سے خود بہار داغ کھاتی ہے۔ جنکا اثر لالے کی شکل میں نمودار ہوا ہے۔ تاکہ رقیبوں کو غیرت آئے۔ [۵] دورِ خزاں میں بھی جب وہی جنون کی کیفیت ہے تو شاید مرکر چین ملے۔ بہار خود تو عدم میں گئی۔ ہمیں بھی اپنے پاس بلاکر رہے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام آگ بہار ہی کی لگائی ہوئی ہے۔ [۶] بہار میرے رنگِ رفتہ سے یہ سلوک کرتی ہے کہ جب اُس کا جوشِ گُل دیکھکر مجھے تیری رنگینیاں یاد آتی ہیں تو رنگِ رُخ زیادہ متغیر ہو جاتا ہے۔ رنگ کو رفتہ اس لیے کہا کہ وہ عشق کے باعث پہلے ہی سے اُڑا ہوا ہے۔

[۷] عشق اور حُسن کے پسند میں بڑا فرق ہے۔ دیکھ لو۔ تم نے خزاں (دلِ عاشق کو) انتخاب کیا اور میں نے بہار (ذاتِ معشوق) کو۔ اس میں عاشق یک گونہ اپنی فوقیت ثابت کرتا ہے۔ دلدہی یہاں عاشقی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

[۸] تصویر میں جو بُلبل کی شکل بنائی جائے اُس کو محوِ حیرت کہا ہے۔

[۹] تو میری ضد سے غیر پر جو عنایت کرتا ہے اُس کو دیکھ کر بہار بھی سبزۂ بیگانہ پر قربان ہونا سیکھ گئی۔ غیر کو سبزۂ بیگانہ اور معشوق کو بہار سے نسبت دی ہے۔

[۱۰] گُل کھانا = داغ کھانا۔ اور گُل کھلانا = کارِ عجیب کرنا۔

چشم[۱۱] گلشن پر قدم رکھتا ہوا کون آئیگا
عطرِ فتنہ میں گُلِ نرگس بساتی ہے بہار

خندۂ[۱۲] دیوانگی یاں بعد مُردن بھی رہا
خاک سے اُگتے ہیں گُل ان کو ہنساتی ہے بہار

کچھ[۱۳] سوائے گریہ جوں ابر اپنی قسمت میں نہیں
زعفراں کی کیوں نہ ہو مجھکو رلاتی ہے بہار

غنچہ[۱۴] ہائے آرزوئے مومن اب کھلنے کو ہیں
خیر مقدم گلشنِ ایماں میں آتی ہے بہار

۶۹ — عشق

بیمروت ناتواں[۱] بیں ہنس دے رونا دیکھکر
دل دیا میں نے اُسے کیا جانئے کیا دیکھکر

خواب[۲] میں کیا خوش نہ یوسف کو زلیخا دیکھکر
کھل گئیں آنکھیں تجھے لے جلوہ آرا دیکھکر

تھی[۳] جہنم وہ نگاہِ گرم بھی سوسے عدو
سوجھی اپنی عاقبت کی ہم کو دنیا دیکھکر

قیس کی دیوانگی میں عقل کیا حیران ہے
مجھکو وحشت ہو گئی تصویرِ لیلا[۴] دیکھکر

---

[۱۱] چشمِ گلشن یعنی نرگس۔ [۱۲] ہماری خاک سے گُل اُگتے ہیں اور گُل بہار میں خندہ زن ہوا کرتے ہیں۔ اسی کو شاعر نے اپنا خندۂ دیوانگی قرار دیا ہے۔ [۱۳] ہماری قسمت میں ابرِ بہار کی طرح رونا ہی لکھا ہے۔ اگر زعفران کی بہار ہو تو بھی ہمیں گریہ کے سوا کوئی کام نہیں۔ عام قاعدہ ہے کہ زعفران کی بہار دیکھکر ہنسی آتی ہے۔ [۱۴] اس شعر میں مومن نے اپنے امام سید احمد صاحب سے اظہارِ عقیدت کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کے مساعی سے گلشنِ ایمان میں بہار آنے والی ہے۔

۶۹ [۱] ناتواں بیں = حاسد۔ جو کسی کا بُرا چاہے۔ یہاں معشوق مراد ہے۔

[۲] مشہور ہے کہ زلیخا حضرت یوسفؑ کو خواب میں دیکھکر عاشق ہوئی تھی۔ مطلب یہ کہ تجھے دیکھکر زلیخا کی آنکھیں کھل گئیں۔ کہ ایسے حسین بھی ہوتے ہیں "پیدا خدا کی شان"۔ اب ممکن نہیں کہ اُسے جمالِ یوسفی پسند آ سکے۔ خواب اور آنکھیں کھل گئیں میں ایہام تضاد ہے۔

[۳] دشمن پر محبوب کی نگاہِ لطف تو درکنار نگاہِ گرم بھی ہمارے لیے عذابِ جہنم کا حکم رکھتی تھی۔ یعنی خلافِ جذبۂ غیرت تھا کہ وہ دشمن کی طرف دیکھے۔ خواہ یہ نظرِ عتاب ہی کیوں نہ ہو۔ غرض دنیا کا یہ رنگ دیکھکر ہمیں انجامِ عشق نظر آیا کہ ایسے شخص سے ہمارا نباہ ناممکن ہے۔ [۴] لیلیٰ سیاہ فام تھی۔ مجھے حیرت ہے کہ اُس پر قیس کیوں دیوانہ ہوا۔ "مجھکو وحشت ہو گئی" کا پہلو اس شعر میں نہایت لطیف ہے۔

چشمِ نرگس بد نظر ہے اور گل بے اعتبار
بیوفا سیرِ گلستاں کیا کرے گا دیکھکر

خاک میں کیونکر نہ لوٹوں بندھ گیا سودے میں دھیان
اُس کے صحنِ خانہ کا پہنا[1] ے صحرا دیکھکر

تاش[2] کا ہمدم کفن لانا کہ بس میں مر گیا
چلمنوں سے جلوۂ خورشید سیما[3] دیکھکر

یاد آیا[4] سوے دشمن اُس کا جانا گرم گرم
پانی پانی ہوگیا میں موج دریا دیکھکر

اُس کے ہٹتے ہی اندھیرا آگیا ایسا کہ بس
گر پڑا میں روزنِ دیوار کو وا دیکھکر

کیا[5] تماشا تھا جھپکنا آنکھ کا بے اختیار
آئینہ کو ہاتھ سے اُس نے نہ چھوڑا دیکھکر

میں[6] نہ مانوں گا کہ چشمِ آبلہ بے دید ہے
یہ نہ دیکھے روئے غیر اپنے کفِ پا دیکھکر

پھر گئی[7] آنکھوں کے آگے اُسکی چشمِ سرمگیں
پھر گئیں آنکھیں مری نرگس کا جھکنا دیکھکر

دشمنی[8] دیکھو کہ تا الفت نہ آجائے کہیں
لے لیا مُنہ پر دوپٹہ حال میرا دیکھکر

کیوں نہ گھبرائے وہ میں گھبرا گیا بلبے ہجوم[9]
حسرتیں آتی ہیں کیا کیا اس کو تنہا دیکھکر

---

[1] پہنا = وسعت۔ [2] تاش زرکری کی قسم کا ایک دھاری دار کپڑا جس میں ایک تار گوٹے کا ہوتا ہے اور ایک ریشم کا۔ [3] خورشید سیما = معشوقِ خورشید جبین چونکہ میں چلمن سے معشوق مہروش کا جلوہ دیکھکر ہلاک ہوا ہوں اسلیے اس مناسبت سے کفن بھی تاش کا چاہیے۔ یہ غزل مومن کی ابتدائی مشق کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے جبکہ اُنھوں نے ناسخ کا تتبع کرنا چاہا تھا۔ پھر ترک کرکے اپنا خاص رنگ اختیار کیا۔ پہلے غالب نے بھی اس کو اختیار کیا تھا پھر چھوڑ کر طرزِ میر پسند کی۔ [4] موج دریا کی رفتار دیکھکر مجھے محبوب کا تیزی کے ساتھ رقیب کے یہاں جانا یاد آگیا اور میں غیرت سے پانی پانی ہوگیا۔ پانی پانی اور موج دریا میں ایہام تناسب ہے۔ [5] محبوب نے دمِ تزئیں آئینہ اُٹھایا مگر آئینہ میں اپنا جمال دیکھکر بے اختیار آنکھ جھپک گئی اور ایسی بیخودی چھائی کہ آئینہ ہاتھ کا ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ [6] میں چشمِ آبلہ کو بے مروت نہیں کہہ سکتا۔ یہ میرے پاؤں دیکھکر غیر کا مُنہ دیکھنے والی نہیں۔ یہاں شاعر نے اپنی وحشتِ عشق کا بیان کیا ہے اور محاورے سے کام لیا ہے۔ آبلہ کو شکل کے اعتبار سے چشم سے تشبیہ دیتے ہیں۔ [7] پہلے مصرع میں پھرنا نقشہ پیشِ نظر ہوجانے کی معنی میں مستعمل ہوا ہے اور دوسرے میں بحالت نزع تیور بدل جانے کے معنی میں۔ [8] مُنہ چھپانے کا باعث عموماً کسی دردناک منظر کی تاب نہ لانا ہوا کرتا ہے مگر معشوق نے اس خیال سے مُنہ چھپایا کہ کہیں مروت نہ آجائے۔
[9] ہجوم سے مراد یہاں ہجومِ حسرت ہے۔ قاعدہ ہے کہ انسان ہجوم میں گھبرا جاتا ہے۔

انتظار[1] ماہوش میں تو نہ ہوں آنکھیں سفید
شب یہ وہم آیا ہے سکتے چرخ خضرا دیکھکر

کاٹ لینے دو گلا تم شوق سے گھر جائیو
لیا سب رقصِ نیم بسمل کا تماشا دیکھکر

ق
سب سمجھا کے نہاں نظروں میں تھے ناصح نہ پوچھ
کیا کہوں میں غش ہوا کیا سوچکر کیا دیکھکر

جو نقاب اُٹھی امرو، آنکھوں پہ پردہ پڑ گیا
کچھ نہ سوجھا عالم اُس پردہ نشیں کا دیکھکر

کر لیا خاک آپ کو اُس بُت کے در پر ہاے ہاے
جل گیا جی لاش کو مومن کی جلتا دیکھکر

ردیف الراء الہندی

۸۰
مومن خدا کے واسطے ایسا مکاں نہ چھوڑ
دوزخ میں ڈال خلد کو کوئے بتاں نہ چھوڑ

عاشق تو جانتے ہیں وہ لے دل یہی سہی
ہر چند بے اثر ہے پر آہ و فغاں نہ چھوڑ

اِس[2] طبع نازنیں کو کہاں تاب انفعال
جاسوس میرے واسطے اے بدگماں نہ چھوڑ

ناچار دینگے اور کسی خوبرو کو دل
اچھا تو اپنی خو سے بدلے بدزباں نہ چھوڑ

زخمی[3] کیا عدو کو تو مرنا محال ہے
قربان جاؤں تیرے نیمجاں نہ چھوڑ

---

[1] آسمان کو دیکھکر مجھے رات یہ وہم آیا کہ کہیں اسکی آنکھیں بھی اُسی ماہوش کے انتظار میں سفید نہ ہو گئی ہوں۔ ستاروں کو استعارةً آسمان کی آنکھیں کہا گیا۔ چرخ خضرا = نیلا آسمان۔

۸۰ [2] اے بدگمان تو میرے واسطے جاسوس مقرر کرتا ہے "تاکہ میرے جرائم کی تفتیش کریں۔ لیکن چونکہ میں بے قصور ہوں نتیجہ یہ ہوگا کہ جاسوس تیری توقع کے خلاف آکر اطلاع دینگے اور تیری طبع نازک کو منفعل ہونا پڑیگا"۔

[3] تم نے جو رقیب کو زخمی کیا ہے تو اس رشک سے میں بھی بسمل ہو گیا ہوں مگر محض اتنی بات سے میرا مرنا محال ہے۔ اگر تم (صدمہ رشک سے) مجھے بالکل ہلاک کرنا چاہتے ہو تو میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ مجھے نیم جاں نہ چھوڑو اور اس کی صرف ایک صورت ہے۔ یعنی رقیب کو بالکل قتل کر دو۔ میں خود غیرت سے مر جاؤں گا۔ یہ فکر شاعرانہ مومن سے مخصوص ہے۔

کچھ کچھ درست ضد سے تری ہو چلے ہیں وہ — یک چند اور کجروی اے آسماں نہ چھوڑ
جس کوچہ میں گذار صبا کا نہ ہو سکے — اے عندلیب اسکے لیے گلستاں نہ چھوڑ
گر[۱] پھر بھی اشک آئیں تو جانوں کہ عشق ہے — حُقّہ کا مُنہ سے غیر کی جانب دھواں نہ چھوڑ

ہوتا[۲] ہے اس جحیم میں حاصل وصال حُور
مومن عجب بہشت ہے دیرِ مغاں نہ چھوڑ

ردیف الزاء

۸۱
ہے چشم بند پھر بھی ہیں آنسو رواں ہنوز — جی سرد ہو گیا ہے و لے دل تپاں ہنوز
یہ[۳] دن دکھائے ہیں شب فرقت نے ہم کو اور — وہ رشکِ آفتاب نہیں مہرباں ہنوز
مر بھی گئے جدائی میں پردہ نشیں کی پر — آیا نہیں زبان پہ دردِ نہاں ہنوز
ہم تیرہ بخت خاک میں بھی مل گئے و لے — کچھ کم نہیں غبارِ دلِ آسماں ہنوز
یاں[۴] امتحان مرگ سے فارغ ہوئے ہیں یار — واں اپنے ہی پہ مرنے کا ہے امتحاں ہنوز
تشبیہ[۵] دی تھی میں نے کہیں انگبین سے — تبخالہ خیز ہے لبِ شیریں دہاں ہنوز
باغِ[۶] جہاں میں گو مہِ خورداد آگیا — یاں ہے اسی بہار پہ فصلِ خزاں ہنوز

[۱] رقیب کے اشکوں کا باعث عشق نہیں بلکہ حُقّہ کا دھواں ہے۔ [۲] مومن اس نام نہاد دوزخ (دیر) میں حوروں (حسینوں) کا وصال نصیب ہوتا ہے اس لحاظ سے یہ (دیر) بھی عجیب بہشت ہے اس کو چھوڑنا نہ چاہیے جحیم = دوزخ۔ آتش پرستوں کے معبد (دیر مغاں) کو جحیم کہتے ہیں یہ نکتہ ہے کہ وہاں ہر وقت آگ روشن رہتی ہے [۳] دن۔ شب۔ آفتاب۔ مہر (بان) میں رعایت شاعرانہ ہے۔ [۴] یہاں میرے احباب میرے امتحان مرگ سے فارغ ہوگئے یعنی تحقیق کر چکے کہ عاشق مرض عشق سے واقعی مرگیا۔ وہاں معشوق کی ابھی یہی آزمائش و انتظار ہے کہ یہ مجھ پر مرتا بھی ہے یا نہیں دوسرے مصرع میں مرنا عاشق ہونے کے معنی میں ہے۔ [۵] میں نے لب معشوق کو کہیں شہد سے تشبیہ دی تھی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ لب معشوق پر برابر اب تک حرارت غضب سے چھالے نمودار ہو رہے ہیں۔ کیونکہ شہد سے تشبیہ اسکی توہین ہے۔ انگبین = شہد۔ تبخالہ = چھالا۔ [۶] خورداد شمسی مہینہ کا نام جو زمانہ بہار ہے۔

۱۸

روزِ جزا نہ قتل کا انکار کر کہ ہے — دامن پہ تیرے میرے لہو کا نشاں ہنوز
یاں اپنا اُن کی چاہ میں مرنا یقیں ہوا — واں اور ہی کے چاہنے کا ہے گماں ہنوز

مومن تو مدتوں سے ہوئے پر بقول درد
دل سے نہیں گیا ہے خیالِ بتاں ہنوز

۸۲

[1] ہجراں کا شکوہ لب تلک آیا نہیں ہنوز — لطفِ وصال غیر نے پایا نہیں ہنوز
اے جذبۂ دل وہ شوخِ ستمگر تو یک طرف — پیغام لے کے بھی کوئی آیا نہیں ہنوز
[2] ہا چاک خدا کے واسطے اے موسمِ بہار — خاکِ عدو پہ پھول وہ لایا نہیں ہنوز
[3] یہ اہتمام جور ہے کیا تو نے اے فلک — اندازِ غفلت اُس سے اُڑایا نہیں ہنوز
[4] یکچند اور کاہشِ غم چشمِ التفات — میں یار کی نظر میں سمایا نہیں ہنوز
واعظ ہمارے سامنے کرتا ہے وصفِ حور — سمجھا ہے اُس نے جلوہ دکھایا نہیں ہنوز
[5] ہوش خوں گرفتہ یار و شفاعت کے فائدہ — صیدِ اجل کسی نے چھوڑایا نہیں ہنوز

۸۲ [1] غیر کو لطفِ وصال جبھی میسر ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے غمِ ہجر سے دوچار ہو لے۔ کیونکہ الاشیاء تعرف باضدادہا یہ مومن کا مکرِ شاعرانہ ہے۔ [2] اگر موسمِ بہار زیادہ دیر تک ٹھیرا رہا تو ڈر ہے کہ محبوب جو ہنوز قبرِ عدو پر پھول نہیں لایا اب لے آئے۔ [3] معشوق کا اندازِ تغافل ہی جور و ستم کا قائم مقام ہے بلکہ یک گونہ جور سے بڑھ کر ہے اگر فلک بھی اُس سے یہ انداز سیکھ لیتا تو عشاق پر ظلم کرنے کے لیے اُس کو اس قدر اہتمام کیوں کرنا پڑتا۔ مکرِ شاعرانہ ہے۔ [4] اے کاہشِ غم ذرا مجھ پر اور نظرِ عنایت کر کہ زیادہ کاہیدہ و لاغر ہو جاؤں تاکہ معشوق کی نگاہ توجہ میں میری گنجائش پیدا ہو سکے۔ اس کا ظاہری پہلو تو یہ ہے کہ کوئی چیز جب تک کاہیدہ نہ ہو آنکھ میں سما نہیں سکتی۔ معنوی پہلو یہ ہے کہ عاشق جب تک غمِ الفت سے لاغر نہ ہو موردِ التفات نہیں ہوتا۔ [5] خوں گرفتہ = اجل گرفتہ۔ جس کی قضا آگئی ہو۔

کیونکر مجھے گناہ زلیخا یقین آئے ۵ — دامن کو تیرے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز
کیا ۶ سوز رشک کی دلِ اغیار کو خبر — دوزخ نے کافروں کو جلایا نہیں ہنوز
ایسے ۷ ستم کئے کہ مرا جی بٹھا دیا — ہر چند سر فلک نے اٹھایا نہیں ہنوز
ناصح ۹ رقیب سے ہے بد آموز تر کہیں — پر مَیں نے تیرا حال سنایا نہیں ہنوز

اب کی وفورِ عشق صنم میں ہے گفتگو ۱۰
مومن وہ لب پہ ہائے خدایا نہیں ہنوز

۸۳
لب پہ دم آیا و لے نالہ نہیں ہے ہنوز — نغمۂ ۱ غم بھی ترا پردہ نشیں ہے ہنوز
ہائے پسِ مرگ بھی دفن کریں مجھکو غیر — خاک میں ملجائے چرخ پر سرکیں ہے ہنوز
لیکے ۲ دل و عقل و دیں پھر پڑے غارتِ عشق — اے ۲ اجل آچک کہیں جانِ حزیں ہے ہنوز
روزِ ۳ جزا کیوں کیا خون کا مرے اتہام — مہر عدو بد گماں تجھکو یقیں ہے ہنوز

۵ زلیخا کا گناہ یہ تھا کہ حضرت یوسفؑ کا دامن پکڑ کر کھینچا تھا اور اپنی طرف راغب کرنا چاہا تھا شاعر کہتا ہے کہ مجھے گناہ زلیخا کا یقین نہیں آتا۔ کیونکہ مجھے تو آجتک تیرا دامن چھونے کی جسارت نہیں ہوئی ۶ سوز رشک کو دوزخ اور اغیار کو کافر ٹھہرایا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ عذاب دوزخ کفار کو ابھی نہیں ہوگا۔ آخرت میں ہوگا۔ ۸ سر اٹھانا یہاں محاورہ نہیں بلکہ حقیقی معنی میں مستعمل ہے۔ یعنی ہنوز فلک سرنگوں ہے۔ اُس پر یہ حال ہے۔ اگر سر اٹھاتا تو نجانے کیا کرتا۔ بٹھانا اور اٹھانا میں ایہام تضاد ہے۔ ۹ ناصح رقیب سے کہیں زیادہ بد آموز ہے۔ خیر گذری کہ میں نے اُس کو تیرا حال نہیں سنایا ورنہ شاید وہ بھی میرا رقیب بن بیٹھتا۔ ناصح کو حال یار سنانے کی وجہ یہ ہوسکتی تھی کہ وہ پند و نصیحت سے باز آجائے مگر اسی خوف سے میں حال کہنے سے محترز رہا۔ بد آموز = بڑی صلاح دینے والا۔ ۱۰ گفتگو = شبہہ۔ کلام۔

۸۳ ۱ نغمۂ غم سے مراد نالہ ہے۔ نغمہ اور پردہ میں ایہام تناسب ہے۔ ۲ اے اجل میری جان مغموم باقی ہے۔ اسکو آکر لیلے ورنہ یہ بھی عشق کے ہاتھوں تاراج ہو جائے گی۔ ۳ قیامت میں تو نے تجھ پر اپنے قتل کا دعویٰ کیا اور تو نے اس خیال سے رقیب پر ڈالدیا کہ یہ میری محبت میں اس غلط الزام کو اپنے سر اوڑھ لے گا۔ افسوس تجھے اب تک رقیب کے عشق کا یقین ہے جو اُس سے اتنی بڑی توقع رکھتا ہے۔

مردہ و حیراں میں کیا شبہ پڑا دیکھنا
چاک سرا پردہ سے جھانکتے تھے وہ ایک تن

محو خود آرا ترا آئینہ بیں ہے ہنوز
سجدۂ محراب در شغل جبیں ہے ہنوز

کیوں نہیں لاتا اُسے آہ مری یاد ہے
کہد و فلک سے دمِ باز پسیں ہے ہنوز

دود دل و گرد غم کیوں یہ اُمید اثر
وہ ہی فلک ہے ہنوز وہ ہی زمیں ہے ہنوز

جھوٹ نہیں تیرے پاس بیٹھتے ہیں بدتمیز
چین بجبیں کیوں نہ ہوں فرش میں چیں ہے ہنوز

وصل بتاں کی دعا کرتے ہو شکرِ خدا
حضرتِ مومن تمہیں دعوئ دیں ہے ہنوز

ردیف السین

یوں ہے شعاعِ داغ مرے دل کے آس پاس
ڈوبا جو کوئی آہ کنارے پہ آگیا

۸۴ ہالہ ہو جس طرح مہ کامل کے آس پاس
طغیانِ بحرِ عشق ہے ساحل کے آس پاس

اے خود آرا تیرا محو دیدار اب تک آئینہ دیکھ رہا ہے۔ یعنی لوگ اس خیال سے اُسے آئینہ دکھا رہے ہیں کہ معلوم ہوجائے کہ یہ واقعی مرگیا یا محو حیرت جمال ہے۔ قاعدہ ہے کہ سکتہ کی حالت میں آئینہ مُنہ کے سامنے رکھتے ہیں کہ تنفس باقی ہے یا نہیں۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ تیری خود آرائی نے عاشق پر بھی یہ اثر کیا کہ وہ آئینہ بیں بنگیا۔ آسمان معشوق کو میرے گھر کیوں نہیں لاتا۔ کیا اُس کو میری آہ یاد نہیں؟ ابھی تو آخری سانس باقی ہے۔ اگر میں نے آہ کی تو آسمان کو جلاکر خاک کردونگا۔ اسے آہ دل و غبار غم تاثیر کی اُمید نہ رکھو۔ جو آسمان و زمین پہلے تھے اب بھی ہیں۔ پھر کیا نئی بات پیدا ہوگئی جو اثر کی توقع کیجائے۔ دود کی مناسبت آسمان سے اور گرد کی زمین سے ظاہر ہے۔ یعنی شکر ہے کہ تم ابھی خدا سے دعا کے قائل ہو۔ اتنی دینداری تو باقی ہے۔ اس میں ایک گو طنز کا پہلو ہے۔ جو دریائے عشق عبور کرکے کنارے پر آگیا سمجھو کہ وہی ڈوب گیا۔ یعنی اس دریا میں کنارے کی تمنا کرنا ہی عین ہلاکت ہے۔ اسلیے کہ (اور دریاؤں کے برخلاف) یہاں طوفان کا تمام زور ساحل کے قریب ہے اور وسط بحر خطرہ سے محفوظ ہوتا ہے۔ "جو موج ڈبودے ساحل ہے یوں نام کا ساحل کوئی نہیں" مومن کے شعر میں ڈوبا مجازی معنی میں مستعمل ہوا ہے۔
۸۴

یہ غیرتِ وفا کا اثر ہے کہ بوالہوس
بسمل تڑپتے ہیں ترے بسمل کے آس پاس

کیا دعویٰ آہ جب نہ رہا میں ہی کس لیے
ہیں جمع اقربا مرے قاتل کے آس پاس

اے قیس تیرے نالے کی غیرت کو کیا ہوا
لیلیٰ نے زنگ باندھے ہیں محمل کے آس پاس

مر جائیں تا خوشی سے عدو سن وصال کی
یارو دعا کرو گلے مل مل کے آس پاس

کیا کیا جلی ہے بزم میں تجھ سے نہ جب پھٹکے
پروانے شمع شعلہ شمائل کے آس پاس

ہے تو ہی بیوفا نہیں باور تو دیکھ لے
گل جامہ در ہیں گورِ عنادل کے آس پاس

کافر ہے کون ہم میں سے مومن پھیرے ہے تو
کعبے کے آس پاس تو میں دل کے آس پاس

۸۵

کھا گیا جی غمِ نہاں افسوس
گھل گئی تم کے مارے جاں افسوس

میرے مرنے سے بھی وہ خوش نہ ہوا
جی گیا یوں ہی رائگاں افسوس

شکوہ آزارِ غیر کا جو کروں
ہنس کے کہتا ہے وہ کہ ہاں افسوس

مر گئے ہم غیر چھوٹے نہ کیا
تو نے الفت کا امتحاں افسوس

لہ میری وفا دیکھ کر رقیبوں کو بھی غیرت آئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر میں بسمل پڑا ہوں ادھر وہ بسمل ہو کر میرے پاس پڑے تڑپتے ہیں یعنی میں تیغِ عشق کا بسمل ہوں اور رقیب میری غیرتِ وفا کے۔ ٹہ عاشق اقربا کا قاتل کے پاس جمع ہونا بھی اپنے جذبۂ غیرت کے منافی سمجھتا ہے۔ تہ اگر تیرا نالہ کسی قابل ہوتا تو وہی زنگ کا کام دیتا۔ لیلیٰ کو محمل میں زنگ باندھنے کی کیوں ضرورت پڑتی۔ زنگ = گھنٹہ۔ جرس۔ شہ وصال یہاں بمعنی موت استعمال کیا ہے یعنی میرے مرنے کی دعائیں کرو تاکہ عدو سنکر اور میری مصیبت سے آگاہ ہو کر خوشی سے مر جائیں۔ وصال کی دوسرے مصرع سے متعلق ہے۔
ھہ شعلہ شمائل = شعلہ کی صورت رکھنے والی۔ یعنی جب تیری موجودگی میں پروانے شمع کے پاس نہ پھٹکے تو وہ تجھ سے کس قدر جلی ہے۔ شہ مراد یہ ہے کہ کافر تو ہے۔ اسلئے کہ کعبہ ایک زمانہ میں بتخانہ بھی رہ چکا ہے
۸۵ اور دل تو عرش اللہ ہے۔ سلہ یعنی طنزاً کہتا ہے۔ ٹلہ اگر تو امتحان الفت لیتا تو ہم جان دیتے اور غیر جی چھوڑ کر کنارہ کش ہو جاتے۔ نہ کیا کا تعلق مصرع دوم سے ہے۔

گل[۱] داغ جنوں کھلے بھی نہ تھے
آ گئی باغ میں خزاں افسوس

کشتۂ روز ہجر کا اُس کے
مرگ کرتی ہے ہر زماں افسوس

بیوفائی[۲] ہوئی وفا کا سبب
غیر سے ہے وہ بدگماں افسوس

مرگ پر اپنے ناتواں کی ترے
دل سے آیا نہ تا زباں افسوس

موت بھی ہو گئی ہے پردہ نشیں
راز[۳] رہتا نہیں نہاں افسوس

تھا عجب کوئی آدمی مومن
مرگیا کیا ہی نوجواں افسوس

ردیف الشین

۸۶
گل[۱] دیکھ کے وہ عذار آتش
کیا کیا ہی جلی ہے یار آتش

پھونکا[۲] تپ غم نے جی کو نکلے
دل کے ترے اب بخار آتش

ہووے نہ مقابل تف دل
بھڑکائے کوئی ہزار آتش

ہاں سیر دکھا۔ لگا کہیں تو
اے نالۂ شعلہ بار آتش

اُف ری تپ گرمیِ محبت
اِس نام پہ جاں نثار آتش

---

۱ ابھی ہوس جنوں کے تو صلے بھی نہ نکلے تھے کہ موسم بہار ختم ہو گیا۔ ۲ افسوس رقیب کی بیوفائی معشوق کی بدگمانی کا باعث ہوئی یعنی اُسے یہ خیال ہوا کہ جب اس (رقیب) کا ابھی یہ حال ہے تو ظلم پر دعویٰ الفت سے بالکل دست بردار ہو کر بیٹھ جانے گا۔ چنانچہ اس خوف سے وہ رقیب سے وفا کرنے لگا۔ ۳ یعنی کاش موت آ جاتی تو راز عشق فاش نہ ہوتا۔

۸۶ ۱ گل تیرے رخسار کو آگ (تشبیہ) دیکھ کر آگ رشک سے کس قدر جلی ہے۔ ۲ نکلے کا تعلق مصرع ثانی سے ہے۔

دل کو مرے پوج گبر[2] جس کو
سجدے کرے بار بار آتش

تو نے تو وہاں لگائی مہندی
یاں دل میں لگی نگار آتش

مست آئیو میری خاک پر تو
برسے ہے سر مزار آتش

میں آہ زبانہ کش[3] ہوں کھینچوں
باندھے ہے ابھی حصار آتش

دیکھے[4] ہے تو اور لگی ہے دل میں
اے دیدۂ اشکبار آتش

پڑھتا ہے کہیں غزل جو مومن
لگ اُٹھتی ہے ایک بار آتش

۸۷

کہاں نیند تجھ بن مگر آئے غش
تو اک صورتِ خواب دکھلائے غش

تمھاری[1] کدورت سے ہوش آگیا
کیا بوسۂ گل نے مداوائے غش

نہ ٹھہرے[2] بس آئینہ کو دیکھ کر
وہ اتنا کہ دیکھیں تماشائے غش

قیامت[3] جنوں میں ہوں نازک دماغ
نہ کیوں نکہتِ گل سے آجائے غش

ترے[4] بال لاکر سونگھائے کہیں
کہ غش ہو گئے چارہ فرمائے غش

[2] گبر یعنی آتش پرست - [3] زبانہ کش = شعلہ زن - قاعدہ ہے کہ آسیب سے محفوظ رہنے کے لیے چاروں طرف حصار باندھ لیتے ہیں - [4] یعنی تیرا فرض تھا کہ اس آگ کو بجھاتا -

۸۷ [1] تمھاری کدورت کی وجہ سے مجھے ہوش آگیا یعنی انجامِ محبت سوجھ گیا - کدورت کی مناسبت سے بوسۂ گل اور ہوش کی رعایت سے مداوائے غش استعمال کیا ہے - قاعدہ ہے کہ حالتِ غش میں مٹی سنگھاتے ہیں - [2] دمِ زینت آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر وہ اتنا بھی نہ سنبھل سکے کہ اپنے محوِ زینت (عاشق) کے غش ہونے کا تماشا دیکھتے - [3] قیامت نازک دماغ ہوں یعنی بلا کا نازک دماغ ہوں -
[4] شاید میرے غش کا علاج کرنے والوں نے علاج کی خاطر مجھے تیرے بال لاکر سنگھائے جو خود اُنکی خوشبو سے بیہوش ہو گئے -

نہ ہو جب کہ میرا خیالِ وفات
تو کیا اُس ستمگر کو پروائے غش

خبر لو مری تم کہاں تک رہے
یہ حالت کہ غش پر چلا آئے غش

خُدائی کا جلوہ ہے مومن کہ تو
گر اُس بُت کو دیکھے تو ہو جائے غش

ردیف الصاد

۸۸
روز ہوتا ہے بیاں غیر کا[1] اپنا اخلاص
چشم بد[1] دور تمھیں ہم سے بھی ہے کیا اخلاص

غیر کرتا ہے بیاں مجھ سے تو میں کہتا ہوں
بارے اب تک تو نہیں تجھ سے مرا اخلاص

غیر[2] سے لطف کی باتیں ہیں مرے چھیڑنے کو
دشمنی کہتے ہیں جس کو وہ تمھارا اخلاص

ہم یہاں[3] سورۂ اخلاص کا پڑھتے ہیں عمل
اور بڑھتا ہے وہاں غیر سے اُس کا اخلاص

مجھ سے مل ورنہ رقیبوں سے میں سب کہدونگا
دشمنی ایکی تری اور وہ پہلا اخلاص

جنبشِ لب کی ترے پوچھنے کو کیفیت
ترے بیمار سے کرتا ہے مسیحا اخلاص

لیے

۸۸ [1] اس میں طنز کا پہلو ہے۔
[2] تم غیر سے اوپری دل سے لطف کی باتیں کرتے ہو جن کا مقصد محض مجھے چھیڑنا ہے۔ مگر میرے نزدیک تمھارے اس اخلاص دبے تکلفی (چھیڑ) میں بھی دشمنی کا شائبہ شامل ہے۔ کیونکہ مجھے غیر کے ساتھ تمھارا اتنا ربط بھی گوارا نہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ تمھارا غیر پر کرم اُس کے حق میں اخلاص ہے مگر میرے حق میں دشمنی۔ الفاظ سے بظاہر یہی معنی متبادر ہوتے ہیں۔
[3] یعنی مراد تو بر آتی ہے مگر ہماری نہیں۔ غیر کی۔ کس غضب کی شوخی ہے۔

لکہ اُس ستمگر نے بناوٹ کی لگاوٹ بھی نکی		ہائے قسمت مرے کچھ کام نہ آیا اخلاص
پس قتل آمری خاطر سے ٹھہر جاتا دفن	البتہ	ظالم آخر تجھے مجھ سے بھی کبھی تھا اخلاص
چاہتا ہے کہ دل اُس تنگ قبا سے چمٹ جائے		میرے ناصح کا ہے دنیا سے نرالا اخلاص
اب انھیں لکھتے ہیں ہم خط میں سراسر دشمن		جن کو لکھتے تھے سدا یار سراپا اخلاص
موت بھی آ نہ پھری پاس ہمارے شب ہجر	ابتک	سچ تو یہ ہے کہ بُرے وقت میں کیسا اخلاص

مومن اس ہرزہ درائی سے بھی کیا بدتر ہے
اُس بُتِ دشمنِ ایماں سے ہمارا اخلاص

ردیف الصّاد

بے صبر کو کہاں تپِ داغِ جگر سے فیض	۸۹	گلچیں کو کب ہوا شجرِ بارور سے فیض
لہ زاہد نگاہ بھر کے وہ بے دید دیکھ لے		اتنا ہوا نہ خدمتِ اہلِ نظر سے فیض
سہ یادِ خطِ نگار میں ہم زہر کھا موئے		کیا آبِ زندگی کا ہوا ہے خضر سے فیض
بالطبع گر کرم ہو تو مفلس بھی ہے کریم		ہوتا ہے سایہ کا شجرِ بے ثمر سے فیض

لکہ میرے ساتھ دکھاوے کا اختلاط بھی نہ برتا۔
۸۹ لہ زاہد تو مجھے اہلِ نظر (اہلِ دل) کی خدمت کی ترغیب عبث دیتا ہے۔ اُن کی خدمت سے مجھے اتنا فیض بھی تو حاصل نہ ہوا کہ وہ بے مروت (معشوق) مجھے نگاہ بھر کے دیکھ لیتا۔
سہ نگار (معشوق) کے خطِ سبز کو خضر اور زہر کھا کر مرنے کو طنزاً آبِ زندگی (آبِ حیات) کہا ہے حضرت خضر اور آبِ حیات کی روایت مشہور ہے۔ حضرت خضر جنکا اصلی نام ارمیا ہے اس وجہ خضر (سبز) کہلاتے ہیں کہ جس زمین پر وہ بیٹھتے تھے وہ سبز ہو جاتی تھی۔

ہے چرخ سے امید کشایش عبث ہمیں | ۱ | کس کو ہوا ہے خانۂ وابستہ در سے فیض
ملنے کو خاک ہی میں بخیلوں کا مال ہے | | سلہ دیکھو تو ہے کسی کو کبھی غنچۂ زر سے فیض
سلہ شب بھر کیا ہے مبدءِ فیاض کا گلہ | | تو بھی عیاں ہوا نہ دعائے سحر سے فیض
سلہ ترسا صنم پہ مر گئے ہم آہ جب نہیں | | جاری مسیح کے لب اعجاز اثر سے فیض
تصویر سے تری مجھے تسکین دل کہاں | | کیا خاک تشنہ کام کو آب گہر سے فیض

کیونکر نہ غم ہو خلق کو مومن کی مرگ کا
تھا سب کو اس کی ذات سراپا ہنر سے فیض

ہاں ہاں کہا ہے بوسۂ زلف دوتا قرض | ۹۰ | جاں اپنی تو نہیں حشر کے دن دینگے صبا قرض
سلہ سمجھیں گے قیامت میں ستم پیشہ دم قتل | | دیکھا نہ ادھر تو نے رہا خون بہا قرض
کیونکر نہ ہے فلک سلہ وام مدد کو درم داغ | | مفلس کو جہاں میں کوئی دیتا ہے بھلا قرض
گر کہئے کہ کیوں لیتے ہو تم دل کو تو وہ شوخ | | سلہ کس ناز سے کہتا ہے کہ یوں دیتے ہو یا قرض
کچھ دینے کا بھی دیکھ لے اسے آہ ٹھکانا | پورے | کس برتے پہ لیتی ہے تو تاثیر دعا قرض

سلہ زر یا زرِ گل پھول کے زیرہ کو کہتے ہیں۔ غنچہ کی مٹھی بند رہتی ہے۔ اس لئے اس کو بخیل قرار دیا۔ قاعدہ ہے کہ جب پھول کھلتا ہے تو زیرہ زمین پر گر پڑتا ہے۔ سلہ میں نے رات بھر اللہ تعالیٰ کا گلہ کیا (شاید) اسی طرح وہ میری استجابت مقاصد پر مائل ہو جائے لیکن پھر بھی دعا سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مبدء فیاض۔ تمام اشیاء کا آغاز کرنے والا جو بڑا فیض رساں ہے۔ یعنی حق تعالیٰ۔ اس شعر میں حد سے زیادہ شوخی ہے۔ سلہ ہماری بدقسمتی دیکھو کہ ہم ترسا پر ایسے زمانہ میں مرے جبکہ حضرت مسیح کے لب اعجاز کا فیض (مردہ کو زندہ کرنا) جاری نہیں۔ ترسا بمعنی نصرانی۔
۹۰ سلہ ظالم ہم تجھے قیامت میں سمجھیں گے کیونکہ تو نے وقت قتل ہماری طرف نہ دیکھا اور تجھ پر ہمارا خون بہا قرض رہا۔ معشوق کے دیکھنے ہی کو شاعر نے خون بہا قرار دیا ہے۔ دم قتل مصرع دوم سے متعلق ہے۔
سلہ وام = قرض۔ رقیب دولت وتا نہیں رکھتا۔ اس لئے مفلس کہا۔ سلہ یعنی تم دل مفت دے رہے ہو یا قرض کیوں لیتے ہو = آیا لیتے ہو (یا نہیں)

افلاس؎ سے کھایا کئے غم سبز خطوں کا — افسوس کہیں زہر بھی ہم کو نہ ملا قرض

گِن گِن کے دیئے داغ فلک نے مجھے گویا — آتا تھا یہ اس پر زرِ نایاب مرا قرض

آمد؎ سے فزوں خرچ ہے اے شورِ محبت — بخیوں کا مرے زخم سے کیونکر ہوا ادا قرض

ہم قرض یہ نقد دل اُسے دیتے ہیں مومن — جس نے نہ کبھی آج تلک لے کے دیا قرض

ردیف الطاء

۹۱

ہر غنچہ؎ لب سے عشق کا اظہار ہے غلط — اس مبحث صحیح کی تکرار ہے غلط

کہنا؎ پڑا درست کہ انکار ہے بلحاظ — ہر چند وصلِ غیر کا انکار ہے غلط

کرتے؎ ہیں مجھ سے دعوئ الفت وہ کیا کریں — کیونکر کہیں مقولۂ اغیار ہے غلط

یہ گرم؎ جوشیاں تری گو دل سے ہوں ولے — تاثیر نالہ ہائے شرربار ہے غلط

؎ سبز خطوں اور زہر (جس کے کھانے سے رنگ سبز ہو جاتا ہے) کی مناسبت ظاہر ہے۔ "افلاس کی وجہ سے غم کھانے" میں بھی لطافت ہے۔ اور ایسا کوئی کیا بے سروسامان ہوگا۔ کہ مجھے زہر بھی نہ دے گا تو احسان ہوگا (مومن) ؎ اے شورِ محبت میرا زخم بخیوں کے احسان کا قرض کس طرح ادا کر سکتا ہے۔ کیونکہ میرے یہاں آمدنی سے زیادہ خرچ ہے۔ یعنی ایک زخم لگتا ہے تو دس زخم ہائے سوزن لگتے ہیں۔

91 ؎ ہر حسین سے اظہار عشق بے معنی ہے۔ یہ بحث (عشق) تو صحیح ہے مگر اسکی تکرار (اعادہ) غلط ہے۔ ؎ ہر چند معشوق کا انکارِ وصلِ غیر صحیح نہیں۔ تاہم مجھے "درست" کہنا پڑا کہ کم از کم اُسے اتنا لحاظ تو رہے اور بے باک نہ ہو جائے۔ ؎ اُن کو اغیار کا اسقدر پاس ہے کہ اُن کی بات کو جھٹلا نہیں سکتے۔ حتیٰ کہ جب اغیار یہ افواہ اُڑاتے ہیں کہ معشوق کو مومن سے الفت ہے تو بھی وہ تردید نہیں کرتے بلکہ اُن کی بات رکھنے کی خاطر مجھ سے دعوئ الفت کرتے ہیں۔ ؎ تیرا اختلاط وارتباط اگر بناوٹ سے نہیں تو بھی اس کو میرے نالوں کا اثر نہیں کہا جا سکتا کیونکہ میرے نالوں کے ایسے نصیب کہاں ہیں؟

کرتے[۵۴] ہو مجھ سے راز کی باتیں تم اس طرح
گویا کہ قول محرمِ اسرار ہے غلط

اُٹھ جا کہاں تلک کوئی باتیں اُٹھائیگا
ناصح تو خود غلط تری گفتار ہے غلط

تمہارا[۵۵] ربط غیر میں مرے مرنے کا انتظار
اے شوخ بیوفا تو وفادار ہے غلط

کیا[۵۶] جذب انتظار کی تاثیر بے وفا
منکر نہ ہو تو پہلے ہی اقرار ہے غلط

ہے[۵۷] حرف کامیابی دشمن میں ہمنشیں
مت کہہ درست وہم غلط کار ہے غلط

سچ تو یہ ہے کہ اُس بُتِ کافر کے دور میں
لاف و گزاف **مومنِ** دیندار ہے غلط

ردیف الظاء

۹۲	
ہاں تو کیونکر نہ کرے ترکِ بُتاں اے واعظ	ایسی حوریں تری قسمت میں کہاں اے واعظ
منتظر ہی کسی بُت کا تو نہیں تو کیوں ہے	مجلسِ وعظ میں ہر سو نگراں اے واعظ

(مجتو)

۵۴ تم مجھ سے بظاہر اسقدر رازداری کی باتیں کرتے ہو کہ میں یہ باور کرلوں کہ تم کو مجھ سے درحقیقت خلوص ہے اور تمہارے رازدار نے مجھے جو خبر دی ہے (کہ معشوق رقیب سے اتحاد رکھتا ہے) وہ درست نہیں۔ ۵۵ لوگ کہتے ہیں کہ معشوق مومن کے ساتھ وفادار ہے اسلئے کہ جب تک مومن نہ مرگیا اُس نے رقیب کے ساتھ ربط ضبط نہ رکھا۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ قول غلط ہے اسلئے کہ وفاداری کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ رقیب سے کبھی بھی نہ ملتا۔ گویا وہ اسکے لیے مومن کی موت کا منتظر تھا۔ اس میں یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ وہ رقیب سے بھی وفادار نہیں کیونکہ اس (رقیب) سے ملنے کے لیئے مومن کی موت کا انتظار روا رکھا۔

۵۶ معشوق نے عاشق کے جذبہ انتظار کی تاثیر کا انکار کیا اور کہا کہ اگر تمہارا جذب انتظار صادق ہوتا تو مجھے ضرور کھینچ بلاتا۔ عاشق جواب دیتا ہے کہ تم میرے جذبہ کی تاثیر کا انکار نہ کرو۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم نے آنے کا جو اقرار کیا تھا وہی پہلے سے غلط تھا۔ پھر اُس غلط وعدہ کی بنیاد پر میں نے جو انتظار کا ہوائی قلعہ بنا کھڑا کیا وہ بھی اگر بنا ء الفاسد علی الفاسد کی طرح کمزور ثابت ہوا تو میری کیا خطا۔ تمہارا ہی قصور ہے۔ ۵۷ میں نے کامیابی رقیب کے متعلق جو تخیل قائم کیا تھا وہ میرے وہم غلط کار کی تخلیق تھی۔ مگر اصلاً مجھے اسکی کامیابی پر شبہہ ہے۔ ہم نشین خدا کے لئے اس (واہمہ) کو سچ نہ جان حرف بمعنی شبہہ۔

اےؔ ذرا جان دہی کوئے بتاں کی باتیں
ہو چکا تذکرۂ باغ جناں اے واعظ

سچ ہے کافر تری تقریر سے کیونکر نہ جلیں
شعلۂ آتش دوزخ ہے زباں اے واعظ

حور کی مدح میں کیا ترک صنم کا مذکور
یہی باتیں ہیں مرے دل پہ گراں اے واعظ

ڈرؔ مری آہ سے ظالم نہ جلا جی کہ نہیں
یہ جہنم سے تو کم شعلہ فشاں اے واعظ

اہل جنت سے کرو دلبری حور کا ذکر
ایسی باتیں کوئی سنتا نہیں یاں اے واعظ

جوؔ ملیں تجھ سے بصد شوق وہ کیا ہونگی نہ کر
بس مرے سامنے حوروں کا بیاں اے واعظ

کیسےؔ آرام ہیں مرگ مگر کافر تو
اہل اسلام کا ہے دشمن جاں اے واعظ

شرمؔ کی بات نہیں ہے یہ اثر ہو کیونکر
نہ میں مومن ہوں نہ تو پیر مغاں اے واعظ

ردیف العین

کسؔ ضبط پر شرار فشاں ہے فغان شمع
اک برق تھی جو لال نہ ہوتی زبان شمع ۹۳

دلؔ گرمی فریب پہ بھی میں نثار ہوں
پروانہ کیا مجال کرے امتحان شمع

کوئے بتاں میں جان دہی (جان بخشی) کی جو خاصیت ہے اس کا بھی ذرا ذکر چھیڑ۔ تو جہنم سے ڈرا کر مجھے ترک عشق کی نصیحت کرتا اور میرا جی جلاتا ہے۔ مگر میری آہ سے نہیں ڈرتا۔ اور یہ بھی جہنم سے کم نہیں۔ نہیں اس پر مجھے جلا کر خاک کر دے۔ ۳ جو حوریں تجھ جیسے شخص سے بصد شوق ملیں گی وہ کس حیثیت کی ہونگی ظاہر ہے۔ ۴ تو اہل اسلام کو مرنے کے بعد آرام کی امید دلاتا ہے تاکہ

وہ راحت اخروی کی تمنا میں دنیا سے بیزار اور موت کے طلبگار ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تو مسلمانوں کا دشمن جان ہے۔ ۵ میں مومن ہوتا یا تو پیر مغاں ہوتا تو تاثیر ہوتی۔ یعنی مومن پر واعظ کا بیان اثر کرتا اور پیر مغاں کی بات اثر کرتی۔ مگر یہاں یہ دونوں باتیں مفقود ہیں۔ یہاں مومن نے اپنے کو غیر شخص تصور کیا ہے۔

۱ شمع کی فغان (خاموش) ضبط کے باوجود شرار سے برسا رہی ہے۔ اگر اس کی زبان لال (گونگی) نہ ہوتی تو دنیا کو برق کی طرح پھونک دیتی۔ شمع کی لو کو زبان شمع کہا جاتا ہے۔ ۲ دل گرمی = گرمجوشی۔ اختلاط۔ میں معشوق کی تصنع آمیز گرمجوشی پر بھی قربان ہوں۔ میری مثال پروانہ کی سی ہے اور اس کی شمع کی سی۔ پھر میں کیونکر اس کے صدق و کذب کا امتحان کر سکتا ہوں۔

۵۳ روشن ہے اہل بزم پہ شکوہ نسیم کا
اس بہکتی زبان پہ دیکھو بیان شمع

آتا ہے بیکسوں پہ تو جلاد کو بھی رحم
روتی ہے شمع آپ سر ۵۴ کشتگان شمع

مجھ بیگنہ کے قتل میں کیوں سوچ دیکھ لے
بن بولے لوگ کرتے ہیں قطع زبان شمع

۵۵ ہیں تار گریہ تار نفس اہل سوز کو
یعنی روان شمع ہے اشک روان شمع

۵۶ داغ جدائی دُر دندان و روے و زلف
ہے اشک شمع و شعلۂ شمع و دخان شمع

۵۷ ہے گرمی نفس کی ہیں اعضا گدازیاں
دیکھو نہ زندگی ہے سراپا زیان شمع

۵۸ اس کو بھی کوئی پردہ نشیں ہی جلائے ہے
فانوس سے سُنا ہے یہ راز نہان شمع

اک اور پڑھ وہ مومن شعلہ زباں غزل
جل جائیں جسکے رشک سے حاسد لبان شمع

۵۳ جب نسیم چلتی ہے تو زبانِ شمع کو جنبش ہوتی ہے۔ اس کو زبان شمع کا بہکنا قرار دیا ہے مطلب یہ ہے کہ اس بہکتی ہوئی زبان پر بھی شمع کا بیان اس قدر واضح ہے کہ تمام اہل بزم پر روشن ہو جاتا ہے کہ یہ نسیم کی دراز دستی کی شکوہ گذار ہے۔ ۵۴ کشتگانِ شمع = پروانے جو شمع کی محبت میں ہلاک ہوئے ہیں شمع سے قطرات کے ٹپکنے کو رونے سے تعبیر کیا ہے۔ ۵۵ اہل سوز کو تارِ گریہ ہی سانس کا تار ہے یعنی جب تک وہ روتے ہیں اُسی وقت تک زندہ ہیں۔ اِدھر رونا موقوف ہوا اُدھر رشتۂ حیات ٹوٹا۔ دیکھ لو شمع کے آنسوؤں ہی میں اُس کی زندگی مضمر ہے۔ جہاں اُس کا رونا (جلنا) بند ہوا وہیں ہستی بھی ختم ہو گئی۔ پہلے رواں کے معنی روح اور دوسرے کے معنی جاری ہیں۔ ۵۶ تیرے گوہر دنداں کے ہجر کا داغ شمع کے اشکوں کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ اسی طرح رُخ کی جدائی کا نتیجہ شعلۂ شمع اور زلف کی فرقت کا اثر دخانِ شمع کی شکل میں ظاہر ہوا ہے حاصل یہ ہے کہ تیری عدم موجودگی شمع کی سوزش کا باعث ہے۔ شعر میں لف ونشر مرتب ہے۔ دُرِ دنداں کی مشابہت اشک سے روے یار کی شعلے سے اور زلف کی دخان سے ظاہر ہے۔ ۵۷ اعضا کے پگھلنے کا باعث سانس کی گرمی ہے۔ دیکھ لو جب تک شمع زندہ رہتی ہے زیان (نقصان) میں رہتی ہے اور جب مر جاتی ہے تو سوز و گداز سے محفوظ رہتی ہے۔ ماحصل یہ ہے کہ دراصل رازِ بقا موت میں مضمر ہے۔ ۵۸ فانوس سے شمع کا یہ رازِ نہاں معلوم ہوا کہ اس کو بھی کوئی پردہ نشین جلاتا ہے۔ چونکہ فانوس ایک قسم کا پردہ ہے اسلئے شاعر کا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ اس کا جلانے والا کوئی پردہ نشین ہے جس نے جلانے میں بھی پردے کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔

۹۴

محفل فروز تھی تپشِ تاب نہان شمع ¹ — پروانہ جل گیا کہ نہیں رازدان شمع

تھا شب چراغ خانۂ دشمن وہ شعلہ رو — کیا کیا جلا ہے صبح تلک جی نہ سان شمع

اے سوز گریہ آگے تری آب و تاب کے — پانی ² بھرے ہے جلوۂ آتش فشان شمع

صحبت ³ میں ایک رات کی کیا محو ہو گئی — اُس بزم میں سحر کو نہ پایا نشان شمع

پہونچے تری نزاکت و گرمی کو کیا مجال — ہر چند موم جسم ہے اور شعلہ جان شمع

ہوں ⁴ داغ بدگمانی دل بسکہ یار پر — پروانہ کو ہے سادہ دلی سے گمان شمع

حیرت فزا ہے حسن بت کیا عجب اگر — تھم جائے تیری بزم میں اشک روان شمع

گر دیکھ لے رخ ⁵ عرق آلودہ کو ترے — گھل جائے سوز رشک سے تا استخوان شمع

ابتک ⁶ یہ سوز دل ہے کہ میرے مزار پر — مائل ہوا زمین کی جانب دخان شمع

لائیں ⁷ نہ تاب حرف بتان کافران عشق
پروانہ کو جحیم ہے مومن زبان شمع

۹۴ ¹ شمع کے سوز نہاں نے محفل کو روشن کر دیا۔ چونکہ پروانہ شمع کا رازداں نہ تھا اسلئے جل گیا ورنہ وہ بھی اُسکی روشنی سے متمتع ہوتا۔ شمع کے راز سے وہ سوز مراد ہے جو اُس (شمع) کے دل میں مخفی ہے۔ ² پانی بھرنا = اظہار عجز کرنا۔ ³ رات بزم یار کی آب و تاب دیکھکر شمع ایسی گم ہو گئی (فرطِ شوق میں اپنی ہستی بھول گئی) کہ صبح کو پتہ بھی نہ ملا۔ ⁴ ازبسکہ پروانہ کو سادہ لوحی سے معشوق پر شمع ہونے کا گمان ہے اور اسی دھوکے میں اُس پر آ آکر گرتا ہے اس لئے میں دل کی بدگمانی کی وجہ سے داغ داغ ہوا جاتا ہوں اور صدمۂ رقابت برداشت نہیں کر سکتا۔
⁵ شمع قطروں کے ٹپکنے کی وجہ سے محبوب کے رخ عرق آلودہ سے گونہ مشابہت رکھتی ہے۔ ⁶ مرنے کے بعد بھی میرے دل میں اس قدر جلن ہے کہ شمع مزار کا دھواں اوپر کرۂ نار کی جانب جانے کے عوض نیچے میری قبر کا رخ کرتا ہے کیونکہ الجنس یمیل الی الجنس۔ ⁷ جس طرح پروانہ کو شمع کی زبان جحیم (دوزخ) ہے یعنی جلا کر خاک کر دیتی ہے اسی طرح کافران عشق کو بھی بتوں کی بات کی تاب نہیں۔ مراد یہ ہے کہ عشاق بھی بتوں کی گفتگو سنکر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ لائیں مضارع ہے بمعنی حال۔

ردیف الغین

۹۵

مت کہہ شبِ وصال کہ ٹھنڈا نہ کر چراغ
ظالم جلا ہے میری طرح عمر بھر چراغ

۱؎ پروانے کیوں نہ صدقے ہوں اس آگ کے کہ ہے
ہر رشتۂ فتیلۂ زخمِ جگر چراغ

۲؎ وہ سوختہ جگر ہوں کہ پیمانہ و سبو
بنتے نہیں ہیں خاک سے میری مگر چراغ

۳؎ زلفیں اٹھاؤ رخ سے کہ دل کی جلن مٹے
بجھ جائے ہے جہاں میں وقتِ سحر چراغ

۴؎ اس مہروش کے جلوے کے قربان کیوں نہ ہوں
پروانہ کو بھی رات نہ آیا نظر چراغ

۵؎ کیا بے تکلف آئے صدا ہائے شمع رو
گر میرے آبِ اشک سے ہو نوحہ گر چراغ

۶؎ ہم پیشہ کے ہے سامنے عرضِ ہنر ضرور
جلتا ہے میرے گھر میں بطرزِ دگر چراغ

۷؎ کیا خوب روشنی ہے کہ چہرے کی تاب سے
ہے داغ بوالہوس تری مجلس میں ہر چراغ

۸؎ غم خانہ تنگ و تار ہے اور ہم سیاہ روز
جلتے ہیں اپنی جا پہ ہیں آنکھوں بہر چراغ

۹۸ ۱؎ سوزشِ دروں کی وجہ سے میرے زخمِ جگر کی بتی کا ہر ڈورا چراغ کا حکم رکھتا ہے۔ پھر پروانے اس پر کیوں نہ صدقے ہوں فتیلہ = بتی۔ یہاں وہ بتی جو زخم میں رکھی جائے مراد ہے۔ ۲؎ میری خاک سے پیمانہ و سبو نہیں بنتے چراغ بنتے ہیں۔ ۳؎ صبح ہوتے ہی چراغ بجھ جاتے ہیں۔ اسی طرح تمہاری زلفیں اٹھانے سے صبحِ رخسار نمودار ہوگی۔ اور میرے دل کی جلن دور ہوگی۔ رخ کو سحر اور دل کی جلن کو چراغ قرار دیا ہے۔ ۴؎ لفظ مہروش میں یہ رعایت ہے کہ مہر کی تجلی کے سامنے چراغ بے نور ہو جاتا ہے۔ ۵؎ قاعدہ یہ ہے کہ اگر چراغ کے تیل میں پانی پڑ جاتا ہے تو چراغ چڑچڑانے لگتا ہے۔ اسی کو چراغ کا نوحہ گر ہونا مانا ہے۔ یعنی اگر میرا آبِ اشک چراغ میں پڑ جائے تو اس سے بیساختہ "ہائے شمع رو" کی صدا آنے لگے۔ ۶؎ مومن نے اپنے کو چراغ کا ہم پیشہ کہا ہے کیونکہ جلنے میں دونوں شریک ہیں۔ یعنی چراغ میرے گھر میں خاص شان سے جلتا ہے اس واسطے کہ ہم پیشہ کے سامنے اظہارِ کمال ضروری ہے۔ ۷؎ تیرے چہرے کی روشنی کیا خوب ہے جس کے اثر سے مجلس میں ہر چراغ اس طرح ماند ہے جیسے رقیب کے دل کا داغ۔ تشبیہ نہایت پر لطف ہے۔ ۸؎ ہمارا غم کدہ تنگ و تاریک ہے اور ہم بدبخت آنکھوں بہر چراغ کی جگہ جلتے رہتے ہیں۔ اپنے جلنے کو چراغ کے جلنے سے تشبیہ دی ہے۔ اور ہم سیاہ روز مصرعِ ثانی سے متعلق ہے۔

ہے شام انتظار تماشائے سوختن
اس شعلہ رو نے تا کہ پسِ مرگ بھی جلو

جلتے ہیں تا بصبح ادھر ہم ادھر چراغ
جلوائے دشمنوں سے مری گور پر چراغ

مومن یہ شاعروں کا مرے آگے رنگ ہے
جوں پیش آفتاب ہو بے نور تر چراغ

۹۶

گلشن میں لالہ میں ہوں کہ ہے دل میں جائے داغ
اپنے تو دلنشیں نہیں کچھ بھی سوائے داغ

کیا دکھ نہ دیکھے عشق میں کیا کیا نہ پائے داغ
زخموں پہ زخم جھیلے ہیں داغوں پہ کھائے داغ

پہنا[1] ہے کس کا جامۂ گلدوز غیر نے
کیوں تنگ ہو گئی مرے تن پر قبائے داغ

کیا کہیئے گرمیانِ دلِ بیتاب کی کہ ہے
سینے میں ایک شعلۂ جوالہ[2] جائے داغ

کرتا[3] ہے سخت ناخنِ غم روخراشیاں
دل کو یہ کس کے چہرے کے چیچک بھائے داغ

اس رشکِ مہروم[4]ہ کی نشانی ہے دیکھنا
اے چشم اشکبار کہیں بہ نہ جائے داغ

چھوڑا[5] نہ لالہ زار میں ساتھ اس نے غیر کا
سو بار سینہ چیر کے میں نے دکھائے داغ

دیکھو تو سرد مہری چرخ اس سے گرم ہو
واں تو بغل رقیب کی یاں دل جلائے داغ

دوزخ میں کچھ عذاب نہ پایا زبسکہ میں
خو کردہ تھا بہ تاب و تپ شعلہ ہائے داغ

رہ تو بغل میں غیر کے سینے سے لگ کے یاں
پہلو برائے زخم ہے سینہ برائے داغ

۹۶ ۱؎ رقیب نے معشوق کا جامہ گلدوز پہنا ہے جسکے رشک سے میرے تن پر قبائے داغ تنگ ہو گئی یعنی میں داغہائے عشق سے بیزار ہو گیا۔ گلدوز = پھولوں کا کڑھا ہوا۔ ۲؎ شعلۂ جوالہ = چکر کھانے والا شعلہ۔ ۳؎ ناخنِ غم نے میرے چہرے کو کھرچ کرجا بجا داغ ڈالدئے ہیں۔ ۴؎ مہر و مہ کے الفاظ کے استعمال میں یہ خوبی ہے کہ دونوں میں داغ ہوتے ہیں۔ ۵؎ وہ لالہ زار میں غیر کے ہمراہ مصروف گلگشت رہا۔ ہر چند میں نے سینہ چیر کر داغہائے رشک دکھلائے۔ داغ اور لالہ زار کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ شعر میں نکتہ یہ ہے کہ میرے داغ لالہ زار سے کچھ کم نہیں۔

تاروں[٥٦] کے بدلے گن کے شبِ تار کاٹ دی — ایامِ ہجر میں مرے کیا کام آ سے داغ

جلتا[٥٧] ہوں اہل نار کی تبدیل جلد سے
مومن غضب ہے آتش لذت فزا کے داغ

ردیف الفاء

مجلس[١] میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف	۹۷	دیکھے ہے مجھکو دیکھ کے اغیار کی طرف
کتنا[٢] شعاعِ مہر نے حیراں کیا ہمیں		تکتے ہیں کب سے روزنِ دیوار کی طرف
وہم[٣] فغانِ غیر نے سینہ جلا دیا		آتش لگی تھی کوچۂ دلدار کی طرف
شامِ[٤] فراق خواب عدم کا ہے انتظار		آنکھیں لگی ہیں دولتِ بیدار کی طرف
اس[٥] نے دکھا دکھا کے مجھے چھیڑ دیکھنا		گل پھینکے عندلیب گرفتار کی طرف
ہے[٦] کیا قبول سجدہ شہیدانِ عشق کا		ہوں غوث سر جھکاتے ہی تلوار کی طرف

[٥٦] شبِ تارِ ہجر میں تارے تو کہاں تھے۔ داغ ہی گن گن کر رات بسر کی۔ [٥٧] قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے کہ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُوداً غَيْرَهَا یعنی ہم ہر بار کافروں کو عذاب دوزخ کا مزہ چکھانے کے لئے نئی کھال بدل دینگے۔ مومن کہتا ہے کہ داغ کی سوزش میں اسقدر لذت ہے کہ مجھے اہل دوزخ کی تبدیل جلد پر رشک آتا ہے۔ کاش مجھے بھی ہزار جسم ملتے اور ہر اک جسم داغوں سے معمور ہوتا۔

۹۷ [١] معشوق پہلے اغیار کی طرف دیکھ کر مجھکو دیکھتا ہے۔ اسکا مقصد اسکے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ میں رشک کی وجہ سے اس (معشوق) کی طرف دیکھنا چھوڑ دوں۔ [٢] روزن دیوار سے جو شعاع آفتاب نمودار ہوئی تو معاً ہم کو یہ گمان گذرا کہ جلوۂ یار ہے۔ اس لئے حیران ہو کر تکنے لگے۔ [٣] کوچۂ دلدار کی طرف آگ لگتے دیکھ کر ہم کو یہ شبہ ہوا کہ فغانِ رقیب کا اثر ہے۔ [٤] خواب عدم کو دولت بیدار کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شام فراق اگر موت کی نیند آجائے تو نصیبہ جاگ جائیں۔ [٥] عندلیب گرفتار کی طرف گل (جو معشوق عندلیب ہے) پھینکنے میں یہ چھیڑ تھی کہ اسکو اسکے معشوق سے ہمکنار دکھا کر مجھ محروم وصال کو جلایا جائے۔ [٦] غوث = فریادرس۔ اولیاء اللہ کا ایک طبقہ جسکے متعلق مشہور ہے کہ عبادت کے وقت اسکے اعضا و جوارح جدا ہو جاتے ہیں مراد یہ ہے کہ میں سر جھکاتے ہی مرتبۂ غوثیت پر فائز ہو جاتا ہوں۔

دیکھا نہ میرے دیدۂ خونبار کی طرف		دیکھ اشک لالہ گوں پہ رقیب اُس نے ہنس دیا
گذری نسیم آہ چمن زار کی طرف		گلبانگ نالہ ہے یہ نیا گُل کھلا مگر
کی آکے موت نے بھی تو اغیار کی طرف		اب رشک زخم یار پہ منصف کریں کسے
مُنہ پھر گیا ہے کوئے ستمگار کی طرف		دل بعد قتل بھی نہیں پھرتا کہ گور میں

کافر گلے لگا ہے تو مومن کے مت مگر
دیکھ اپنے نقش رشتۂ زنّار کی طرف

ردیف القاف

یہ قلق ہے کیسا کہ ہے ستم گئی جان پر نہ گیا قلق	۹۸	وہ جو زندگی میں نصیب تھا وہی بعد مرگ رہا قلق
کہ زمیں کو زلزلہ آئے ہے جو لٹائے مجھکو ذرا قلق		کسی کے خرام کی یاد میں تہِ خاک بھی یہ رہا قلق
یہ عذاب مرگ ہے یا تپش یہ خدا کا قہر ہے یا قلق		پیے ہم ہے حالت جانکنی غرض اتنو جان پر آ بنی
کوئی کیا جیئے جو ہو ایسا شب و روز صبح و مسا قلق		یہ کہاں کی جی کو بلا لگی مری ہائے کیونکہ ہو زندگی

شہ میری آہ کی ہوا شائد چمن کی طرف ہوکر گذری کہ نالہ میں گلبانگ کا اثر پیدا ہوگیا۔ یعنی نالہ نے آگ لگانے کی بجائے الٹی تاثیر دکھائی گلبانگ = آلاپ شادی۔ شہ معشوق نے رقیب کے زخم لگائے۔ اس پر مجھے رشک آیا۔ اب اس رشک کا انصاف کون کرے۔ موت سے اُمید تھی کہ وہ میرے رشک کی داد دیگی اور میرا کام تمام کردیگی مگر اُس نے بھی رقیب کی طرفداری کی اور اُسکو ختم کردیا گویا جو زخم کا ماحصل تھا اُس کو حاصل ہوگیا۔ ثہ پہلے مصرع میں پھرنا منحرف ہونے کے معنی میں ہے دوسرے میں متوجہ ہونے کے معنی میں ہے۔ شلہ کافر اپنے رشتۂ زنار کے نقش کی طرف دیکھ جو مومن کے جسم پر ہے اور جو اس امر کی شہادت ہے کہ تو ضرور مومن کے گلے لگا ہے۔ یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ نقش رشتۂ زنار جو تیرے جسم پر ہے اس کو دیکھ اور گلے لگنے سے نہ مکر۔ مگر پہلا مفہوم زیادہ قرین قیاس ہے۔

سلہ پیے ہم = پیہم۔ متواتر۔

۹۸

شبِ ہجر روزِ وصال کی تری شوخیاں جو نظر میں تھیں[۵۲]
کہوں کیا تغیرِ حالِ دل کبھی تھا سکوں کبھی تھا قلق

نہیں چاہ میری اگر اسے نہیں راہ دل میں تو کس لئے
مجھے روتے دیکھ وہ رو دیا مرا حال سنکے ہوا قلق

غمِ ہجرِ یار کے ہاتھ سے شب و روز ہوں میں عذاب میں
ہے ہمیشہ ایک نئی تپش ہے مدام ایک نیا قلق

شبِ وعدہ جذبۂ شوق سے ہوئی کشمکش یہ ستم ہوا
کہ وہ آتے آتے جو تھم گئے تو کسی طرح نہ تھما قلق

کہا جاں بلب ہوں جو آئے تو مری زندگی ہو تو یوں کہا
ترے جینے کی مجھے کیا خوشی ترے مرنے کا مجھے کیا قلق

ق

یہ شرارتوں[۵۳] کی شکائتیں یہ جلانا غیر کا دیکھیو
کہے مجھسے وہ ترے ہاتھ سے نہیں چین مجھکو سوا قلق

نظر ابر پر جو کبھی پڑے تو خیال رونے کا آ بندھے
جو تپش کو برق کی دیکھوں تو مجھے یاد آئے ترا قلق

یہی[۵۴] دین اگر ہے تو چھوڑ دو طرف اس صنم کے نہ رخ کرو
جسے مومن آپکے واسطے ہے مثالِ قبلہ نما قلق

۹۹

قہر ہے موت ہے قضا ہے عشق
سچ تو یہ ہے بری بلا ہے عشق

اثرِ غم ذرا بتا دینا
وہ بہت پوچھتے ہیں کیا ہے عشق

آفتِ جاں ہے کوئی پردہ نشیں
کہ مرے دل میں آ چھپا ہے عشق

[۵۲] ہجر میں تیری شوخیاں جو نظر میں تھیں اسلئے دل کو قلق ہوتا تھا اور چونکہ وصال کی یاد دل میں تھی اسوجہ سے سکون ہوجاتا تھا۔ [۵۳] یہ اور شعر مابعد قطعہ بند ہیں۔ معشوق کی شرارت آمیز شکایت دیکھو کہ غیر کے جلانے کو مجھ سے کہتا ہے کہ مجھے تیرے ہاتھ سے کبھی چین نہیں چنانچہ جب ابر کو دیکھتا ہوں تو تیرے رونے کا خیال آ بندھتا ہے اور برق کی تڑپ پر نظر کرتا ہوں تو تیرا اضطراب یاد آ جاتا ہے۔ [۵۴] مومن جس (معشوق) کو تمھاری محبت میں قبلہ نما کی طرح بیقراری ہے اُس کو چھوڑ دینا اور اُس کی طرف رُخ نہ کرنا اگر دین اسلام کا مقتضا ہے تو خیر اُس (معشوق) کو چھوڑ دو۔ اُس میں طنز کا پہلو ہے یعنی دین ایسی بیوفائی کی تعلیم نہیں دیتا۔

۹۹ [۱] میرے دل میں عشق چھپا ہے۔ یہ اس امر کی شہادت ہے کہ کسی پردہ نشین کی بدولت میری جان پر آفت آئی ہے۔

بوالہوس اور لاف جانبازی
کھیل ہی کیا سمجھ لیا ہے عشق

وصل[۵۲] میں احتمال شادی مرگ
چارہ گر درد بے دوا ہے عشق

سوجھے[۵۳] کیونکر فریب دلداری
دشمنِ آشنا نما ہے عشق

کس[۵۴] ملاحت سرشت کو چاہا
تلخ کامی پہ بامزا ہے عشق

ہم[۵۵] کو ترجیح تم پہ ہے یعنی
دلربا حُسن و جاں رُبا ہے عشق

دیکھ[۵۶] حالت مری کہیں کافر
نام دوزخ کا کیوں دھرا ہے عشق

دیکھیے کس جگہ ڈبو دے گا
مری کشتی کا ناخدا ہے عشق

اب تو دل عشق کا مزا چکھا
ہم نہ کہتے تھے کیوں بُرا ہے عشق

آپ[۵۷] مجھ سے نباہیں گے سچ ہے
باوفا حُسن بیوفا ہے عشق

میں[۵۸] وہ مجنون وحشت آرا ہوں
نام سے میرے بھاگتا ہے عشق

قیس و فرہاد و وامق[۵۹] و مومن
مر گئے سب ہی کیا وبا ہے عشق

۵۲ عشق میں اگر ہجر سے سابقہ پڑا تو موت یقینی ہے ہی وصل میں بھی فرط شادی سے مرجانے کا احتمال رہتا ہے۔ غرض معلوم ہوا کہ عشق ہر حال میں ایسا مرض ہے جس کا علاج نہیں۔
۵۳ عشق ایسا دشمن ہے جو بظاہر دوست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں عشق میں فریب دلداری کا احساس نہیں ہو سکتا۔ یعنی اُس کے فریب پر عنایت کا گمان ہوتا ہے حالانکہ دراصل وہ عنایت نہیں ہے
۵۴ کس معشوق ملیح کے چاہنے کا یہ اثر ہے کہ تلخیوں کے باوجود عشق میں مزا ہے۔ ملاحت تلخ کامی اور مزہ میں رعایت ہے۔ ۵۵ وجہ ترجیح یہ ہے کہ دل سے جان زیادہ گرانمایہ ہے۔ مگر فرق اتنا ہے کہ حُسن دوسروں کا دل لیتا ہے اور عشق خود عاشق کی جان لے کر رہتا ہے۔ ۵۶ او کافر کہیں میری حالت تو دیکھ جس کی بدولت میری جان مصیبت میں ہے اِسکا نام عشق نہ رکھو۔ یہ تو دراصل عذاب دوزخ ہے۔
۵۷ اس شعر میں سرتاسر طنز ہے۔ ۵۸ یعنی جنون اس حد تک پہونچ گیا ہے کہ آداب عشق بھی بالائے طاق ہیں
۵۹ وامق عذرا کا عاشق تھا۔

ردیف الکاف

100

امتحاں[1] کے لئے جفا کب تک | التفاتِ ستم نما کب تک

غیر[2] سے بیوفا ہو تم تو کہو | ہے ارادہ نباہ کا کب تک

جرم[3] معلوم ہے زلیخا کا | طعنۂ دستِ نارسا کب تک

تجھ[5] سا عاشق نہیں ہے کچھ ظالم | صبر آخر کرے وفا کب تک

دیکھئے خاک[6] میں ملاتی ہے | نگہ چشمِ سرمہ سا کب تک

کہیں[7] آنکھیں دکھا چکو مجھکو | جانب غیر دیکھنا کب تک

نہ بلائیں[8] گے وہ نہ آئیں گے | جوش لبیک و مرحبا کب تک

ہوش[9] میں آ تو مجھ میں جاں نہیں | غفلت جرأت آزما کب تک

لے شب وصل غیر بھی کاٹی | تو مجھے آزمائے گا کب تک

تم کو خو ہو گئی برائی کی | در گزر کیجئے بھلا کب تک

ہم چلے اب تو اس صنم سے ملیں
مومن اندیشۂ خدا کب تک

100 ۱ جفا جو امتحان کی غرض سے کی جائے در اصل ایک قسم کا التفات ہے جو بظاہر ستم کہا جا سکتا ہے۔
۲ تمھارا غیر سے نباہ کا ارادہ کب تک ہے۔ یعنی تم غیر کو بے وفا کہتے ہو۔ یہ تو بتاؤ کہ تم باوفا ہو یا نہیں۔
۳ زلیخا نے حضرت یوسفؑ کے دامن پر ہاتھ بڑھایا مگر رسائی میسر نہ ہوئی۔ شاعر کہتا ہے کہ تم جو زلیخا کا جرم جرم بتاتے ہو ہمیں سب معلوم ہے۔ (یعنی کوئی جرم نہ تھا۔) اصل میں تم اس بات کا طعنہ دیتے ہو کہ اسکا ہاتھ (کامیابی کے ساتھ) دامن یوسف[4] تک رسا نہ ہوسکا اور در پردہ تمھیں ہماری ناکامی پر طنز کرنا مقصود ہے۔ یہ تم پر ہو رہی ہے اسکا مطلب ہم سمجھتے ہیں۔ ۵ تجھ سا عاشق تو ہے نہیں جو ہمیشہ وفا کرتا رہے۔ آخر ایک دن دامن صبر ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔ ۶ سرمہ اور خاک کی مناسبت ظاہر ہے۔ ۷ جتنی نظر عتاب کرنا ہے تو کر چکو اس کے لئے غیر سے اجازت چاہنے کی کیا حاجت۔
۸ جب یہ حال ہے تو میں کب تک لبیک اور مرحبا کہتا رہوں۔ لبیک۔ میں خدمت کو حاضر ہوں۔ مرحبا۔ تمھارے لئے گھر کشادہ ہے۔ پہلا لفظ بلانے کے جواب میں اور دوسرا کسی کے آنے کے موقع پر استعمال ہوتے ہیں۔ ۹ تم اس لئے غفلت کر رہے ہو کہ میری جرأت کا امتحان کرو۔ مگر یہاں جان ہی باقی نہیں۔

۱۰۱

ہم ہیں[1] اور نزع شب ہجر میں جاں ہونے تک
صبر آتا ہے کوئی تاب و تواں ہونے تک

آسماں[2] فتنہ کچھ ایسا نہیں لے اہل جہاں
کوئی باقی نہیں رہنے کا اماں ہونے تک

شمع[3] ساں اپنی تپش ہے تو سُنے یا نہ سُنے
طے نہ ہووے گا یہ افسانہ زباں ہونے تک

اس[4] چمن زار کا حسرت سے نظارہ کر لے
اے نگہ دیدۂ ہر سو نگراں ہونے تک

کون[5] جیتا ہے نگاہوں میں سُبک ہونے کو
سخت جانی ہے ترے دل پہ گراں ہونے تک

گر یہی نالۂ جانکاہ کے ہیں شور و شغب
دم رہا کا ہے کو تاثیر فغاں ہونے تک

ہائے[6] شاید کہ وہ سرمایۂ حُسن آجاوے
کچھ نہ کچھ فائدہ ہے جی کے زیاں ہونے تک

غم[7] و غصہ سے ہے خلقت مری جوں طفل سرشک
نہیں کرنے کی وفا عمر جواں ہونے تک

ضد[8] ہوئی محتسب و پیر مغاں میں مومن
عید ہر روز ہے اب کی رمضاں ہونے تک

۱۰۱ [1] جب تک، جان ہے شب ہجر میں نزع کی سی حالت رہیگی۔ اس لیئے کہ جب تک طاقت باقی ہے بیقراری کا دور ہوتا معلوم۔ [2] آسمان کوئی معمولی فتنہ نہیں۔ جب تک امان کا اعلان عام ہوگا تمام اہل جہان ہلاک ہو جائینگے۔ [3] شمع کی زبان جب تک باقی ہے تپش جاری رہیگی۔ یہی میرا حال ہے۔ [4] یعنی جب تک آنکھ میں ہر طرف دیکھنے کی قوت باقی ہے یا اس سے قبل کہ آنکھ ہر جانب یاس سے دیکھے دنیا کی بہار دیکھ لے۔ حسرت میں یہ مفہوم ہے کہ بہار باغ دنیا چند روز ہے۔ [5] ہماری سخت جانی اُسی وقت تک ہے جب تک ہم تیرے دل پر گراں نہیں۔ جب بار خاطر ہونگے خود جان دیدینگے۔ سُبک اور گراں میں بظاہر تضاد ہے گو معناً یک گونہ اتحاد ہے۔ [6] جان کا نقصان کرنے میں کچھ نہ کچھ فائدہ تو ہے۔ شاید وہ سرمایۂ حُسن (معشوق) کبھی از راہ قدر دانی اِدھر آنکلے۔ سرمایہ۔ فائدہ۔ زیان میں رعایت ہے۔ [7] آنسو کو مچلنے کے اعتبار سے طفل کہا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ طفل اشک کی طرح میری خلقت غم و غصہ سے ہوئی ہے اسلیئے جوان ہونے سے قبل ہی غم مجھے فنا کر دے گا۔ ظاہر ہے کہ "طفل اشک" بھی کبھی جوانی کو نہیں پہونچتا۔ [8] محتسب و پیر مغاں کی ضد میں میخواروں کی بن آئی۔ اسلیئے رمضان بھر ہر روز عید رہیگی۔ اس غزل میں بعض جگہ "تک" ابتدائیہ ہے بعض جگہ انتہائیہ جیسا کہ ظاہر کر دیا ہے۔

پھر نچھوڑوں گو وہ کر دے چاک جیب جاں تلک	۱۰۲	ہاتھ پہونچا چاہیے اُس شوخ کے داماں تلک
خاک[۱] دے آنکھوں کو میری گرد اٹکی مجھ سے تو		سب مکدر رہیں ہوائے کوچہ جاناں تلک
اوّلِ اُلفت ہے یارب وصل ہی میں ہو وصال		ہم کو تو جیتا نہ دیکھیو آمدِ ہجراں تلک
سینے سے گھبرا کے آخر جان لب پر آگئی		حال پہونچا یاں تلک اور تم نہ آئے یاں تلک
کل کا جلسہ بھولتا ہرگز نہیں لے اضطراب		آج پھر لے چل کسی ڈھب سے مجھے تو واں تلک
گر مثل[۲] سچ ہے کوئیں کے پاس پیاسا آرہے		کیوں نہ آ پہونچی زلیخا مصر سے کنعاں تلک
طالعِ برگشتہ[۳] اے شوقِ شہادت دیکھنا		مرگ و قاتل پھر گئے سب خنجر براں تلک
نیند میں یارب دوپٹہ کس کے منہ سے ہٹ گیا		ہے زمیں سے روشنی افلاک نورافشاں تلک

شوق[۴] بزمِ احمد[۵] و ذوقِ شہادت ہے مجھے
جلد مومن لے پہونچ اُس مہدیِ دوراں تلک

ردیف الکاف الفارسی

لگائی آہ نے غیروں کے گھر آگ	۱۰۳	ہوئے کیا کیا وہ اتنی بات پر آگ
وفورِ اشک و طغیانِ فغاں ہے		کدھر جاؤں اِدھر پانی اُدھر آگ

۱۰۲ [۱] مجھ سے تو سب مکدر رہیں حتیٰ کہ ہوائے کوچۂ جاناں بھی۔ پھر وہ میری آنکھوں تک اُس کوچے کی گرد کیوں لانے لگی۔ [۲] چوں کہ حضرت یوسفؑ کنوئیں میں ڈالے گئے تھے اسلئے مثل میں لطافت پیدا ہوگئی۔ [۳] برگشتگی قسمت کہ شوق شہادت پورا نہ ہوا اور موت و قاتل سے لیکر خنجر تک سب ہم سے منحرف ہوگئے۔ [۴] احمد سے مراد سید احمد صاحب رائے بریلوی ہیں جن سے مومن نے بیعت کی تھی۔ اُنھیں کو مہدیِ دوراں کہا ہے۔

سمندر[۱] کر دیا آتش رخوں نے — کہ گر پڑتا ہوں آتے ہی نظر آگ

جلایا[۲] آتشِ ہجراں نے دل کو — ترے گھر میں لگی اے بے خبر آگ

نچوڑیں[۳] گے ہم اپنا دامنِ تر — جہنم میں ہے اے واعظ اگر آگ

وہاں[۴] تابِ رخ و یاں آتشِ دل — جدھر دیکھو ادھر ہے جلوہ گر آگ

جلے کیا کیا شجر تربت پہ میری — دبی تھی لاش کے بدلے مگر آگ

زبس[۵] غیروں سے ہے وہ گرمِ صحبت — مرا جلتا ہے جی کیا دیکھ کر آگ

دھواں اٹھتا ہے دل سے وقتِ گریہ — بجھا دی تو نے کیا اے چشمِ تر آگ

حصولِ سوزِ دل جز داغ کیا ہو — کہ نخلِ شعلہ لاتا ہے ثمر آگ

نکالا[۶] رنگ عالم سوز کس نے — یہ کیوں بکھری پڑتی ہے دربدر آگ

پڑھے **مومن** نے کیا کیا گرم اشعار — بھری تھی دل میں یا رب کس قدر آگ

ردیف اللام

انتے

مجھ پر بھی تجھ کو رحم نہیں ہے کہ سخت دل — ۱۰۴ — کم ہوئے گا جہاں میں تجھ سا بھی سخت دل

داغِ[۱] جنوں و سنگِ درِ یار ہو نصیب — کرتا ہے رات دن ہوسِ تاج و تخت دل

۱۰۳ ۱؎ آتش رخ حسینوں کے غمِ عشق نے سمندر کی طرح مجھے آگ کا خوگر کر دیا ہے کہ جہاں آگ نظر آتی ہے میں اُس میں گر پڑتا ہوں۔ سمندر موش کے برابر ایک جانور ہے جو آتشکدوں میں پیدا ہوتا ہے اور آگ سے نکلتے ہی مر جاتا ہے۔ ۲؎ دل میں (جو تیرا گھر ہے) آگ لگی ہے اور تجھے خبر نہیں۔ اس شعر میں مکر شاعرانہ ہے ۳؎ اگر دوزخ میں آگ ہے تو ہم اپنا دامنِ تر نچوڑ کر اُس کو سرد کر دینگے دامنِ تر = وہ دامن جو آلودۂ گناہ ہے۔ شاعرانہ رعایت ہے اور رندانہ شوخی۔ ۴؎ مصرع اول میں واو عطف کا استعمال غیر فارسی و عربی الفاظ میں ہے جو اب متروک ہے۔ ۵؎ آگ کو دیکھکر معشوق کی غیروں سے گرمجوشی یاد آجاتی ہے ۶؎ یہ جو دربدر آگ بکھری پڑی ہے کسکی عالم سوز (جہان کو جلانے والی) ادا کا اثر ہے۔

۱۰۴ ۱؎ داغِ جنوں کو تاج اور سنگِ در کو تخت سے تشبیہ دی ہے۔

گر جانتے کہ ہے شبِ ہجراں یہ کچھ بلا — دیتے کسی کو کاہے کو ہم تیرہ بختِ دل
الماس[1] ریزہ تھے مرے آنسو کہ ضبط سے — ہے پاش پاش سب جگر و لختِ لختِ دل

کیا[2] شبہہ مومن آہن و قمری کے کفر میں
کرتے ہیں نذرِ جلوۂ سنگ و درختِ دل

مردِ[1] عشق ستیزہ کار ہے دل — ۱۰۵ — ملک الموت سے دوچار ہے دل
بسکہ[2] مشتاقِ نازِ یار ہے دل — ستم آموزِ روزگار ہے دل
زلفِ مشکیں میں کاہے کو رکھتے — کیا خبر تھی انھیں فگار ہے دل
وصلِ[3] جاناں کہاں سوائے خیال — ہم ہیں مایوس امیدوار ہے دل
دیکھ[4] افراطِ زخم و کثرتِ داغ — سینہ گلزار و لالہ زار ہے دل
بس[5] کہ تھے ہمزباں گلے میں ترے — دل سے میں مجھ سے شرمسار ہے دل

[1] قاعدہ ہے اریزۂ الماس کھانے سے جگر اور دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔

[2] آہن سنگ مقناطیس سے کھنچ آتا ہے اور قمری درخت سرو پر عاشق ہوتی ہے۔ اسلئے دونوں کو کافر ٹھیرایا۔ کیونکہ پتھر اور درخت سے عقیدت رکھنا مومن کے نزدیک کفر ہے۔

۱۰۵ [1] میرا دل عشق فتنہ گر کا مرد (حریف) ہے گویا دراصل ملک الموت سے ہم نبرد ہے۔ عشق کو ملک الموت قرار دیا ہے۔ [2] میرا دل چاہتا ہے کہ محبوب ناز کرے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اُس کی ادائیں دیکھکر زمانہ بھی ظلم سیکھ جائے گا اور اس ستم آموزی کا باعث دل ٹھیرے گا۔

[3] وصل یار کہاں میسر ہے۔ البتہ دل نے فرضی تخیلات کی دنیا پیدا کر لی ہے یہی وجہ ہے کہ دل وصل یار کا امیدوار ہے۔ اگرچہ میں مایوس ہوں۔ [4] زخم کو گلزار سے اور داغ کو لالہ زار سے جو مناسبت ہے ظاہر ہے۔ [5] چونکہ میرا دل تیری شکایت میں میرا شریک تھا اسلئے میں دل سے اور دل مجھ سے شرمندہ ہے۔

بے دوا درد و بیوفا ہے وہ شوخ — بے اثر آہ و بے قرار ہے دل

تیرہ[۶] بختوں کے پیچ و تاب نہ پوچھ — غیرت زلفِ تابدار ہے دل

اِس[۷] کہ اُس نے جلا کے خاک کیا — سرِ عشّاق کا غبار ہے دل

کیا[۸] کہوں مَیں ہجوم یاس و اُمید — رشکِ ہنگامِ انتظار ہے دل

شبِ[۹] ہجراں کو سمجھا روزِ جزا — مومن ایسا سیاہ کار ہے دل

۱۰۶

کیا کروں کیونکہ روکوں ناصح رُکا جاتا ہے دل — پیش کیا چلتی ہے اُس سے جب پہ آ جاتا ہے دل

سوزشِ[۱۰] پروانہ دکھلاتے ہو کیا مَیں کیا کہوں — دیکھ جلتے شمعِ محفل کو جلا جاتا ہے دل

یاالٰہی مجھ کو کس پردہ نشیں کا غم لگا — سینے میں اندر ہی اندر کچھ گھلا جاتا ہے دل

حیرتِ[۱۱] دیدار بس آئینہ رکھ دے ہاتھ سے — اپنی حالت دیکھ کر ظالم کٹا جاتا ہے دل

۶ تیرہ بختوں کے رنج و غم کا کیا پوچھنا - اُنکا دل پیچ و تاب میں زلف پُر پیچ سے بھی بڑھا ہوا ہے -

۷ معشوق نے دل جلا کر خاک کر دیا اس سے دل کو یہ سرفرازی ملی کہ اب وہ غبار بنکر سرِ عشاق تک پہونچا ہے - ۸ ہنگام انتظار بھی یاس و اُمید کا ہجوم ہوتا ہے - اس لئے اپنے دل کو رشک ہنگام انتظار قرار دیا ہے -

۹ میرا دل ایسا گناہ گار ہے کہ شبِ ہجراں جیسی مصیبت عظمیٰ کو اپنی مکافات عمل کا دن سمجھا - یعنی جس کا روز جزا اس قدر تاریک ہو اُس کی سیاہ کاری کا کیا ٹھکانا -

۱۰ تم مجھے پروانہ کا جلنا دکھا کر یہ جتاتے ہو کہ عاشق یوں جلا کرتے ہیں - مگر میری حالت یہ ہے کہ شمع کو جلتے دیکھکر اس خیال سے میرا دل جلا جاتا ہے کہ اس کو اپنے عاشقوں سے دلسوزی ہے مگر تم کو مطلق نہیں

۱۱ عاشق نے جو جمال یار سے حیرت زدہ ہے اتفاق سے آئینہ اُٹھا لیا ہے - مگر آئینہ میں یہ دیکھکر کہ حیرت دیدار نے کیا صورت بنا دی ہے - رنج یا شرم سے کٹا جاتا ہے -

کوئی سنتا ہی نہیں بکتا ہے کیوں دیوانہ وار
میرے دل کے ساتھ ناصح کا بھی کیا جاتا ہے دل

مست بگڑے تو مزہ گردی سے مری انصاف کر
کچھ بھی بن آتی ہے جب اے بیوفا جاتا ہے دل

وہ ستمگر دلبر عالم ادھر آتا ہے اب
کیا بنے گی دیکھئے رہتا ہے یا جاتا ہے دل

ہاتھ اٹھائے کس کے دل سے کس کے سینے پر دھرے[۵۴]
ہاتھ سے اغیار کا بھی تو چلا جاتا ہے دل

آہ گریہ دم اندوہ بے موجب نہیں[۵۵]
سینے میں رکتا ہے جب آنکھوں میں آ جاتا ہے دل

چاہتا ہوں میں تو مسجد میں رہوں مومن ولے
کیا کروں بت خانہ کیجانب کھنچا جاتا ہے دل

ردیف المیم

۱۰۷

شام سے تا صبح مضطر صبح سے تا شام ہم[۱]
ایک عالم میں ہیں کیوں اے گردش ایام ہم

شب رہے تجھ بن زلبس بیچین بے آرام ہم
صبح تک رویا کئے لے لے کے تیرا نام ہم

یار و دشمن نے ستایا جبکہ ہم عاشق ہوئے[۲]
بے گنہ اپنا ہی پھر دیویں کسے الزام ہم

کیا مزہ پایا عدو سے بے مزہ ہو آپ نے[۳]
تلخکام عشق ہیں تھے لائق دشنام ہم

۵۴ اغیار کا دل بھی تو اکثر ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ پھر اتنوں میں محبوب کس کس کی دلداری کرے۔
۵۵ غم کے وقت رونے کی علت یہ بیان کی ہے کہ دل جب سینے میں رکنے (گھبرانے) لگتا ہے تو آنکھوں کی راہ (آنسو بنکر) نکلنے کی کوشش کرتا ہے

عد ۱ ۱ یعنی گردش ایام کا تقاضا تو یہ تھا کہ شام کو کچھ اور حالت ہوتی صبح کو کچھ اور مگر یہاں ہر وقت یکساں بیتابی ہے
۲ نہ ہم عاشق ہوتے نہ معشوق و رقیب ہم پر ظلم کرتے۔ ۳ عدو سے بے مزہ (برہم) ہو کر آپ نے کیا مزہ پایا آخر یہی نتیجہ ہوا کہ وہ آپ سے بگڑ بیٹھا۔ از بسکہ ہم تلخکام عشق ہیں اسلئے اس بدسلوکی کے ہمیں مستحق و قدردان تھے نہ کہ عدو۔

بسکہ اک پردہ نشیں کے عشق میں ہے گفتگو | بات بھی کرتے نہیں جز صنعتِ ایہام[۱] ہم
آن بیٹھا کون کوٹھے پر جو یوں حیران سے | خاک پر چپکے پڑے تکتے ہیں سوئے بام ہم
تو خبر لا کیا کہا قاصد سے چپکے پھرتے ہیں[۲] | ہمدم اُس پردہ نشیں کو بھیج کر پیغام ہم
اس سیہ بختی پہ رکھیں تجھ سے اُمیدِ وفا | ایسے سودائی نہیں اے شوخِ لیلیٰ فام ہم
آئنہ کا بوسہ لے تو عکس لب کو دیکھ کر | اور بس رہ جائیں یوں ناکام اے خودکام ہم
پہونچتے واں تک تو اُس پردہ نشیں کو دیکھتے | کاش ہوتے چشمِ نرگس دیدۂ بادام ہم

گر ترے[۳] کوچے کو دی کعبہ سے نسبت کیا گناہ
مومن آخر تھے کبھی اے دشمنِ اسلام ہم

۱۰۸

سرمہ[۱] ہیں اُس چشمِ جادو فن میں ہم | خاک ڈالیں دیدۂ دشمن میں ہم
ناتواں تھے[۲] پر نچھوڑا مشتِ خار | خود اُلجھ کر رہ گئے دامن میں ہم
غیر کو جھانکا تو ڈھیلے آنکھ کے | دیکھنا رکھ دیویں گے روزن میں ہم
پھولے جامہ میں سماتے ہی نہیں | وصلِ شوخِ چست پیراہن میں ہم
اور شبنم[۳] دن کو ٹھہرے کیا مجال | روئے ہیں اے مہروش گلشن میں ہم

۱ ایہام ایک صنعت ہے جس میں دو معنی کا لفظ استعمال کیا جائے اور معنی قریب چھوڑ کر معنی بعید مراد لئے جائیں چونکہ ایہام میں بھی پردہ گفتگو ہوتی ہے اسلئے پردہ نشین کی رعایت ظاہر ہے۔ ۲ عاشق نے معشوق پردہ نشین کو قاصد کی معرفت پیغام بھیجا ہے۔ اب شرمندگی اور اندیشہ ہے کہ معشوق اس حرکت کو منافی عصمت سمجھکر ناراض نہ ہو اسلئے ہمدم سے جواب دریافت کراتا ہے چھپتے پھرتے ہیں کا تعلق مصرع ثانی سے ہے۔ ۳ آخر پہلے تو ہم مومن تھے اور کعبے کا احترام کرتے تھے۔ اب اگر سابق احترام پر نظر کرتے ہوئے تیرے کوچے کو کعبہ سے نسبت دیدی تو کیا گناہ کیا۔

۱۰۸ ۱ ہم محبوب کی چشم سحر ساز میں سرمہ ہیں۔ یعنی اُسکی آنکھوں میں ہماری جگہ ہے۔ اب مناسب ہے کہ ہم رقیب کی آنکھ میں خاک جھونکیں اور اُس کو ذلیل کریں۔ ۲ ہم ناتوانی کی وجہ سے دامن یار میں اُلجھ کر رہ گئے۔ اگر توانائی ہوتی تو دامن ہی کو کھینچ لیتے۔ ۳ گلشن میں ہمارے آنسو بکھرے ہوئے ہیں۔ شبنم نہیں ہے اسلئے کہ شبنم دن میں آفتاب کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔ شبنم۔ دن۔ مہروش۔ اور گلشن کی رعایت ظاہر ہے۔

کر دیا اُس جلوہ نے مجنوں چلو — خاک اُڑائیں وادیِ ایمن میں ہم
دل میں ناصح آئے کیا اپنا خیال — جا سکے کب یار کے مسکن میں ہم
جوشِ وحشت نے اُٹھایا لاش کو — اپنے پانوں سے گئے مدفن میں ہم

توڑنا مومن نہ پیمانِ الست
ہیں مسلّم عاشقی کے فن میں ہم

۱۰۹
پاتے تھے چین کب غمِ دوری گھر میں ہم — راحت وطن کی یاد کریں کیا سفر میں ہم
اس طرح خاک چھانتے پھرتے نہ دشت دشت — ہوتے جو پائمال کسی رہگذر میں ہم
لکھتے ہیں اک پری کو کچھ آوارگی کا حال — باندھیں گے نامہ طائرِ مجنوں کے پر میں ہم
تھیں دشت سے زیادہ تر اُس کو میں سختیاں — کیا چھوڑیں سر تصورِ دیوار و در میں ہم
ہے یاد رطب و یابس تقریرِ ناصحاں — کیا بولیں شکوۂ سفرِ بحر و بر میں ہم
یکساں ہے شامِ غربت و صبحِ وطن اثر — پائیں فغاں شب میں نہ آہِ سحر میں ہم

[1] شاعر نے چلو کا خطاب خود اپنی ذات سے کیا ہے جلوہ کی رعایت سے وادیِ ایمن کی اور مجنون ہونے کی بنا پر خاک اُڑانے کی ضرورت ہے۔ [2] یار کے مسکن میں میری رسائی محال ہے اور میرا دل ٹھہرا یار کا مسکن۔ یہی وجہ ہے کہ اُس میں میرا خیال بھی نہیں آ سکتا۔ اپنی خود فراموشی کی نئی توجیہ کی ہے۔ [3] پیمانِ الست = عہدِ ازل۔ جبکہ خدا نے ارواح سے خطاب فرمایا تھا الست بربکم کیا میں تمھارا پروردگار نہیں ہوں سب نے جواب دیا بلیٰ بیشک تو ہمارا پروردگار ہے۔

۱۰۹ [1] طائرِ مجنوں = وہ پرندہ جس نے مجنوں کے سر میں آشیانہ بنا لیا تھا۔ پری آوارگی۔ طائرِ مجنوں کی رعایت ملحوظ رہے۔ یہ غزل حالتِ سفر میں لکھی تھی۔
[2] ہم سفرِ بحر و بر کی شکایت کیا کریں اسلئے کہ (وطن میں) ناصحوں کی تقریروں کا ہر رطب و یابس یاد ہے جو مصائبِ سفر سے زیادہ ناگوار تھا۔ رطب و یابس (تر و خشک) اور بحر و بر میں تقابل ہے۔
[3] ہمارے لئے شامِ غربت اور صبحِ وطن دونوں برابر ہیں۔ اسلئے کہ اب نہ رات کی فغاں میں اثر باقی ہے نہ سحر کی آہ میں۔ لفظ اثر مصرعِ ثانی سے متعلق ہے۔

اُس[۱] گل کے غم میں پھولتے پھلتے تو رشک سے ۔۔۔ کیوں جلتے سایۂ شجرِ بارور میں ہم
دِلّی سے رامپور میں لایا جنوں کا جوش ۔۔۔ ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم
جائیں[۲] اثر جب اے رقمِ جذبِ اشتیاق ۔۔۔ دیکھیں زمامِ ناقہ کفِ نامہ بر میں ہم

وصلِ[۳] بتاں کے دن تو نہیں یہ کہ ہو وبال
مومن نماز قصر کریں کیوں سفر میں ہم

۱۱۰

غمِ ابرو میں بھرتے ہیں دمِ شمشیر اکثر ہم ۔۔۔ کیا کرتے ہیں اپنے قتل کی تدبیر اکثر ہم
کماں[۱] کھینچے ہے وہ اور ہم خجالت سخت جانی سے ۔۔۔ وہ دل توڑے ہے اپنا اور اسکے تیر اکثر ہم
کسی کی زلفِ پیچیدہ کے کیا سودے میں بکتے ہیں ۔۔۔ کیا کرتے ہیں کیا کیا پیچ کی تقریر اکثر ہم
چمن[۲] کو جھانکتے ہیں روزنِ دیوار سے گویا ۔۔۔ کہ دیکھا کرتے ہیں داغوں کو سینہ چیر اکثر ہم
ہوئے تم کیوں خفا تاثیر سے آہِ رسا کی اب ۔۔۔ کیا کرتے تھے یہ تو پہلے ہی تقصیر اکثر ہم
لگے[۳] آگ آتشِ غم کو زبانِ خامہ شعلہ ہے ۔۔۔ جلا دیتے ہیں سو سو خط دمِ تحریر اکثر ہم

۱ اگر ہم اُس گُل کے عشق میں پھولتے پھلتے تو راہ میں شجرِ بارور کے سایہ میں بیٹھ کر رشک کی آگ میں کیوں جلتے - یعنی اُس صورت میں ہم بھی درخت ثمردار سے کم نہ ہوتے ۔ ۲ شاعر نے دوست کو اپنے جذبۂ اشتیاق کا ذکر لکھا ہے - اب اُس تحریر کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ تیرا اثر ہم اُس وقت جانیں جبکہ نامہ بر کے ہاتھ میں محبوب کے ناقے کی مہار دیکھیں یعنی جو قاصد خط لیکر گیا ہے وہی محبوب کو ساتھ لیکر واپس آئے ۔ ۳ شرع میں سفر کے موقع پر نماز قصر کرنے کا حکم ہے مومن کہتا ہے کہ سفر میں مجھے ایسا کونسا شغل ہے کہ نماز قصر کرنے کی ضرورت ہو۔ ہاں اگر بتوں کے وصل کے دن ہوتے تو نماز ضرور وبالِ جان معلوم ہوتی - اور قصر کرنا پڑتی -

۱۱۰ ۱ وہ ہمارے قتل کے لئے کمان کھینچکر ہمارا دل توڑتا ہے اور ہم اپنی سخت جانی کیوجہ سے اُسکے تیر توڑتے ہیں اپنا ہمارا
۲ داغوں کو چمن اور شگافِ سینہ کو روزنِ دیوار سے تشبیہ دی ہے ۔ ۳ آتشِ غمِ عشق میں یہ تاثیر ہے کہ اُسکی وجہ سے قلم میں شعلے کی خاصیت پیدا ہوگئی ہے اور خط لکھتے لکھتے جل جاتا ہے ۔

جبیں یاں تک تو سنگِ آستاں پر تیرے گھستے ہیں
مٹا دیتے ہیں لفظِ دفترِ تقدیر اکثر ہم

وہاں چھوٹا گلے لگنا کہ شوقِ ہمکناری میں
لگاتے تھے گلے سے غیر کی تصویر اکثر ہم

عجب حالت ہے سودے میں تری زلفِ مسلسل کے
کہ سر سے باندھتے ہیں پاؤں کی زنجیر اکثر ہم

نہیں پاتے اثر اپنا یہ غیرت کا اثر دیکھا
کہا کرتے تھے بیتابی کو بے تاثیر اکثر ہم

یہ اب کیوں پڑ گئے جوں نے گلو سے تا بدل روزن
الٰہی روکتے تھے نالۂ شبگیر اکثر ہم

نہ تھی مسجد میں برکت ورنہ وہ بت رام ہو جاتا
گئے مومن فسوں پڑھنے پہ تسخیر اکثر ہم

۱۱۱

کب چھوڑتے ہیں اس ستم ایجاد کے قدم
سر ہے ہمارا اور ہیں جلاد کے قدم

کیا ٹھہرے فوج غم کے مقابل فغان و آہ
جمتے نہیں ہیں لشکرِ برباد کے قدم

اب تک گیا نہ باغ میں تو بہرِ انتظار
سُن ہو گئے کھڑے کھڑے شمشاد کے قدم

پابوسِ یار کرتے ہوئے کھینچ دیوے تو
تصویر میری چوم لے بہزاد کے قدم

اے ہمدمانِ باغ رہا ہوں میں کیا کروں
اُٹھتا نہیں ہے کوچہ سے صیاد کے قدم

تلوار لے کے گھر سے جو نکلا وہ جنگ جو
تاثیر نے لئے مری فریاد کے قدم

ہم شوقِ ہمکناری میں اکثر غیر کی تصویر گلے سے لگاتے تھے۔ اس خیال سے کہ یہ وہ شخص ہے جو اس سے ہم بغل ہوتا ہے۔ مگر معشوق نے اسی ضد سے غیر سے ہم بغل ہونا ترک کر دیا۔ یعنی جنون میں زنجیر کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ شعر کی رعایات ملحوظ رہیں۔ ہم اپنی بے تابی کو بے اثر کہا کرتے تھے۔ آخر بے تابی کو غیرت آگئی اور اس نے یہ اثر دکھایا کہ ہمارا ہی اثر (نشان) باقی نہ رہا۔ یعنی بے تابی نے تاثیر تو دکھائی مگر وہ ہمارے خلاف پڑی۔ ہم پہلے نالوں کو ضبط کرتے تھے مگر اب یہ حال ہے کہ نالے نہیں رکتے اور گلے سے دل تک بانسری کی طرح سوراخ ڈال دیتے ہیں۔ گلے سے دل تک اسلئے کہا کہ ضبط کی کوشش میں نالے واپس جاتے ہوئے جسم کو چھید ڈالتے ہیں۔

۱۱۱ فغان و آہ کو لشکر برباد اس رعایت سے کہا ہے کہ دونوں کی بنیاد ہوا (باد) پر ہے اور منتشر ہیں۔ وہ جنگجو معشوق اسیری فریاد پر میرے قتل کی غرض سے نکلا۔ گویا تاثیر نے آکر میری فریاد کی قدمبوسی کی

سر پہ یہ کوہ غم گر اٹھاتا تو بوجھ سے
دھس جاتے بے ستون[53] میں فرہاد کے قدم

خواب[54] عدم حرام ہے یاں انتظار میں
کیا سو گئے اجل تری بیداد کے قدم

کیا[55] ہووے دل پہ ہاتھ دھرے سے مگر رکھے
سینے پہ وہ ہی عاشقِ ناشاد کے قدم

پامال[56] جہل حضرت مومن بغیر ہوں
دکھلائے پھر خدا مجھے اُستاد کے قدم

۱۱۲

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچاری سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

ہم سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں بھلا
انصاف کیجے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

بیزار[1] جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے
شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم

اُس کو میں جا مریں گے مدد اے ہجوم شوق
آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم

صاحب[2] نے اُس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

۵۳ بے ستون = ایران کا ایک پہاڑ جس کو کاٹ کر فرہاد نے جوئے شیر نکالی تھی۔
۵۴ جب پانوں سو جاتے ہیں تو آدمی سے چلا نہیں جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ اجل کی بیداد کے پانوں سو گئے جو مجھ تک نہیں آتی۔ ورنہ عدم کی نیند مجھ کو حرام نہ ہوتی۔
۵۵ میں اپنے دل پر ہاتھ رکھتا ہوں لیکن تسکین نہیں ہوتی۔ ہاں اگر معشوق ہی عاشق ناشاد کے سینے پر قدم رکھے تو تسکین ممکن ہے۔ ۵۶ یہ شعر گویا دوسرے کی زبان سے ادا کیا۔ اُستاد سے خود مومن مراد ہیں۔

۱۱۲ ۱ مدعی (رقیب) نے معشوق سے کہا کہ عاشق (مومن) تمہاری شکایتیں کرتا پھرتا ہے۔ اس پر معشوق آمادۂ قتل ہو گیا۔ عاشق کہتا ہے کہ مدعی کا الزام جھوٹا ہے اور اگر میں خود جان سے بیزار نہ ہوتا تو اس ناکردہ جرم کے مواخذہ سے بچنے کے لئے اُس سے ضرور گواہ (شاہد) طلب کرتا لیکن میں تو خود مشتاق قتل ہوں۔ ۲ صاحب (یا آقا) سے معشوق اور غلام سے خود اپنی ذات مراد ہے۔ واضح رہے کہ صاحب مومن کی منظور نظر کا تخلص ہے۔

بے روئے[1] مثل ابر نہ نکلا غبارِ دل
کہتے تھے ان کو برقِ تبسم ہنسی سے ہم

اِن ناتوانیوں[2] پہ بھی تھے خارِ راہِ غیر
کیونکر نکالے جاتے نہ اُس کی گلی سے ہم

کیا گُل کھلے گا دیکھئے ہے فصلِ گُل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

مونہہ[3] دیکھنے سے پہلے بھی کس دن وہ صاف تھے
بے وجہ کیوں غبار رکھیں آرسی سے ہم

ہے[4] چھیڑ اختلاط بھی غیروں کے سامنے
ہنسنے کے بدلے روئیں نہ کیوں گدگدی سے ہم

وحشت[5] ہے عشقِ پردہ نشیں میں دمِ بکا
مُنہ ڈھانکتے ہیں پردۂ چشمِ پری سے ہم

کیا[6] دل کو لیگیا کوئی بیگانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

لے[7] نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

[1] ہم معشوق کو ہنسی میں برقِ تبسم کہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بُرا مان گیا اور مکدر ہوگیا اور جب تک ہم ابر کی طرح نہ روئے اُس کے دل کا غبار نہ نکلا۔ الفاظِ شعر کی خوبی واضح رہے۔

[2] ہم مرضِ عشق میں ضعف سے سوکھ کر کانٹا ہوگئے۔ اس پر بھی چونکہ کوچۂ معشوق میں غیر کی آمد و رفت تھی ہم غیر کے مقاصد کی راہ میں خار کی طرح حائل تھے۔ آخر معشوق نے اُس کی خاطر سے ہمیں اپنے کوچے سے نکال دیا۔ قاعدہ ہے کہ کانٹا راہ سے ہٹادیتے ہیں۔

[3] ہم بے وجہ آرسی سے کیوں کدورت رکھیں کہ اُس کی وجہ سے معشوق میں خود نمائی آگئی۔ وہ تو آرسی میں مُنہ دیکھنے سے بیشتر بھی ہم سے غبار رکھتا تھا۔ مُنہ دیکھنا۔ صاف۔ غبار۔ آرسی میں رعایت ہے۔

[4] محبوب اختلاط دکھانے کے خیال سے رقیبوں کے سامنے عاشق کو گدگداتا ہے مگر غیور عاشق اس کو بھی ظلم سمجھتا ہے اور ہنسنے کے بدلے روتا ہے۔ [5] عشق پردہ نشیں ہے۔ اسلئے دمِ گریہ مُنہ ڈھانکنے کی ضرورت ہوئی اور چونکہ وحشت ہے۔ اس وجہ سے پری کی آنکھ کا پردہ تلاش کیا۔ [6] بیگانہ آشنا۔ وہ شخص جو غیروں کا دوست ہو۔ کسی بیگانہ آشنا کے عشق کا یہ اثر ہے کہ ہمیں اپنے وجود ہی سے بیگانگی ہوگئی۔ [7] بدعتی = وہ جو (دین میں) نئی بات نکالے۔ دل کو بدعتی اس لئے کہا کہ آرزو مومن کے نزدیک نئی بات ہے۔

۱۱۳

جو[1] پہلے دن ہی سے دل کا کہا نہ کرتے ہم | تو اب یہ لوگوں کی باتیں سنا نہ کرتے ہم

اگر نہ ہاتھ میں اس دلربا کے دل دیتے | تو دل پہ ہاتھ سدا دھر لیا نہ کرتے ہم

اگر نہ دام میں زلفِ سیہ کے آجاتے | تو یوں خرابیِ پریشاں رہا نہ کرتے ہم

اگر نہ لگتی چپ اس بدگماں کی شوخی سے | تو بات بات میں مضطر ہوا نہ کرتے ہم

اگر جلاتے نہ اس شعلہ رو کے عشق میں جی | تو سوزِ آتشِ غم سے جلا نہ کرتے ہم

نہ جاتے اس بتِ ہرجائی کی گلی میں اگر | تو دوڑے دوڑے قلق سے پھرا نہ کرتے ہم

اس آفتِ دل وجاں پر اگر نہ مرجاتے | تو اپنے مرنے کی ہر دم دعا نہ کرتے ہم

نہ بھرتے دم جو کسی شعلہ رو کی خواہش کا | تو ٹھنڈی سانس ہمیشہ بھرا نہ کرتے ہم

اگر نہ آنکھ تغافل شعار سے لگتی | تو بیٹھے بیٹھے یہ یوں چونک اٹھا نہ کرتے ہم

نہ ہوش کھوتے اگر اس پری کی باتوں پر | تو آپ ہی آپ یہ باتیں کیا نہ کرتے ہم

نہ کرتے اس کی برنگِ حنا جو پابوسی | تو شکلِ برگِ حنا یوں پسا نہ کرتے ہم

اگر نہ ہنسنا ہنسانا کسی کا بھا جاتا | تو بات بات پہ یوں رو دیا نہ کرتے ہم

نہ لگتی آنکھ تو دن رات سوتے ہی رہتے | کسی کی چاہ نہ کرتے تو کیا نہ کرتے ہم

اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت آہ | تو ایک ایک کے منہ کو تکا نہ کرتے ہم

جو غم بتوں کا نہ ہوتا تری طرح مومن
تو دیکھ چرخ کو ہے ہے خدا نہ کرتے ہم

۱۱۴

الجھے[2] نہ زلف سے جو پریشانیوں میں ہم | کرتے ہیں اس پہ ناز ادائیوں میں ہم

سرگرم[3] رقص تازہ ہیں قربانیوں میں ہم | شوخی سے کس کی آئے ہیں جولانیوں میں ہم

۱۱۴ [1] پوری غزل قطعہ بند ہے۔
۱۱۳ [2] عاشق اپنی اس اداشناسی پر نازاں ہے کہ اس نے اپنی پریشانی کی حالت میں معشوق کی زلف کو چھیڑ کر برہم نہیں کیا۔ [3] معشوق کے ہاتھ سے ذبح ہوکر ہم تڑپ رہے ہیں جو ایک طرح کا رقص ہے۔ اسی رقص بسمل کو شاعر مصرع ثانی میں اپنی جولانی سے تعبیر کرتا ہے کہ دراصل شوخی یار کا کرشمہ ہے۔

ثابت[1] ہے جرم شکوہ نہ ظاہر گناہ رشک
حیراں ہیں آپ اپنی پشیمانیوں میں ہم

مارے[2] خوشی کے مر گئے صبح شب فراق
کتنے سبک ہوئے ہیں گرانجانیوں میں ہم

آتا ہے خواب میں بھی تری زلف کا خیال
بے طور گھر گئے ہیں پریشانیوں میں ہم

دیکھا[3] ادھر کو تو نے کہ بس دم نکل گیا
اترے نظر سے اپنی نگہبانیوں میں ہم

اب[4] قید سے امید رہائی نہیں رہی
ہمدرد پاسباں ہیں زندانیوں میں ہم

ورد[5] زباں ہیں اس نگہ سرمگیں کے وصف
تلوار کر رہے ہیں صفاہانیوں میں ہم

آہوں[6] نے اپنی بوالہوسوں کو رلا دیا
ہیں رشک چشم یار فسوں خوانیوں میں ہم

وہ[7] ضعف ناتواں ہیں کہ اس اضطراب پر
اچھلے نہ آب تیغ کی طغیانیوں میں ہم

معمور[8] اس قدر ہیں ترے وحشیوں سے دشت
کہتے ہیں شہریوں کو بیابانیوں میں ہم

---

[1] ہم ناکردہ پشیمان ہیں کیونکہ نہ ہم نے محبوب کا شکوہ کیا ہے نہ رقیب پر رشک کیا ہے اور یہی دو سبب عاشقی میں پشیمانی کے ہو سکتے تھے۔ [2] شب فراق کے اختتام پر ہم کو اس قدر خوشی ہوئی کہ شادی مرگ ہو گئے۔ اس وجہ سے گرانجانیوں کے باوجود ہمیں نہایت سبک (خفیف یا ذلیل) ہونا پڑا۔ سبک ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہم گرانجانی سے شب فراق کی مصیبت تو جھیل گئے مگر صبح ہونے کی خوشی برداشت نہ کر سکے۔ [3] ہم تیری نگاہ کی زد سے بچنے کے لئے اپنی حفاظت جان کے خیال سے آنکھیں چراتے تھے مگر تو نے ادھر ہماری طرف دیکھا ادھر ہمارا دم نکل گیا۔ جس کے باعث اب ہم اپنی نظروں میں خفیف ہو گئے کیونکہ ہماری تمام نگہبانیاں بے سود ثابت ہوئیں۔

[4] ہماری قید کی کوئی میعاد نہیں۔ اسلئے قیدیوں میں ہم کو محافظ محبس سے ہمدردی ہے کہ اس غریب کو ہماری وجہ سے مدت العمر پاسبانی کی مصیبت جھیلنی پڑے گی۔

[5] محبوب کی نگاہ سرمگیں کی تعریف کو اہل اصفہان میں تلوار چلانے سے تشبیہ دی ہے۔ زبان نگاہ سرمہ تلوار صفاہانی میں مناسبت ہے۔ اصفہان کی تلوار اور سرمہ مشہور ہیں۔ [6] چشم یار کو تاثیر کے اعتبار سے فسوں خوانی (جادوگری) سے منسوب کیا جاتا ہے مگر ہم اس سے بھی بڑھ گئے کیونکہ ہماری آہوں نے رقیبان بوالہوس کو بھی رلا دیا بہ خلاف چشم یار کے۔ جس کا جادو رقیبوں پر کبھی نہیں چلا۔ [7] ہماری کمزوری کا یہ اندیشہ کہ اس بے تابی کے باوجود بھی ہم آب تیغ کے طوفان میں نہ اچھلے۔ تیغ کی آب (دھار) کی رعایت سے طغیان (طوفان) کا لفظ استعمال کیا ہے۔
[8] یعنی اب شہر کی آبادی ویرانی سے مبدل ہو گئی اور شہر پر بیابان کا دھوکا ہوتا ہے۔

پیشِ نظر ہے کس کا رُخ آئینہ گداز[11]
کھا کھا کے زخم سوئے نمک زار[12] پر دریغ
روتے ہیں اپنے حال پہ حیرانیوں میں ہم
کھو بیٹھے اپنی جان تن آسانیوں میں ہم

مومن[13] جہد سے کرتے ہیں سامان جہاد کا
ترسا صنم کو دیکھ کے نصرانیوں میں ہم

۱۱۵
دل[1] آگ ہے اور لگائیں گے ہم
کیا جانئے کیسے جلائیں گے ہم

وادی میں جو اپنی آئیں گے ہم
کیا قیس کی خاک اڑائیں گے ہم

اب گریہ میں ڈوب جائیں گے ہم
یوں آتشِ دل بجھائیں گے ہم

خنجر تو نہ توڑ سخت جانی
پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم

گر غیر سے ہے یہ رنگِ صحبت
تو اور ہی رنگ لائیں گے ہم

تو بخت عدو اجل فلک دل
کس کس کے ستم اٹھائیں گے ہم

اے پردہ نشیں نہ چھپ کہ تجھ سے
پھر دل بھی یوں ہی چھپائیں گے ہم

بھیجیں گے عدو کے ہاتھ پیغام
حالِ دل اسے جتائیں گے ہم

مت لال کر آنکھ اشکِ خوں پر
دیکھ اپنا لہو بہائیں گے ہم

دشمن[2] کے کہے سے روٹھتا ہے
وہ ہی کہے تو منائیں گے ہم

۱۱ رخ کو آئینہ گداز اسلئے کہا ہے کہ اُسکی تابش سے آئینہ پگھل جاتا ہے۔ ۱۲ نمک زار = نمک کی سرزمین
تن آسانی = آرام طلبی۔ سونے کو تن آسانی کہا ہے اور چونکہ زخم کھا کر نمک زار پر سو گئے تھے اسلئے شدت
اذیت کے باعث جان کھو بیٹھے۔ ۱۳ جہاد سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ معشوق مسیح پرست (ترسا) کو مسیحیوں کے
قالب سے نکال لائیں۔ ۱ اس غزل میں بیشتر اور غزل مابعد میں تمامتر واسوخت کا رنگ ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا ۱۱۵
دل آگ ہے اور جب ہم دل لگائیں گے تو گویا آگ لگائیں گے۔ دیکھئے کون کون اس آگ کی لپیٹ میں آتے۔
۲ عاشق کچھ جذبۂ رشک کو شکایت ہے کہ معشوق ہم سے ناراض بھی ہوتا ہے تو رقیب کے اغوا سے اور کہتا ہے
کہ اگر یہی بات ہے تو اب ہم بھی اس وقت منائیں گے جب کہ رقیب ہم سے منانے کے لئے کہے گا اور ظاہر ہے کہ
رقیب کیوں کہنے لگا۔ مراد یہ ہے کہ ہم کبھی نہ منائیں گے۔

کترائے[1] ہے جو گوشۂ سر خط		مطلب یہ ہے کہ سر اڑائیں گے ہم
ٹھہرو کوئی دم کہ جان ٹھہرے		مت جاؤ کہ جی سے جائیں گے ہم
دم[2] دیتے تو ہو پہ یہ سمجھ لو		دشمن کی قسم دلائیں گے ہم
کیوں غش ہوئے دیکھ آئینہ کو		کہتے تھے کہ تاب لائیں گے ہم
وزدیدہ[3] نظر ہے کیوں دمِ قتل		کیا مرنے سے جی چرائیں گے ہم
گر[4] ہے دلِ غیر نقش تسخیر		تو تیرے لئے جلائیں گے ہم
آئینۂ[5] رنگ غم نے توڑا		کیونکر اُسے منہ دکھائیں گے ہم
کیا پوچھے ہے رکھ تو دیکھ دشنہ	اپنی	آپ ہی گردن جھکائیں گے ہم

کہہ اور غزل بطرز واسوخت
مومن یہ اُسے سنائیں گے ہم

اب اور سے لَو لگائیں گے ہم	۱۱۶	جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم
برباد نہ جائے گی کدورت		کیا کیا تری خاک اڑائیں گے ہم

[1] قاعدہ ہے کہ جب خط میں کوئی خبر بد ہوتی ہے تو اُس کا کنارہ کتر دیتے ہیں۔ [2] اگر ہم نے تمھیں دشمن کی قسم دلائی تو اس صورت میں تمھیں سچ سچ بتانا پڑے گا۔ [3] تم مجھے قتل کرتے وقت اسلئے وزدیدہ نظر سے دیکھ رہے ہو کہ یہ (عاشق) قتل سے جھجکتا تو نہیں۔ مگر یہ خیال بے اصل ہے۔ [4] نقش تسخیر = وہ نقش جس کے ذریعے سے کسی کو مطیع کرتے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ نقش کو اکثر کسی مراد کے لئے جلایا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر غیر کا دل بالفرض نقش تسخیر بھی ہے تو بھی تیرے حصول کی غرض سے ہم اس کو جلائیں گے۔ جلانے کے لفظ میں ایہام ہے۔ دلِ غیر کو نقش تسخیر اس بنا پر کہا ہے کہ معشوق اس کا مطیع ہے۔ [5] غم عشق یا غم ہجر نے ہمارے رنگ رخ کے آئینہ کو توڑ دیا۔ اس صورت میں ہم معشوق کو کیونکر منہ دکھائیں گے کیونکہ وہ اُلٹا ناراض ہوگا۔ رنگ رخ دیکھا جاتا ہے اسلئے اُسے آئینہ سے تشبیہ دی ہے۔ توڑنے سے مراد یہاں یہ ہے کہ غم نے ہمارا رنگ رخ متغیر کر دیا۔ منہ دکھانے کے لفظ میں ایہام ہے۔

سرو وش عدو پہ رکھ کے بیٹھے — جانا نہ کہ سر اُٹھائیں گے ہم

بگڑے تو کریں گے اور سے صلح — تجھ پر بھی بُری بنائیں گے ہم

دل دے کے اک اور لالہ رو کو — ہر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم

لب[1] کا ترے دعویٔ مسیحی — مر اور پہ آزمائیں گے ہم

گر[2] خواب میں بھی اُدھر کو دیکھا — آنکھیں مژہ کو دکھائیں گے ہم

گر تیری طرف کو بیقراری — کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم

گر[3] دیکھ کے ہنس دیا ہیں تو — مُنہ پھیر کے مُسکرائیں گے ہم

کیا ذکر ہے ہونٹ چاٹنے کا — کچھ اور مزہ چکھائیں گے ہم

پھر تیری ہوا کا دم بھرا تو — جی ہی کو ہوا بتائیں گے ہم

گر خواب میں آن کر جگایا — سوتے مُردے جگائیں گے ہم

آتا[4] ہے گلے سے دھیان تیرے — خاطر میں ستم نہ لائیں گے ہم

بتخانۂ[5] چیں ہو گر ترا گھر
مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

۱۱۶ [1] ہم کسی دوسرے حسین پر مر کر تیرے لب کا دعوائے مسیحائی آزمائیں گے یعنی دیکھیں گے کہ تو اُس وقت ہمیں جِلاتا ہے یا نہیں اور اپنے دعوے میں صادق ہے یا کاذب۔ یہ مُراد بھی ہو سکتی ہے کہ تجھے دعویٰ ہے کہ عاشق کی زندگی محض میرے لب جاں بخش کی بدولت ہے۔ اب ہم اس دعوے کی تکذیب کی غرض سے دوسرے پر مرینگے (عاشق ہونگے)۔ [2] اگر ہمارے مژہ (پلک) نے خواب میں بھی تیری طرف دیکھا تو ہم اُس کو آنکھیں دکھائینگے یعنی اظہار ناراضی کرینگے۔ [3] یہاں معشوق کے ہنسنے سے اظہار اختلاط اور اپنے مُنہ پھیر کے مسکرانے سے اظہار حقارت مراد ہے۔ [4] تیرے گذشتہ مظالم کی شکایت کرنے سے تیرا تصوّر دل میں آجاتا ہے۔ لہذا تیرے تصوّر کو دل سے بُھلانے کی غرض سے ہم تیرے مظالم کا خیال ہی کرنا چھوڑ دینگے۔ [5] بتخانہ چین کی تخصیص اسلئے کی ہے کہ چین کی صنعت نقاشی بہت جمیل ہوئی ہے۔

ردیف النون

۱۱۷

صفحۂ جیحوں پر جو کبھی ہم سوزشِ دل لکھواتے ہیں[1]
سارے حباب لبِ دریا تبخالے سے بن جاتے ہیں

آپ کے کل تم جھوٹ ہے ایسی باتوں میں ہم کب آتے ہیں
اُس سے کہو جو تم کو نہ جانے آپ کسے فرماتے ہیں

پھرتے ہیں سو وسوسے جی میں دل میں سودے آتے ہیں
کوٹھے پر وہ دھوپ میں اپنے بال کھڑے سکھلاتے ہیں

سوزشِ داغ جب گھٹتے ہیں تب آنسو وہ بھڑکاتے ہیں
موم کے مانند آتشِ غم سے پتھر کو پگھلاتے ہیں

آب و ہوائے ملکِ محبت راس نہیں ہے ہم کو تو
ہوتے ہیں لاغر اور زیادہ جتنا ہم غم کھاتے ہیں

کس کی خبر اب آنے کی ہے کس لیے ہے یہ بیتابی
کس لیے ہم ہیں ہر دم پھرتے آتے ہیں اور جاتے ہیں

شکوہ کیا بیدادگری کا کیجے اس سے دیکھو تو
دیکھیے ہے ظالم خنجر جب ہم زخمِ جگر دکھلاتے ہیں

اُف ری کثرتِ اشک و تبسم لب پہ ہجوم یاس و امید
جی ہے دھڑکتا لٹنے کی اس کے فال تو ہم کھاتے ہیں

خطِ غلامی لکھ دے ہے غیرت[2] تو بھی گلہ کیا لکھنا اب
چھیڑ تو دیکھو میرا خط وہ غیروں سے پڑھواتے ہیں

ہوش گئے یاں دل سے پہلے آئے ہو تو سمجھیں آپ
یہ تو سمجھئے حضرتِ ناصح آپ کسے سمجھاتے ہیں

ق
کیا کہیں تم سے لے کے ہمارے دل کو چھوٹ گئے غافل چمن
کیونکر یاں ایامِ خزاں اور ہجر کے دن کٹ جاتے ہیں

کنجِ قفس میں بیٹھ کے گاہے روتے ہیں تنہائی پر
یاد سیرِ موسمِ گل سے گاہے جی بہلاتے ہیں

---

[1] ہمارے دل کی جلن اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ جب ہم اُس کا حال دریائے جیحوں کے صفحے پر لکھواتے ہیں تو سوزش کے اثر سے حبابوں میں تبخالوں کی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دریا کو شکل کے لحاظ سے صفحے سے تشبیہ دی ہے۔ تبخالہ = چھالا جو تپ کی گرمی سے ہونٹ پر پڑ جاتا ہے۔

[2] اگر غیرت ہمیں خطِ غلامی بھی لکھ دے (یعنی اگر ہمارا جذبۂ رشک کارفرما نہ ہو) تو بھی معشوق کو شکایت لکھنا بیکار ہے۔ کیونکہ وہ ہمارا خط رقیبوں سے پڑھواتا ہے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ ہمارے راز سے آگاہ ہو جائیں گے۔ شکایت سے مراد اس امر کی شکایت ہے کہ ہمارا خط دوسروں سے کیوں پڑھوایا اور ظاہر ہے کہ یہ شکایت بھی وہ رقیبوں ہی سے پڑھوائے گا۔

شام سے اپنے سو رہے وہ تو اور ہم اُنکے کوچے میں
کرتے ہیں آوازِ زفیری؎ دیتے ہیں دستک سو سو بار

ق

ولولہ ہائے شوق سے کیا کیا پھرتے ہیں گھبراتے ہیں
گھر میں پتھر پھینکتے ہیں زنجیرِ در کھڑکاتے ہیں

کیا کسی بُت کے دل میں جگہ کی کوئی ٹھکانا اور ملا
حضرتِ مومن اب تمھیں کچھ ہم مسجد میں کم پاتے ہیں

۱۱۸

عشق نے یہ کیا خراب ہمیں — کہ ہے اپنے سے اجتناب ہمیں
بسکہ پردہ نشیں پہ مرتے ہیں — موت سے آئے ہے حجاب ہمیں
کیسی غیرت سے اے سُبک روحی؎ — دیکھے ہے دیدۂ حباب ہمیں
شبِ فرقت میں خاک جھپکے آنکھ — یاد ہے چشمِ نیمخواب ہمیں
وہ جفاکش؎ ہیں اے فلک کہ کیا — اُس ستمگر نے انتخاب ہمیں
دم رُکے ہے بہشت میں تو کوئی — اُسکے گھر سے چلو شتاب ہمیں
غیر سے ہے وہ گرم صحبت مے — کیوں نہ غیرت کرے کباب ہمیں
کس؎ کی زلفوں کی بو نسیم میں تھی — ہے بلا آج پیچ و تاب ہمیں
غیر؎ کے واسطے نہ ہو بیتاب — طعنہ دیتا ہے اضطراب ہمیں
اب کوئی کیا کرے علاجِ افسوس — موت نے بھی دیا جواب ہمیں

اے تپِ ہجر دیکھ مومن ہیں
ہے حرام آگ کا عذاب ہمیں

؎ زفیری اصلاً زفیر ہے جسکے معنی ہیں اول دَم اندر کو کھینچنا پھر بلند کرنا جیسے سیٹی کی آواز۔
۱۱۸ ؎ سُبک روحی = بے تعلقی و تجرد۔ ہماری بے تعلقی اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ حباب جو خود ہستی سے بے تعلقی رکھتا ہے ہمیں حیرت سے دیکھتا ہے۔ حباب کو شکل کے لحاظ سے دیدہ سے تشبیہ دیجاتی ہے۔
؎ یعنی جب ہم اُس (معشوق) کے ستم اُٹھاتے ہیں تو پھر تیرے ستم کی کیا حقیقت ہے۔
؎ یعنی نسیم سے فرحت کے بجائے اُلٹا پیچ و تاب ہوتا ہے۔ ؎ ہمارا اضطراب ہمیں بے اثری کے طعنے دیتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ معشوقِ غیر کی یاد میں بیتاب ہو جسکے باعث ہماری یہ کیفیت ہو گئی ہے۔ اگر "نہ ہو" کو صیغۂ نہی مانیں اور معشوق کو مخاطب ٹھیرائیں تو بھی معنے درست ہو سکتے ہیں۔

۱۱۹

لاش[۱] پر آنے کی شہرت شبِ غم دیتے ہیں
اے پری ہم ملک الموت کو دم دیتے ہیں

دھیان آتا ہے تری منہ میں زباں لینے کا
جی ہم اے شوخ پے سیرِ عدم[۲] دیتے ہیں

کر دیا[۳] خانۂ اغیار ہوسناک خراب
داد رونے کی مرے دیدۂ نم دیتے ہیں

مر گئے[۴] رشک سے ہم تو کہ وہ دشمن کو خطاب
خط ترسائی پہ اعجاز رقم دیتے ہیں

سبزۂ[۵] پشتِ لبِ یار دلاتے ہیں یاد
گھول کر شہد میں دشمن مجھے سم دیتے ہیں

دم[۶] نہ لے اے اثرِ آہ کہ معلوم ہوا
جن پہ دم دیتے ہیں ہم وہ ہمیں دم دیتے ہیں

کیا دوا سے ہو تری رنجشِ ہر دم کا علاج
چارہ گر کیوں مجھے رنج پہ ہم دیتے ہیں

کیا پڑی[۷] رہتی ہے اے پردہ نشیں جون بیمار
بد دعائیں تری چلمن کو جو ہم دیتے ہیں

لذتِ[۸] جور کشی نے مجھے شرمندہ کیا
طعنے کیا کیا اُسے اربابِ ستم دیتے ہیں

مدعا یہ ہے کہ غیرت سے میں سم کھا جاؤں[۹]
اس لئے غیر کو وہ اپنی قسم دیتے ہیں

---

۱۱۹ [۱] ہم نے شبِ ہجر کی اذیت سے تنگ آ کر غلط طور پر مشہور کر رکھا ہے کہ ہمارے مرنے کے بعد محبوب ہماری لاش پہ آئے گا۔ اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم ملک الموت کو دھوکا دیں تاکہ وہ یہ سمجھ کر کہ مرنے پر شاعر کے محبوب کی آمد موقوف ہے۔ ہم پہ ترس کھائیں اور جلد ہماری روح قبض کر کے ہجر کی سختی سے نجات دیں۔ دم کے لفظ میں ایہام ہے۔ [۲] منہ کی رعایت سے عدم کا لفظ لطف دے رہا ہے۔ [۳] شاعر اپنی چشمِ گریاں کے طوفان کا شکر گزار ہے کہ اُس کی وجہ سے رقیبوں کے گھر بیٹھ گئے۔ یعنی اُنکے دعاوی محبت باطل ہو گئے۔

[۴] خط ترسا = عیسائیوں کی تحریر، جو بہت پُرپیچ ہوتی ہے۔ لاطینی رسم الخط۔ اعجاز رقم کا خطاب خوشنویسوں کو دیا جاتا ہے۔ [۵] سبزۂ لب یار یاد دلانے کو شہد میں زہر ملانے سے تشبیہ دی۔ سبزہ کی مشابہت زہر سے اور لب کی شہد سے ظاہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رقیبوں کا ظاہری التفات بھی میرے لئے باطن میں سم قاتل ہے۔ [۶] شعر میں پہلا دم سانس یا وقفہ کے معنی میں آیا ہے۔ دوسرا جان سے اور تیسرا فریب سے۔ مراد یہ ہے کہ اسے اثرِ آہ کمی نہ کر۔ [۷] پڑی رہتی ہے کہ الفاظ سے شاعر نے خاص فائدہ لیا ہے۔ [۸] میں اپنی لذتِ ستم کشی کے باعث خجل ہوں کیونکہ اُسکی وجہ سے تمام اہلِ ستم (دوسرے حسین معشوق) کو طعنے دیتے ہیں کہ تم کو ظلم کرنا بھی نہیں آتا ورنہ عاشق ظلم سے اس قدر لطف اندوز کیوں ہوتا۔

اہلِ[۹] بازارِ محبت کا بھی کیا سودا ہے خوں[۱۰] بہا قاتلِ بیدرد سے مانگا کس نے	عشرتِ عمرِ ابد قیمتِ غم دیتے ہیں کہ فرشتے مجھے یاں داغ درم دیتے ہیں

کعبہ[۱۱] کا دھیان نہ ہو حضرتِ مومن کو کہ جان
حسرتوں سے پسِ دیوارِ صنم دیتے ہیں

۱۲۰

ناصحِ ناداں یہ دانائی نہیں	دل کو سمجھاؤں میں سودائی نہیں
کس توقع پر امیدِ وصل اب	طاقتِ صبر و شکیبائی نہیں
دعوئ[۱۲] حسنِ جہاں سوز اس قدر	پھر کہو گے تم میں ہرجائی نہیں
دیکھ[۱۳] مضطر کیوں نہ پھیرے دشنہ پھر	یار ہے وہ کچھ تماشائی نہیں
گر[۱۴] نہیں ملتے ملوں گا اور سے	کیوں مجھے کیا پاس رسوائی نہیں
ہے دعا بھی بے اثر گویا کہیں	عرض عاشق کی پذیرائی نہیں
درد دل تو سن لے ظالم ایک بار	گو دماغِ چارہ فرمائی نہیں

۹ اہل محبت کی تجارت بھی خوب ہے کہ عمرِ جاوداں کا عیش دیکر غم عشق خریدتے ہیں۔ ۱۰ مرنے کے بعد فرشتے میرے جسم کو درم گرم کرکے داغتے ہیں۔ نہ معلوم میرے وارثوں میں سے کس نے قاتل سے میرا خون بہا طلب کیا جس کی مجھے یہ سزا دی جا رہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ مجھے قتل کرنا قاتل کا کرم ہے نہ کہ ستم۔ جس پر خوں بہا طلب کیا جائے۔

۱۱ مومن حسرت سے دیوارِ صنم کے پیچھے جان دے رہے ہیں۔ کہیں کعبہ کی یاد میں تو یہ افتاد نہ پڑی ہو۔

۱۲ ۱۲ معشوق نے دعویٰ کیا کہ میرے حسن نے ایک جہان میں آگ لگا دی ہے۔ عاشق جواب دیتا ہے کہ اس سے تمھارا ہرجائی ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ ہرجائی نہ ہوتے تو ہر جگہ آگ نہ لگی ہوتی۔

۱۳ معشوق مجھے بیتاب دیکھ کر کیوں قتل نہ کرے۔ آخر یار ہے کچھ تماشائی تو نہیں جو بیتابی کا تماشا دیکھتا رہے اس شعر میں بے پناہ طنز ہے۔

۱۴ تم اگر پاس رسوائی سے مجھ سے نہیں ملتے تو میں کسی اور سے ملوں گا۔ کیا مجھے اپنی رسوائی کا خیال نہیں۔ درصورت دیگر لوگ طعنے دینگے کہ کسی (معشوق) نے مومن کو ملنے کے قابل نہ سمجھا۔

چاہتا قاتل کو ہوں روزِ جزا	چاہ کی اب تک سزا پائی نہیں

ترکِ[۱] مذہب کیوں کروں مومن میں کیا
اُس صنم کو لاف یکتائی نہیں

۱۲۱

کہے ہے چھیڑنے کو میرے گر سنیاں ہوں مرے بس میں	نہ دوں ملنے کسی معشوق اور عاشق کو آپس میں
اگر مشہور[۲] ہوا افسانہ اپنی بت پرستی کا	برہمن کیا عجب ایمان لے آئیں بنارس میں
نہیں دم لینے کی طاقت فلک ورنہ بتا دیتے	کہ یہ تاثیر ہوتی ہے فغانِ آسماں رس میں
تنِ کاہیدہ سے اپنے میں خوش ہوں اس توقع پر	کہ اک دن آئے تیرے صرفِ عشرت خانۂ خس میں
رقیبِ بوالہوس نے روٹھا میں تیرے کب جاں دی	وہ نو وارد ہے کیا جانے دیارِ عشق کی رسمیں
نہ میں اپنا نہ دل اپنا نہ تم میرے نہ جاں میری	اثر کس کس کو ہو ہووے بھی گر فریاد بیکس میں
کہوں گر غیر سے مت مل تو کہووے طعن سے کر کر	یہ کیوں کس واسطے ہم ایسے تیرے ہو گئے بس میں
ذرا سمجھو[۳] تو جانِ من وصالِ غیر پر ہر دم	مری جاں کون ہے کس کی جھوٹی کھاتے ہو قسمیں

درِ بتخانۂ عشقِ بتاں اور آپ اے مومن
یہ حضرت آگئے اکبار کیا طبعِ مقدس میں

[۱] ظاہر ہے کہ جس میں شان یکتائی ہوگی وہ ضرور بے نیازی کریگا۔ مومن کہتا ہے کہ میں خدا کی بے نیازی سے تنگ آکر ترک اسلام کیوں کروں۔ اُس بُت کو بھی تو دعوائے یکتائی ہے۔ اُس نے بھی بے رخی برتی تو پھر نہ دنیا ملے گی نہ دیں۔

[۲] کیا عجب کہ میری بت پرستی کا افسانہ سُنکر بنارس کے برہمن بھی معتقد ہو جائیں۔ یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ بت پرستی میں میں نے جو مصائب اُٹھائے ہیں اُن کو سُنکر شاید برہمن بھی بت پرستی ترک کر دیں اور اسلام قبول کر لیں۔

[۳] تم مجھ سے کہتے ہو کہ تمھاری جان کی قسم۔ وصال غیر کی خبر غلط ہے" اور یہ خیال نہیں کرتے کہ عاشق کی جان تمھارے سوا کون ہے۔ پھر اُس کی جھوٹی قسمیں کھانا کس قدر بد فالی ہے۔

چین آتا ہی نہیں سوتے ہیں جس پہلو ہمیں ۱۲۲ اضطراب دل غرض جینے نہ دیگا تو ہمیں

لطف[۱] سے ہوتی ہے کیا کیا بیقراری بن جفا
تیری بدخوئی نے ظالم کر دیا بدخو ہمیں

دیکھتے ہی گل نظر میں تیرا ہنستا پھر گیا
آتش گل نے لگائی آگ اے گلرو ہمیں

کیا[۲] اثر تھا اشک دشمن میں جو کوئے یار سے
مارے غیرت کے بہا کر لے چلے آنسو ہمیں

دود[۳] شمع بزم نے دل پھونک کر راکھ کر دیا
کیا دلائی یاد وہ زلف خمیدہ مو ہمیں

گیسو و خال و خط اپنا دین و ایماں لے گئے
مل کے اک دو کافروں نے کر دیا ہندو ہمیں

ہوش کیوں جاتے رہے اور دم ہوا کیوں ہو چلا
تجھ سے اے باد صبا آئی یہ کس کی بو ہمیں

کیا بلا اس زلف خوش خم کا تصور بندھ گیا
سانپ سے دن رات آتے ہیں نظر ہر سو ہمیں

وہم[۴] آتا ہے فغان ہجر کوئے یار کا
صور اسرافیل ہے قمری تری کو کو ہمیں

باعث[۵] بیتابی عالم نگاہ یاس ہے
چشم جادو گر نے یہ سکھلا دیا جادو ہمیں

قیس[۶] شوخ اب کیونکہ دعوی ملک وحشت کا کرے
مہر محضر ہو گیا نقش سم آہو ہمیں

گر یہی[۷] شوق شہادت ہے تو مومن جی چکے
مار ڈالے کاش کوئی کافر دلجو ہمیں

۱۲۴ ۱؎ تو نے ہم پر اس قدر ظلم کئے کہ اب ظلم سہنے کی خو ہو گئی اور لطف ناگوار ہونے لگا۔ تو بدخو (ستمگر) تھا ہی۔ ہمیں بھی تو نے بدخو (خوگر ستم) کر دیا۔ ۲؎ دشمن معشوق کے سامنے اظہار محبت کے خیال سے رویا ہمیں اس پر غیرت سے رونا آیا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے آنسو ہمیں کوئے یار سے بہا کر لے چلے۔ یہ سب گریۂ دشمن کا اثر تھا۔ ۳؎ شمع بزم کا دھواں دیکھ کر ہمیں محبوب کی زلف پر خم یاد آئی اور دل جلکر خاک ہو گیا۔ ۴؎ قمری کو کو کرتی ہے اور مجھے وہم آتا ہے کہ کوئے یار کی جدائی میں فریاد نہ کر رہی ہو۔ اس بنا پر قمری کی آواز میرے حق میں صور اسرافیل کا اثر رکھتی ہے جس کو قیامت میں سُنکر دنیا فنا ہو جائے گی۔ ۵؎ محبوب کی چشم سحر فن نے ہمیں بھی یہ سحر سکھا دیا کہ ہماری نگاہ یاس دیکھکر ایک جہان بیچین ہے۔ ۶؎ قیس اب ہمارے مقابلے میں مُلک وحشت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ دشت میں جہاں جہاں سم آہو کا نقش ہے وہ دراصل ہماری حکومت کی تصدیق کے لئے مہر محضر کا حکم رکھتا ہے۔ یعنی اصلاً ہم ملک جنون کے بادشاہ ہیں۔ قیس نہیں ہو سکتا۔ سُم کے نقش کو مُہر سے تشبیہ دی ہے۔ ۷؎ کاش کوئی کافر ہمیں مار ڈالے کہ درجۂ شہادت حاصل ہو ورنہ ڈر یہ ہے کہ یہ شوق شہادت خود ایک روز ہمیں مار رکھے گا۔

۱۲۳

ہوگئی گھر میں خبر ہے منع واں جانا ہمیں — وہ بھی رسوا ہو خدا جس نے کیا رسوا ہمیں

دمبدم رونا ہمیں چاروں طرف تکنا ہمیں — یا کہیں عاشق ہوئے یا ہوگیا سودا ہمیں

ہے ستم[1] صیاد کا کیا التفات آمیز تھا — بند کرنے کو قفس میں دام سے چھوڑا ہمیں

یار تھے[2] یا دشمنِ جان تھے الٰہی چارہ گر — لیچلے مرتے ہی زنداں سے سوئے صحرا ہمیں

طالع[3] برگشتہ بختِ خفتہ ست پوچھو کہ ہم — غش پڑے تھے پھر گیا وہ جان کر سوتا ہمیں

تو نہ جانے عشق بازی اور ہم ناداں ہوں — بے سمجھ کہتا ہے ناصح تونے کیا سمجھا ہمیں

یہ ستم کیا[4] غیر پر کرتا وہ سچ پوچھو تو ہے — یار کے ناز بجا ہے شکوہ بیجا ہمیں

کیا کہیں کیوں رہ گئے حیران تجھکو دیکھکر — آگیا دل یاد اے آئینہ رو اپنا ہمیں

دست بوسی پر کرو ہاں قتل[5] اپنے ہاتھ سے — سچ تو کہتے ہیں قبول انصاف غیروں کا ہمیں

۱۲۳ [1] صیاد نے ہمیں جال سے رہا کیا مگر محض اس لئے کہ پھر پنجرے میں بند کردے گویا اُس نے ستم تو کیا لیکن اُس میں التفات کی آمیزش تھی۔ اس میں ندرت یہ ہے کہ صیاد سے جدائی کی بنا پر رہائی کو ستم اور اُس کے برعکس قید قفس کو التفات قرار دیا ہے۔ [2] لوگ مرتے ہی ہمیں زنداں سے دفن کے لئے صحرا کو لیچلے۔ نہ معلوم چارہ گروں کو جنھوں نے ہمیں اسیر زنداں کیا تھا دوست کہا جائے (کہ انکی بدولت مرکر تو صحرائے جنون نصیب ہوا) یا دشمن اسلئے کہ انکی قید ستم نے آخر جان لے لی) [3] پھر جانے کی رعایت سے طالع برگشتہ اور سونے کی مناسبت سے بخت خفتہ استعمال کیا ہے [4] ہم یار کے ناز بجا کی ناحق شکایت کرتے ہیں اس واسطے کہ یہ ستم (یا ناز) ہم پر نہ کرتا۔ تو کیا بوالہوس پر کرتا جو دراصل ناز اٹھانے کا اہل نہیں۔ ناز یار کو بجا اسلئے کہا کہ اُس کا مورد عاشق ہی ہے جو دراصل ناز (یا ستم) کا محل صحیح ہے۔ [5] عاشق نے معشوق کے ہاتھ چومے جس پر رقیبوں نے معشوق کو رائے دی کہ اس بے ادب کو انھیں ہاتھوں سے قتل کرنا چاہئے۔ عاشق کہتا ہے کہ مجھے رقیبوں کا یہ فیصلہ قبول ہے۔ اصلاً انھوں نے یہ رائے دشمنی سے دی مگر عاشق کے مفید مطلب پڑی۔

اہلِ ماتم[1] اپنے روئیں کس طرح مُنہ ڈھانک کے | مرتے مرتے پاس اُس پردہ نشیں کا تھا ہمیں
ہم سے[2] نازک طبع سے کب اُٹھ سکے بیدادِ چرخ | مر گئے مضمون جورِ یار جوں سوجھا ہمیں

مومن ان کا تو نہ تھا لیتے ہیں آخر اختیار
یہ شکایت بھی خدا سے ہے بتوں سے کیا ہمیں

۱۲۴

غیر سے[1] بے مروّت ہے آنکھ وہ دکھا دیکھیں | زہرِ چشم دکھلائیں پھر ذرا مزا دیکھیں
کب تلک جلیں یارب ہجرِ غیرتِ مہ میں | صبح اُٹھ کے مُنہ کب تک آفتاب کا دیکھیں
ناصح اُن کو گر میری شکل سے تنفّر ہے | تو بھی کم نگاہی کیوں جانبِ وفا دیکھیں
کچھ نہیں نظر آتا آنکھ لگتے ہی ناصح | گر نہیں یقیں حضرت آپ بھی لگا دیکھیں
غیر کو دکھاتا ہوں چاک دل تماشا ہو | گر وہ روزنِ در سے آن کر ذرا دیکھیں
چشمِ[2] وا نے نابینا کر دیا جدائی میں | کوئی آنکھ لگتی ہے خوابِ وصل کیا دیکھیں
دیکھئے خدا کب تک پھر وہ دن دکھائیگا | یار کو ان آنکھوں سے غیر پر جفا دیکھیں
ٹکٹکی لگائی ہے اب تو اس توقع پر | تا وہ گر ادھر دیکھیں مجھکو دیکھتا دیکھیں

لہ میت پر مُنہ ڈھانک کر رونے کا رواج ہے اور ظاہر ہے کہ روتے میں پردہ نشین کا راز افشا ہو جائے گا۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ نوحہ گروں کے مُنہ ڈھانکنے سے تاڑنے والے تاڑ جائیں گے کہ عاشق کسی پردہ نشین کے غم میں مرا ہے۔ ٹہ نزاکتِ طبع کی حد ہوگئی کہ جب شعر میں باندھنے کے لئے ہمیں جورِ یار کا مضمون سوجھا تو محض اس تصور کے صدمہ سے ہلاک ہوگئے۔ جب ہماری نازکی کا یہ عالم ہے تو بیدادِ چرخ کیونکر اُٹھتی۔
۱۲۴ سلہ آنکھ دکھانا = ناراض ہونا۔ زہرِ چشم = نگاہِ غضب۔ سٹہ ہجر میں انتظار کی بدولت عاشق کی آنکھیں کھلے کھلے بصارت سے معذور ہوگئیں۔ اس کی نئی توجیہ یوں کرتا ہے کہ انتظار میں آنکھ تو لگتی نہیں۔ اور جب آنکھ نہیں لگتی تو خوابِ وصل کیونکر نظر آئے۔ اور جس کو کوئی چیز نظر نہ آئے (وہ خواب ہی کیوں نہ ہو) وہ لازماً نابینا ہی کہلائے گا۔ اس میں ندرت یہ ہے کہ چشمِ بند کی بجائے چشمِ وا کی طرف نابینائی کو منسوب کیا گیا۔

کس نے اور کو دیکھا کس کی آنکھ جھپکی ہے
وہم عاشقی سے تو یہ ستم نہ کرتا ہو

دیکھنا ادھر آؤ پھر نظر ملا دیکھیں
کیوں نگاہ حسرت سے چرخ کو سدا دیکھیں

نکلے آرزو اپنی مومن آہ جب تجھکو
صحن بُتکدہ میں ہم خاک پڑا دیکھیں

۱۲۵

بزم میں اُسکی بیان درد و غم کیونکر کریں
مجھ پہ بعدِ امتحاں بھی جور کم کیونکر کریں
لکھتے لکھتے ہی سیاہی حرف سے اُڑ جاے ہے
گر نگاہ ناز کو مشقِ ستم منظور ہے
دیکھ لیوے عکس رُخ تو کیا بنے پھر دیکھ تو

وہ خفا جس بات سے ہووے وہ ہم کیونکر کریں
وہ ستائیں غیر کو ایسا ستم کیونکر کریں
ہاے احوالِ دلِ مضطر رقم کیونکر کریں
دشمن اپنی نرگس تربت قلم کیونکر کریں
گریہ اُسکے سامنے اے چشم نم کیونکر کریں

سلہ قاعدہ ہے کہ مایوسی میں آسمان کی طرف دیکھتے ہیں شاعر کی مُراد یہ ہے کہ ہم آسمان کی طرف نگاہ حسرت سے کیوں دیکھیں۔ کہیں آسمان یہ سمجھکر ہمپر ظلم نہ کرتا ہو کہ یہ مجھپر عاشق ہے جو یوں باربار دیکھتا ہے۔
سلہ دل کی بے تابی کا یہ اثر ہے کہ احوال لکھنے میں سیاہی حرفوں سے اُڑی جاتی ہے۔ ۱۲۵
سلہ قاعدہ تھا کہ تیر اندازی کی مشق کے لئے تودے پر نرگس کا پھول نصب کرکے نشانہ لگاتے تھے شاعر کہتا ہے کہ اگر معشوق کی نگاہ ناز کو مشق ستم منظور ہے تو رقیب میری قبر کی نرگس کو اس غرض سے کیوں قلم کرنے لگے۔ اس لئے کہ اُنکو میری جانب معشوق کا اس قدر التفات بھی گوارا نہیں۔
سکہ اے چشم نم ہم معشوق کے روبرو کیونکر روئیں۔ خوف یہ ہے کہ اگر وہ ہمارے آب اشک میں اپنے چہرہ کا عکس دیکھ لے تو نجانے ہمپر کیا بنے۔ یعنی اُس کو غرور حُسن کے ساتھ شوقِ جفا اور زیادہ ہوجاے۔

جب[۵۴] دلِ اغیار خوں ہوکر مژہ تک آگیا — پھر لحاظِ غمزۂ شمشیر دم کیونکر کریں

اضطرابِ شوق شاید غیر اسکے پاس ہو — جانبِ چلون نظارہ دمبدم کیونکر کریں

ہے[۵۵] شبِ فرقت میں مرگ افسانہ خواں بیفائدہ — نام آرام آگیا خوابِ عدم کیونکر کریں

دیکھ پیچ و تابِ سنبل ہوگیا دل بے قرار — اب نہاں سودائے زلفِ خم بہ خم کیونکر کریں

سب کو ہوتا ہے جہاں میں پاس اپنے نام کا
ہم بھی تو مومن ہیں دل نذرِ صنم کیونکر کریں

۱۲۶

نہ تن ہی کے ترے بسمل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں — ہے پاش پاش جگر دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

جنونِ عشقِ پری روئے دل شکن ہے بلا — کہ روز طوقِ سلاسل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

اُٹھا کے سوتے میں دے پٹکا رات سر شاید — کہ زیرِ سر کے مرے سل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

دراز دستی یہ کس بے ادب نے کی دمِ قتل — تمام دامنِ قاتل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

یہاں ہے چاک گریباں تو واں بھی حسینی سے — قبائے شوخ شمائل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

یہ کس کی چشم فسوں گر نے کی فسوں سازی — طلسمِ جادوئے بابل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

یہ بے حجابی بُری گو مجھی کو جھانکو تم — کہ روز پردۂ حائل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

۵۴ غمزہ شمشیر دم = غمزہ جس کی کاٹ تلوار کی طرح ہے یعنی محبوب کے غمزۂ شمشیر دم کی بدولت اغیار کا دل خون ہوکر پلکوں تک آگیا۔ (غمزہ سے اُن کا جی تنگ آگیا) پھر اُن سے کیا توقع ہے کہ غمزۂ یار کا لحاظ کرینگے اور محبت سے کنارہ کش نہ ہوں گے۔ ۵۵ شبِ ہجر میں موت افسانہ خواں کی طرح ناحق مجھے (آخری نیند) سُلانا چاہتی ہے۔ کیونکہ خوابِ عدم میں بھی یک گونہ آرام کی صورت پائی جاتی ہے اور عاشق کو آرام سے پرہیز کرنا چاہئے۔ اپنے نہ مرنے کی خوب توجیہ کی ہے۔ واضح رہے کہ جب کسی کو نیند نہیں آتی تو افسانہ سُناتے ہیں کہ سو جائے۔

کہے نہ ملنے کی اُس سنگدل کے گر قاصد
تو سنگ و سر ابھی یاں مل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

نہ[1] کیونکہ رشک سے خوں ہو کسی کا اُس در پر
ہمیشہ اک نئے بسمل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

غزل سرائی کی مومن نے کیا کہ رشک سے آج
چمن میں سینے عنادل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

۱۲۷

ہے[1] جلوہ ریز نورِ نظر گردِ راہ میں
آنکھیں ہیں کس کی فرش تری جلوہ گاہ میں

کیا رحم کھا کے غیر نے دی بھی تمائے وصل
ظالم کہاں وگرنہ اثر میری آہ میں

مت کھینچو[2] دیر آنے میں کیا جانے کیا بنے
کھینچا کا ہے جذبِ شوق نے یوسف کو چاہ میں

اتنی بھی[3] تاب دوریِ خورشید طلعتاں
نقصان کیا کمال سے آیا ہے ماہ میں

جانے دے[4] چارہ گر شبِ ہجراں میں مت بلا
وہ کیوں شریک ہو مرے حالِ تباہ میں

۱۲۶ [1] اُس در پر مصرعِ ثانی سے متعلق ہے۔

۱۲۷ [1] نہ معلوم کس نے تیری جلوہ گاہ میں آنکھیں بچھائی ہیں کہ راہ کی گرد کا ہر ذرہ چشم تماشا بنکر محو دیدار ہے۔

[2] زلیخا کے شوق کی کشش نے حضرت یوسفؑ کو کنعان سے اپنی طرف اس طریقہ سے کھینچا کہ وہ بے اختیار کنوئیں میں گر پڑے۔ تم نے اگر آنے میں دیر کی تو کیا عجب کہ میری کششِ شوق کے ہاتھوں اسی طرح تم کو بھی تکلیف پہونچ جائے۔

[3] چاند کمال کی حالت میں خورشید سے دور تر ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ خورشید طلعتوں (حسینوں) کی جدائی کی تھوڑی سی برداشت بھی بہت مشکل ہے۔ دیکھو چاند کا کمال ہی اُس کے لئے کس قدر نقصان کا مترادف ہے۔ یعنی یہ کیا کم نقصان ہے کہ کامل ہونے کی حالت میں وہ خورشید سے دور رہتا ہے۔

[4] چارہ گر محبوب کو شبِ ہجر میں بلا کر کیوں میرے حالِ تباہ میں شریک کرتا ہے۔ شعر کی لطافت یہ ہے کہ عاشق ہجر کے صدمے میں اسقدر بدحواس ہے یا محبوب کی ہمدردی کے جذبہ سے اتنا بے تاب ہے کہ شبِ ہجر میں اُس کی تکلیف کا روادار نہیں۔ حالانکہ جب محبوب آجائے گا تو ہجر کی مصیبت ہی کہاں رہے گی۔

ظالم[شہ] وہ بیوفا ہے عدو جس کے رشک سے		اتنا کچھ آگیا خلل اپنے نباہ میں
اُس[شہ] منہ پہ اُس سے دعویٔ حسن اک ذرا نہیں		اے مہر روشنی مرے روزِ سیاہ میں
شیریں پہ طعنِ تلخیٔ فرہاد کس لئے		مجھکو بھی کچھ مزا نہ ملا تیری چاہ میں
ہے دوستی[شہ] تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا		جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں
ظالم[شہ] کہیں روا نہیں عاشق سے احتراز	ق	کہدے اگر ہو شک سخنِ دادخواہ میں
اب تک نہیں گواہیِ اطفال معتبر		محسوب ہے جو عصمتِ یوسف گناہ میں

مومن کو سچ ہے دولتِ دنیا و دیں نصیب
شب بتکدہ میں گذرے ہے دن خانقاہ میں

شہ عدو کے رشک کی وجہ سے مجھ جیسے وفادار کے نباہ میں بھی اس قدر فرق آگیا۔ اسی سے عدو کی بیوفائی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ عاشق نے اپنی ترک وفا کا ذمہ دار بھی رقیب ہی کو ٹھیرایا ہے یہ مکر شاعرانہ قابل داد ہے۔ شہ اے آفتاب تو اس منہ پر معشوق سے دعویٔ ہمسری کرتا ہے۔ اگر تجھ میں کچھ بھی روئے یار کی سی درخشانی ہوتی تو میرے روزِ سیاہ (طالع بد) میں بھی ضرور روشنی ہوتی۔ یعنی اگر معشوق آجائے تو میرا روزِ سیاہ روشن ہوجائے۔ تو روز آتا ہے پھر بھی میری تیرہ بختی بدستور ہے۔ اسلئے تیرا دعویٔ حُسن باطل ہے۔
شہ اگر تم کو دشمن (رقیب) سے دوستی ہے تو اُس کی طرف نظر نہ کرنا۔ کیونکہ تمھاری نظروں میں جادو بھرا ہوا ہے جس سے وہ غریب مسحور ہوکر دیوانہ ہوجائے گا۔ اس شعر میں بھی شاعرانہ مکر ہے۔ شہ یہ شعر اور شعر مابعد قطعہ بند ہیں۔ یعنی عاشق سے کہیں پرہیز کرنا جائز نہیں اگر تجھے میرے قول میں شبہہ ہو تو بتادے۔ دیکھ چونکہ حضرت یوسف ؑ کی عصمت گناہ میں داخل ہے (کیونکہ زلیخا سے پرہیز کرنا زلیخا پر معاذ اللہ ظلم تھا) اسلئے نتیجہ یہ ہوا کہ محض اس جرم پر کہ ایک لڑکے نے حضرت یوسف ؑ کی پاکی کی گواہی دی تھی، آجتک لڑکوں کی گواہی معتبر نہیں۔ واضح رہے کہ اطفال کی شہادت شرعاً غیر معتبر ہے۔ اس شعر میں یہ اشارہ ہے کہ جب حضرت یوسف ؑ نے زلیخا سے دامن چھڑایا اور زلیخا نے آپ پر اتہام لگایا تھا اُس وقت ایک طفل شیرخوار نے آپ کی پاکدامنی کی شہادت دی تھی۔

۱۲۸

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خوابِ ناز میں — ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں

اور ہی رنگ[1] آج ہے عارضِ گلعذار کا — خون دل اپنا تھا مگر گونۂ رخ طراز میں

کیونکہ نہ آدھی رات تک جاگے وہ جسکا دھیان ہو (آدھی آدھی رات) — آہوئے[2] نیمخواب میں نرگسِ نیم باز میں

خسرو[3] و عیش وصلِ یار جانکنی اور کوہکن — اپنا جگر تو خوں ہوا عشق کے امتیاز میں

بن[4] ترے بزمِ سور میں ہیں یہ قیامتیں کہ ہے — نفخۂ صور کا اثر نغمۂ نے نواز میں

اُن[5] سے اب التفات کی غیر کو ہیں شکایتیں — سن کے مرا مبالغہ منتِ احتراز میں

کیا سبھی سینے جل چکے کیا سبھی دل پگھل چکے — بوئے کباب اب نہیں آہ جگر گداز میں

---

[1] گونۂ رخ طراز = گلگونہ جس سے چہرہ کی آرایش کی جائے - آج محبوب گلرخسار کے عارض کا رنگ ہی کچھ اور ہے - گلگونہ میں تو یہ رنگ کہاں - شاید میرا خون دل اس میں شامل ہوگیا ہوگا

[2] آہوئے نیم خواب = آنکھ جو کچھ کھلی ہو کچھ بند ہو - نرگس نیم باز سے بھی نیم وا آنکھ مراد ہے - [3] عشق نے خسرو و کوہکن میں جو امتیاز رکھا اُس سے میرا جگر خون ہے کہ ایک کو عیش وصل میسّر ہوا - دوسرے کو جانکنی -

[4] بزم سور بمعنی محفلِ عیش - نفخۂ صور = دمِ صور - نے نواز = مطرب - تیرے بغیر بزم عیش میں قیامت برپا ہوجاتی ہے اس لئے کہ ایسی حالت میں نغمۂ مطرب نفخۂ صور کی تاثیر رکھتا ہے - سور اور صور میں تجنیسِ مضارع اور قیامت اور سور میں ایہام تناسب ہے -

[5] محبوب مجھ سے پرہیز کرتا ہے اور میں بصد مبالغہ اُس کے اِس احسان کا اعتراف کرتا ہوں نتیجہ یہ ہے کہ اب رقیب یہ سمجھکر کہ اسی (پرہیز) میں کچھ بہتری ہوگی محبوب کے التفات سے بیزار اور اُلٹا اُس کا شکوہ گزار ہے - احتراز (پرہیز) کو احسان اسلئے کہا کہ شاعر کے نزدیک کرم یار ستم سے زیادہ جانستاں رہتے -

پردہ نشیں[۵۷] کے عشق میں پردہ دری نہیں رخنۂ[۵۸] در سے غیر پاس دیکھا کسے کہ آج ہے	ہوتی ہیں بیجا بیاں جانِ نہفتہ راز ہیں رخنہ گری کچھ اور ہی نالۂ رخنہ ساز ہیں

یاد بتاں میں لاکھ بار فرطِ قلق سے ہم بھی تو
بیٹھے اُٹھے ہیں مومن آپ گریۂ شب نماز ہیں

۱۲۹

جیب[۱] درست لائق لطف و کرم نہیں	ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہیں
منظور[۲] ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں	اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں
سینہ[۳] صاف کر دیا ہو مرے ذوقِ قتل نے	قاتل کے آگے گردنِ اغیار خم نہیں
غیرت[۴] کی جا ہے رام نزاکت ہوا وہ شوخ	وحشت کا جوش کیونکہ ہو مجھ سے رم نہیں
کیا[۵] خوش ہوں کوئے غیر میں گر نقش پا ہو	وہ شوخ جانتا ہوں کہ ثابت قدم نہیں

۵۷ جان نہفتہ راز = جان جسکا راز مخفی ہے میری جان پردۂ راز سے نکلکر بے حجاب ہو رہی ہے اور میں مر رہا ہوں اس حالت میں اگر کوئی اندیشہ ہے تو یہ کہ مر کر کسی پردہ نشین کا رازِ عشق افشا نہ ہو جائے۔

۵۸ میں نے رخنۂ در سے معشوق کو رقیب کے پاس بیٹھے دیکھ لیا جسکا یہ اثر ہے کہ آج میرے نالۂ فتنہ انگیز میں پہلے سے زیادہ فتنہ گری آگئی ہے۔

۱۲۹ ۱ ناصح مجھے نصیحت کرتا ہے کہ چاک گریبان کو سینا چاہئے۔ مگر اُسکی یہ دوستی در اصل دشمنی کا حکم رکھتی ہے کیونکہ میں اگر شکستہ حال ہونگا تو محبوب کو رحم آئیگا۔ گریبان درست ہونے کی حالت میں کون توجہ کرنے لگا۔

۲ قاعدہ ہے کہ عادت کے خلاف ہر بات ناگوار گزرتی ہے۔ لہذا اگر تم مجھپر مشق جفا کرنی چاہتے ہو تو وصل سے بڑھکر اور جفا کیا ہوگی۔ کیونکہ میں ہجر کا اس قدر خوگر ہو گیا ہوں کہ وصل اب عادت کے خلاف ہونے کی بنا پر مجھے ناگوار ہوگا۔ ۳ میرے اشتیاق قتل کو دیکھکر اغیار کے حوصلے پست ہوگئے اور اب وہ قتل کے خوف سے قاتل کے سامنے گردن جھکانے کی جرأت نہیں کرتے۔ گردن خم کرنا علامت اطاعت و انقیاد ہے مطلب یہ ہے کہ جب سے اغیار نے سمجھ لیا ہے کہ قتل ہونا بھی لازمۂ اطاعت ہے وہ سرے سے اطاعت ہی سے کنارہ کش ہوگئے۔ ۴ وہ شوخ نزاکت کی وجہ سے اب مجھ سے رم (گریز) نہیں کرتا اور مجھے اس سے اُلٹی وحشت ہوتی ہے۔ کیونکہ رشک یہ سمجھاتا ہے کہ جب اُسے مجھ سے گریز نہیں تو رقیبوں سے بھی کیوں گریز کرنے لگا۔ رام یعنی مطیع۔ ۵ میں جانتا ہوں کہ معشوق ثابت قدم نہیں۔ اسلئے کوئے رقیب میں اُسکا نقش قدم دیکھکر مجھے کیا خوشی ہو۔ کیا عجب کہ وہ کسی اور کے کاشانۂ عیش کی زینت ہو یا پھر رقیب سے صلح کرلے۔

فریاد نالہ ہائے عزا بار[۶] پر انھیں
آیا ہے رحم کب کہ ذرا مجھ میں دم نہیں

کس[۷] بوالہوس کے حال پہ رویا وہ گلعذار
خارِ مژہ میں اب خلشِ دم بدم نہیں

جانا[۸] حرام ہجرِ بتاں میں تو کیا گناہ
پیرِ مغاں شراب ہے، شیشے میں سم نہیں

بے[۹] التفاتیاں جو عدو سے سنی نہ تھیں
ہم جانتے تھے وصل میں رنج و الم نہیں

معلوم[۱۰] ہو تو تیرے ہی عالم کا حال ہو
مرا دلِ دو نیم ہے یہ جامِ جم نہیں

بے[۱۱] جرم پائمال عدو کو کیا کیا
مجھکو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

ہوں[۱۲] آپ آپ اُف رے نگہ ہائے گرم گرم
اس مہروش کے سامنے آنکھوں میں نم نہیں

نامِ[۱۳] وصال لینے سے ہوتا ہے مضطرب
کیونکر کہوں اُسے مرے مرنے کا غم نہیں

۶ عزا بار = غم آفریں۔ ۷ معشوق گلرو رقیب کے حال پہ رویا۔ جسکا اثر یہ ہوا کہ اب اُسکے خار جیسی پلکوں سے میرے دل میں گھڑی گھڑی کھٹک نہیں ہوتی۔ یعنی جذبہ رشک کے باعث مجھے اُس (معشوق) سے اگلا سا تعلق خاطر نہیں رہا۔ قاعدہ ہے کہ خار جب تر ہوتا ہے اُس میں خلش کم ہوتی ہے۔ ۸ چونکہ شراب منجملہ لوازم عیش ہے۔ اسلئے ہجرِ بتاں میں ہم نے اُس کو حرام جانا تو کیا گناہ کیا۔ ہاں اگر زہر ہوتا تو حرام نہ سمجھتا۔ ۹ یعنی ہمارے ساتھ وصل میں بھی بے التفاتی ہے۔ ۱۰ جام جم میں تمام عالم کا حال معلوم ہوتا تھا مگر میرا دل جام جم نہیں۔ اِس (دل) میں اگر معلوم ہوگا تو تیرے ہی عالم (حسن) کا حال معلوم ہوگا۔ تمام دنیا سے مجھے کیا سروکار۔ ۱۱ اگر تم نے عدو کو بے قصور پائمال کیا تو کیا پروا۔ مجھکو تو اس کا مطلق خیال نہیں۔ یعنی اُس کی پائمالی دیکھکر میں اپنے انجام سے ڈرنے والا اور دہشت سے کنارہ کرنیوالا نہیں۔ ۱۲ معشوق مہروش کی نگاہ گرم (نگاہ غضب) کا یہ اثر ہے کہ خوف سے میری آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ شرم سے آپ آپ ہوں۔ کہ اظہار عشق کی کوئی صورت (اشکباری) نہیں رہی۔ اس میں لطف یہ ہے کہ مہر (آفتاب) کی تابش سے شبنم اُڑ جاتی ہے۔

۱۳ وصال کے لفظ میں رعایت ہے یعنی معشوق اُس سے وصل کے معنی لیتا ہے اور عاشق

ناصح[۱۵۴] کہاں تلک تری باتیں اٹھا سکوں
سچ ہے کہ مجھ میں طاقت جور و ستم نہیں

عاشق[۱۵۵] کشی ہے شیوہ اگر بوالہوس سہی
آخر کچھ اپنی جان کے دشمن تو ہم نہیں

مومن[۱۵۶] سوے حرم ہے نگاپوے فکر کیوں
کیا اس زمیں میں قافیہ بیت الصنم نہیں

۱۳۰

غنچہ ساں خاموش بیٹھے ہیں سخن کی فکر میں
قافیہ کیا تنگ ہے وصفِ دہن کی فکر میں

دامنِ[۱۵۷] قاتل کو وقتِ قتل کیونکر چھوڑتے
بیکسی سے جان تھی اپنی کفن کی فکر میں

شوقِ[۱۵۸] مردن کو بھی سامانِ سفر درکار تھا
سو ہے از خود رفتگی ترکِ وطن کی فکر میں

تلخیِ[۱۵۹] خسرو ہو شیریں کام شادیِ مرگ کیا
جانکنی ہے انتقامِ کوہکن کی فکر میں

۱۵۴ ناصح نے کہا تھا کہ تم میں طاقت جور و ستم نہیں۔ اسلئے عاشقی سے کنارہ کرو۔ عاشق جواب دیتا ہے کہ بیشک یہی وجہ ہے کہ مجھ سے تیری نصیحت کی برداشت نہیں ہو سکتی کیونکہ میرے لئے دراصل یہ (نصیحت) ہی جور و ستم کا حکم رکھتی ہے۔

۱۵۵ اس شعر میں عاشقی اور بوالہوسی کے فرق پر زور دیا ہے۔ یعنی اگر تمھیں عشق سے ضد ہے تو مَیں ہوس پیشگی اختیار کرونگا۔ کیونکہ تم بوالہوسوں کو قتل نہیں کیا کرتے۔

۱۵۶ غزل میں حرم کا قافیہ رہ گیا تھا اب اُسکی فکر بیسود ہے۔ آخر بیت الصنم کا قافیہ بھی تو موجود ہے۔ اُس کو کیوں ترک کیا جاے۔ بیت الصنم = بُت خانہ۔

۱۳۰ ۱۵۷ یعنی یہ خیال تھا کہ بیکسوں کو کفن کون دینے لگا۔ دامن قاتل ہی سے کفن کا کام لیا جاے۔

۱۵۸ جس طرح ہر سفر کے لئے سامان سفر کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح سفر عدم کے لئے بھی سامان چاہئے۔ وہ سامان کیا ہے؟ ترک وطن (دنیا) کے خیال میں میری بیخودی۔ یعنی اس راہ میں بیخودی ہی ذریعۂ سہولت ہو سکتی ہے۔

۱۵۹ خسرو کو وجودِ رقیب (کوہکن) کی بدولت جو تلخی نصیب تھی وہ رقیب کے مرنے سے فنا نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے کہ جانکنی خسرو سے کوہکن کے مرنے کا انتقام لینے کی فکر میں ہے اور ایک روز لیکر رہے گی۔ پھر خسرو کی تلخی کا کیا تعجب شیریں کام = لذت یاب۔ شادی مرگ میں یہ مفہوم ہے کہ موتِ رقیب سُنکر خود تلخیِ خسرو خوشی سے فنا ہو جاے الفاظ شعر کی رعایت ظاہر ہے۔

وہم عشق لالہ رو سے داغ دل کیا کیا کھلے
جان کر گلچیں کو تاراج چمن کی فکر میں

سر سے شعلے اٹھتے ہیں کس طرح روکوں کیا کروں
جل گیا جی ضبط آہ شعلہ زن کی فکر میں

ہے گریباں گیر واں نازِ تغافل اب تلک
جی جلایاں باعثِ دیر آمدن کی فکر میں

دردِ بے درماں مرا منت کشِ مرہم نہیں
داغ نو ہے چارۂ داغِ کہن کی فکر میں

گر یقینی واں دعا ہوتی ہے لے مومن قبول
جائیں گے کعبہ بھی طفلِ برہمن کی فکر میں

۱۳۱

دن بھی دراز رات بھی کیوں ہے فراقِ یار میں
کاہے سے فرق آ گیا گردشِ روزگار میں

بس کہ بن آئے مر گئے ہم شبِ انتظار میں
دن جو رہے تھے عمر کے جیتے رہے مزار میں

خاک میں وہ تپش نہیں خار میں وہ خلش نہیں
کیوں نہ ہمیں زیادہ ہو جوشِ جنوں بہار میں

ہو گئی کیا بلائے جاں بوسۂ زلف کی ہوس
پھیرتے ہیں زباں کو ہم کامِ دہانِ مار میں

۸ گلچیں کو تاراج چمن کی فکر میں جان کر میرے داغ ہائے دل تازہ ہو گئے کیونکہ مجھے وہم ہوا کہ یہ گلچیں کہیں اُس لالہ رو کے عشق میں مبتلا نہ ہوا اور گلوں کو رُخِ یار سے مشابہ سمجھ کر نہ توڑ رہا ہو۔
۹ آہ شعلہ فشاں نے نکلنا چاہا مگر میں نے اُس کو روکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضبط آہ کی کوشش میں جی جل گیا اور سر سے شعلے اُٹھنے لگے۔ اب آہ کے روکنے کی کیا تدبیر ہو۔
۱۰ داغ نو ہی داغ کہن کے علاج میں مصروف ہے۔ یعنی نئے مصائب پرانے مصائب کو خود بھلا دیتے ہیں۔

۱۳۱ ۱۱ گردش روزگار کا اثر یہ ہونا چاہیئے تھا کہ اگر دن بڑا ہوتا تو رات چھوٹی ہوتی یا رات دراز ہوتی تو دن مختصر ہوتا مگر فراق میں دن بھی طویل ہے اور رات بھی۔ ۱۲ چونکہ ہم بن موت آئے قبل از وقت شبِ انتظار میں مر گئے اسلئے عمر کے باقی دن جو رہ گئے تھے قبر میں کاٹنے پڑے۔ ۱۳ شاعر بہار میں اپنے جنون کی زیادتی کی توجیہہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آجکل (موسم بہار میں) خاک میں اگلی سی تپش یا خار میں پہلی سی خلش نہیں اور عاشق جو بالطبع وحشت پسند ہے ان چیزوں کا خوگر ہے اسلئے بہار میں ان کو نہ پاکر اُس کا جوشِ جنون زیادہ ہو جاتا ہے۔ ۱۴ بوسۂ زلف کی تمنا میں ناکامی ہوئی۔ اس وجہ سے ہم اپنی زبان سانپ کے مُنہ میں دیکر سانپ زلف سے گونہ مشابہت رکھتا ہے۔

مرگ۵۸ ہے انتہائے عشق یاں ہے ابتدائے شوق
زندگی اپنی ہوگئی رنجشِ یار میں

پوچھا ہے اُس نے کیا مری بیخودی و قلق کا حال
ہوش نہیں حواس میں تاب نہیں قرار میں

کیوں نہ گلے کا ہار ہو شوقِ اجل پڑے ہیں
پھول عدو کی خاک کے اُس نے گلے کے ہار میں

خاک اُڑائی گل نے یہ کس کے جنونِ عشق میں
آئے ہے کچھ اٹی ہوئی بادِ صبا غبار میں

لاکھ۵۹ شکستگی سے بھی دل کی گرہ نہ کھل سکی
عقدۂ مو ہے ہر شکن طُرّۂ تابدار میں

تھا۶۰ قلقِ بر رہی دشمنِ جاں شبِ فراق
کاٹ کے اپنے سر کو ہم بھیجتے ہیں کنار میں

دھیان میں مومن آگئی بحثِ جبر و اختیار
قابوئے یار میں ہیں ہم وہ نہیں اختیار میں

۱۳۲

کون کہتا ہے دمِ عشق عدو بھرتے ہیں
کہ ہوا باندھتے گو آہ کبھو بھرتے ہیں

شمع۶۱ پر کچھ نہیں موقوف کہ سارے ظالم
پانی آگے ترے اے عربدہ جو بھرتے ہیں

حوضِ میخانہ پیے سے بھی مرا جی نہ بھرا
کیا تنک ظرف ہیں جو خم سے سبو بھرتے ہیں

حسرتِ۶۲ بوسۂ کاکل کا کیا ہم نے علاج
زخمِ دل مشک سے اے غالیہ مو بھرتے ہیں

۵۸ عموماً عاشقی کی انتہا موت ہوتی ہے - مگر یہاں اسکے برعکس اسکی نوبت ہی نہ آنے پائی اور ہمیشہ ابتدائے شوق کی کیفیت رہی - اسلئے کہ جب کبھی ہم نے اظہارِ شوق کیا - محبوب کو ہم سے رنجش ہوگئی جس کے باعث تکمیلِ عشق نہ ہوسکی اور جذبۂ شوق افسردہ ہوگیا - اگر تکمیلِ عشق ہوجاتی تو ہمارا مرجانا یقینی تھا - غرض یہی سبب تھا جسکی بدولت ہماری زندگی قائم رہ گئی - ۵۹ میرا دل معشوق کی زلفِ پیچ پیچ میں بندھا ہوا ہے - مگر یہ تعجب ہے کہ لاکھوں شکنوں کے باوجود بھی زلف کی گیرائی کا یہ حال ہے کہ دل کی گرہ کھل نہیں سکتی گویا اسکی ہر شکن بال کی گرہ ہے جسکا وا ہونا دشوار ہوتا ہے - حالانکہ زلف کی شکستگی (شکن) کا تقاضا یہ ہونا چاہئے تھا کہ کھلنے میں آسانی ہوتی - ۶۰ قلق بر رہی = پہلو کے خالی ہونے کا غم -

۱۳۲ ۶۱ پانی بھرنا = اظہارِ اطاعت کرنا - عربدہ جو = جنگجو - ۶۲ زخم میں مشک بھرنے سے اذیت زیادہ ہوتی ہے - مشک کی مشابہت کاکل سے ظاہر ہے - غالیہ مو = جسکے بال غالیہ (عطر) کی طرح خوشبودار ہوں -

کر چکے سلکِ دُرِ اشک کا مذکور کہ ہم ۵۳
آج غمّازوں کے مُنہ دیکھیو تو بھرتے ہیں

اُس ستمگر سے مگر آنکھ لڑی ہے کہ حباب ۵۴
کیسے کچے گھڑے پانی لبِ جو بھرتے ہیں

کس کے ہاتھوں سے ہے دم نے کی طرح ناک میں جو
نالے کرتے ہیں کبھو آہ کبھو بھرتے ہیں

حالتِ نزع ہے چھپتے ہیں ترے ہجر میں خاک
دن جو کچھ عمر کے ہیں آئنہ رو بھرتے ہیں

اشک ۵۵ دیتے ہیں مرے نالۂ موزوں کا صلہ
موتیوں سے دہنِ زخمِ گلو بھرتے ہیں

غیر کرتے ہیں سبوئے مے گلگوں خالی
ساغرِ چشم میں ہم دل کا لہو بھرتے ہیں

پی ہے مے حضرتِ مومن نے بھی مضمضہ ۵۶ کو
آفتابے کئی ہنگام وضو بھرتے ہیں

١٣٣

مانے نہ مانے منعِ تپشہائے دل کروں
میں غیر تو نہیں کہ تماشائے دل کروں

ہو جان بھی جا کے کچھ تو مداوائے دل کروں
کب تک میں دل پہ ہاتھ دھرا ہائے دل کروں

سو طرح کے زیان ہیں رہنے میں اس کے گر
دشمن بھی مُفت لے تو میں سودائے دل کروں

مرتا ہوں ۱ کس عذاب سے ہے وقت جی میں ہے
اس دم دعا برائے تمنائے دل کروں

۵۳ ہم محبوب کے حضور میں اپنے اشکوں کے موتیوں کی لڑی کا ذکر کر چکے۔ اب دیکھنا اُن غمّازوں کا مُنہ کیونکر بند نہ ہوگا جو اُسکے سامنے ہمارے دعوائے عشق کی تردید کیا کرتے تھے۔

۵۴ کچے گھڑے پانی بھرنا = اظہار عجز کرنا۔ شاید حبابوں کی آنکھ اُس ستمگر سے لڑی ہے جو وہ لبِ جو اُسکے سامنے عاجزی کا اعتراف کرتے ہیں۔ حبابوں کی ناپائداری (کہ علامت عجز ہے) کی مناسبت سے کچے گھڑے کے الفاظ لطف دے رہے ہیں۔ شعرا حباب کو عموماً آنکھ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ۵۵ میں نے نالۂ موزوں کیا جس سے گلے میں زخم پڑ گیا۔ اب جو رویا تو آنسو گلے میں پھنس گئے۔ گویا اشکوں نے نالے کا یہ انعام دیا کہ دہنِ زخم کو موتیوں سے بھر دیا

۵۶ مضمضہ = کلّی۔ غرارہ۔

١٣٣ ۱ میں بڑے عذاب سے جان دے رہا ہوں اور یہ شہادت کی گھڑی اجابت دعا کا وقت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس وقت تمنائے دل کے لئے خدا سے دعا کروں۔ کیا عجب کہ قبول ہو۔

جانؔ دیدوں ہے اُس آفتِ جاں سے معاملہ	بس کب تک انتظار تقاضائے دل کروں
کیونکر پھرے دل اُس سے کہیں قرض و عاریت	ناصح و یا نہ تھا کہ میں دعوائے دل کروں
میںؔ اور وہ کوچہ لے گیا کس جائے ظلم ہے	اس پر بھی گر شکایتِ بیجائے دل کروں
چھٹتا ہے جیتے جی کوئی زنجیر زلف سے	دیوانہ ہوں کہ چارۂ سودائے دل کروں
بے رحم ہر نہ گر دلوں سے پاؤں گھس گئے	کیا ذکر جوش حوصلہ فرسائے دل کروں
دھبّا لگا ہے شوق سیہ کار زلف کو	اللہ کیا علاج سویدائے دل کروں
کہیئے جو درد دل تو وہ کہتا ہے مجھکو کیا	میں کیا طبیب ہوں کہ مداوائے دل کروں

اُس بت کو ترک دیں سے نہیں مومن اعتماد
کیونکر نہ میں شکایتِ اغوائے دل کروں

بے مزہ ہو کر نمک کو بیوفا کہنے کو ہیں سب جفا جو اُس ستمگر کے سوا کہنے کو ہیں	۱۴۴	کُھل گئے زخموں کے مُنہ کس کو بُرا کہنے کو ہیں جن کو پرنج و مرگ کہتے ہیں سُنا کہنے کو ہیں

لہ معشوق آفتِ جان ہے۔ دل لیکر جان کو مصیبت میں ڈال دیگا۔ لہذا اتنا کون انتظار کرے کہ وہ دل کا تقاضا کرے۔ بہتر ہے کہ بے مانگے پہلے ہی جان اُسکے حوالے کر دوں کہ مصیبت میں پڑنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ سلہ ناانصافی ہوگی اگر میں دل کی شکایت کروں کیونکہ اسی کی بدولت کوچۂ یار نصیب ہوا ورنہ میں اُس کوچہ کے قابل کب تھا۔ سلہ سویدا = وہ نقطۂ سیاہ جو دل پر ہوتا ہے۔ یعنی سویدائے دل کی وجہ سے میرے شوق کو بدنامی کا داغ ملا ہے کیونکہ لوگ یہ گمان کرنے لگے ہیں کہ دل کا نقطہ سیاہ زلف کی الفت کا اثر ہے۔ اب کیا تدبیر کروں جو یہ داغ بدنامی مٹے۔ زلف کی رعایت سے اپنے شوق کو سیہ کار کہا ہے سویدا کی مناسبت وجہ سے ظاہر ہے۔ سلہ یعنی دل کے بہکانے سے مذہب چھوڑا مگر اُس بت کو اب بھی اعتبار نہیں آتا۔

۱۴۴ لہ لب ہائے زخم کے کُھل جانے کی توجیہ شاعر نے یہ کی ہے کہ ان (زخموں) کو نمک میں لذت نہ ملی۔ اس لئے نمک کی شکایت کرنا چاہتے ہیں۔ نمک کو بیوفا اس لئے کہا ہے کہ اُس نے زخموں کا حق ادا نہیں کیا۔ سلہ کہنے کو ہیں یعنی برائے نام ہیں۔

نالہ ہی نکلے ہے گو ہم مدعا کہنے کو ہیں
لب نہیں کہنے میں اب کیا جانے کیا کہنے کو ہیں

۱۳ تیری تیغ و دشنہ کے کیوں لب پہ چھالے پڑ گئے
گرم خونی کا مری کیا ماجرا کہنے کو ہیں

دوست کرتے ہیں ملامت غیر کرتے ہیں گلہ
کیا قیامت ہے مجھی کو سب برا کہنے کو ہیں

۱۴ ترجمانِ التماسِ شوق ہے تغییرِ رنگ
جوں زبانِ شمع عاشق بے صدا کہنے کو ہیں

۱۵ جل گیا دل تو بھی اٹھتا ہے دھواں سر سے کہ اب
مرثیہ ہم اس چراغِ کشتہ کا کہنے کو ہیں

۱۶ دیکھنا کس حال سے کس حال کو پہونچا دیا
بخت تیرے عاشقوں کے نارسا کہنے کو ہیں

ایک دن کو تو زبانِ شعلہ دوزخ فرض ہے
قصۂ شبہائے غم روزِ جزا کہنے کو ہیں

شکوہ حرفِ تلخ کا یا شورِ بختی کا گلہ
ہم جو کچھ کہنے کو ہیں سو بے مزا کہنے کو ہیں

۱۷ میں گلہ کرتا ہوں اپنا تو نہ سن غیروں کی بات
ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں

وہ نہیں آتے نہ آویں مرگ ظالم تو تو آ
یاں لبِ شوق و تمنا مرحبا کہنے کو ہیں

غیر سے سرگوشیاں کر لیجیے پھر ہم بھی کچھ
آرزو ہائے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہیں

---

۱۳ شاید تیغ و خنجر نے میرے خون گرم کے ذکر کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اُسکے اثر سے اُنکے لب پر چھالے پڑ گئے۔ غلو ہے۔ ۱۴ جس طرح زبان شمع صدا نہ ہونے کے باوجود اپنا حال کہتی ہے اسی طرح عاشقوں کا رنگ متغیر بھی زبان حال سے روداد شوق کی ترجمانی کرتا ہے۔

۱۵ مدت ہوئی کہ دل جل چکا اور یہ نوبت آئی کہ ہم اس چراغ کشتہ (دل) کا مرثیہ کہنے کو تیار ہیں - پھر بھی اب تک سر سے دھواں اُٹھتا ہے۔

۱۶ نارسا کے لفظ میں قدرے ایہام ہے جس سے شاعر نے خاص فائدہ لیا ہے۔ اس لفظ کو ردیف الثار میں دیکھئے۔ ۱۷ تو غیروں کی بات پر اس لئے کان دھرتا ہے کہ وہ میرا گلہ کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو میری عرض سن - کیونکہ میں بھی تجھ سے اپنا گلہ کرنے والا ہوں۔

تیغِ غمزہ کو لگا لے جلد سنگِ سرمہ پر ھہ	حرفِ مطلب آرزومندِ جفا کہنے کو ہیں

ہو گئے نام بتاں سنتے ہی مومن بیقرار
ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

۱۳۵

وہ لہ علی الرغم عدو مجھ پہ کرم کرتے ہیں
ہے ستم لطف کے پردے میں ستم کرتے ہیں

طلبِ وصل کس انداز سے ہم کرتے ہیں
شوق نامہ اسے وصلی پہ رقم کرتے ہیں

جب ٹہ ترے کوچہ کا بیتابیِ دل سے پھرنا
یاد آتا ہے زمیں بوس قدم کرتے ہیں

نیم سہ بسمل ہیں نہ چھیڑ اے تپشِ دل کہ ابھی
روئے قاتل کا نظارہ کوئی دم کرتے ہیں

اے اجل کاش الٹ جائیں شبِ ہجراں میں
وہ دعائیں کہ تری جان کو ہم کرتے ہیں

دم میں مت آئیو اے غیر کہ مانندِ صبا
جس سے لگ چلتے ہیں وہ اس سے ہی رم کرتے ہیں

محضرِ کہ قتل ہے مکتوب گنہگاروں کا
سرِ قاصد کو وہ فتوے سے قلم کرتے ہیں

ھہ تیری جفاؤں کے آرزومند (عاشق) حرفِ مطلب کہنے والے ہیں۔ تجھے چاہئے کہ اُنکے جواب کے لئے آمادہ ہو جا اور غمزہ کی تلوار کو سنگ سرمہ پر تیز کر لے۔ یعنی آرائش جمال کر کے غمزہ کو مہیّائے بیدادگری کر۔ کیونکہ یہی (آرزوئے بیداد) ہمارا مطلب ہے۔ سنگ سرمہ وہ پتھر ہے جس سے سرمہ حاصل ہوتا ہے۔ یہاں خود سرمہ مراد ہے۔ جس طرح تیغ پتھر پر لگانے سے تیز ہو جاتی ہے اسی طرح غمزہ (اشارۂ چشم) سرمہ کی مدد سے سفاک تر ہو جاتا ہے۔

لہ علی الرغم عدو = رقیب کی ضد پر۔ یعنی رقیب کے ستانے کے لئے دوست کا مجھ پر کرم کرنا بھی میرے حق میں ستم ہے۔ گو بظاہر کرم معلوم ہوتا ہے۔ ٹہ تیرے کوچہ سے جدا ہو کر جب کبھی اُس کوچہ کی یاد آتی ہے تو ہم اپنے قدموں کی زمین بوسی کرتے ہیں کہ انھیں کی بدولت ایک زمانہ میں تیری گلی میں جانا میسّر ہوا تھا۔ زمین بوسی میں غم سے زمین پر گر پڑنے کا پہلو بھی نکلتا ہے۔

سہ ذبح کے وقت تڑپنے سے نظارۂ قاتل کی یکسوئی میں فرق آئیگا۔

کہ ہم نے قاصد کے ہاتھ خط بھیجا۔ معشوق نے اس جرم میں غریب قاصد کو قتل کر دیا۔ گویا ہم گنہگاروں کا مکتوب قاصد کے قتل کا محضر تھا جس سے اُس کو قتل کا فتویٰ یا سند جواز حاصل ہو گئی

دیکھنا اُس دہن تنگ کے بوسہ کا مزا		کہ ہوسناک تمنائے عدم کرتے ہیں
ہائے قسمت کہ ہوئی مجھ پہ جفا اور فزوں		ان دنوں غیر پہ گر لطف و کرم کرتے ہیں
کشتۂ یار ہوں اس رشک سے مرتا ہے جہاں		وہ بھی کیا ہیں جو مری موت کا غم کرتے ہیں
کیا ہی بیزار ہے اس زیست سے جی تا ستم		قتل کرتے نہیں وہ اور ستم کرتے ہیں
اپنے سودے کی نہ پوچھو کہ خریدار کے ساتھ		جنس ہیں تو ہے دل اور بیع سلم کرتے ہیں
آبرو رہ گئی مرنے کی کہ روتے تو ہیں وہ		اشک شادی ہی سے گو چشم کو نم کرتے ہیں

جا کے کعبہ میں بھی مومن نہ گئی دیر کی یاد
جائے لبیک سدا ہائے صنم کرتے ہیں

صورت دکھائیے جو کبھو جا کے خواب میں	۱۳۶	بے دید آنکھ کھول دے جھنجلا کے خواب میں
شب وہ جو سو رہے مرے پاس آ کے خواب میں		جاگے تھے بخت خفتہ تمنا کے خواب میں

شہ رقیبوں کو معشوق کے دہان تنگ کے بوسہ کا یہ مزا ملا کہ اب وہ زندگی سے عاجز ہوکر مرنے کی آرزو کرتے ہیں۔ ہوسناک = رقیب۔ دہن تنگ کی تشبیہ عدم سے مشہور ہے۔

سلہ میں کشتۂ یار ہوں۔ اس لئے دراصل میری موت تمام دنیا کے لئے موجب رشک بنی ہوئی ہے۔ ایسی حالت میں جو لوگ میرے مرنے کا غم کرتے ہیں کس قدر نادان ہیں۔

شہ بیع سلم۔ بدلی یعنی وہ بیع جس میں خریدار شے بیعہ پر فوراً قابض نہ ہو سکے۔ مراد یہ ہے کہ ہمارا معاملہ بھی عجیب ہے کہ دل کی جنس موجود ہے۔ پھر بھی ہم خریدار (معشوق) کے ساتھ بیع سلم کرتے ہیں۔ یعنی اگرچہ اُس سے دل کا سودا کرتے ہیں لیکن دراصل دل ہمارے ہی پاس رہتا ہے۔

شہ اشک شادی = آنسو جو فرط مسرت میں نکل آتے ہیں۔

۱۳۶ سلہ بے دید = بے مروت۔

سٹ میری تمنا کے سوئے ہوئے نصیب جاگے ضرور مگر خواب میں جاگے۔ اور ظاہر ہے کہ "میں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں"

آنکھوں کو بند کرکے وہیں کھول دے گر آئے ۳
کابوس میں بتا ہے مجھے واں تو رشک ہے ۴
وہ ہے بغل میں تو بھی تو یاں نیند اڑ گئی
سوتے رہتے پائے ناقہ زمان وداع گر ۵
ان نالہ ہائے شب کا اثر صبح دیکھیو
نیرنگ ۶ عشق سے نہ ہو غافل ہے ایک رنگ
رہتا ہے ۷ دھیان دیکھتے ہو جب مجھے نہیں
اُس ۸ کی گلی ہے نالۂ زنجیر غل نہ کر

یوسف کسی کے محو تماشا کے خواب میں
کاش اور کوئی آئے اطبا کے خواب میں
یہ سوچ ہے گیا نہ ہوا عدا کے خواب میں
طالع نہ ہوتے قیس کے لیلا کے خواب میں
آیا خلل گر اُس ستم آرا کے خواب میں
اس دل کے جاگنے میں زلیخا کے خواب میں
کیوں چونک چونک پڑتے ہو گھبرا کے خواب میں
یاں پاؤں جاگتے ہیں کوئی جا کے خواب میں

۳ یعنی اُسکے محو تماشا کو دیدار یوسفؑ کی خواہش نہیں۔
۴ کابوس ایک مرض ہے جس میں کثرت رطوبت دماغ کی وجہ سے آدمی خواب میں حرکات کرتا ہے اور ڈر جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب میرے خواب میں آتا ہے تو مجھ پر عجب کیفیت گذرتی ہے۔ اس کیفیت کو اطبا کابوس تجویز کرتے ہیں (یعنی میرے تاثر عشق کو مرض دماغ قرار دیتے ہیں) کاش یہ لوگ بھی کسی حسین پر عاشق ہوں اور کوئی ان کے خواب میں آئے تو ان کو میری حالت کا صحیح اندازہ ہو۔ اپنے محبوب کے معاملے میں تو رشک (مانع) ہے ہاں اور کوئی حسین ہو تو اچھا۔ اسکے سوا ان (اطبا) کا مزاج درست ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ عشق ان کی بلا جانے عاشق ہو تو پہچانے۔ الخ۔
۵ اگر قیس اور لیلیٰ کے نصیب خواب میں ہوتے تو رخصت کے وقت ناقۂ لیلیٰ کے پاؤں سو جاتے یعنی چلنے سے قاصر رہتے۔ ۶ شاعر معشوق سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ عشق کی شعبدہ کاری سے غافل نہ رہ اور یہ یاد رکھ جو زلیخا کے خواب میں کشش تھی وہی میری بیداری میں ہے۔ منقول ہے کہ زلیخا حضرت یوسفؑ کو خواب میں دیکھ کر عاشق ہوئی تھی آخر اُسکے جذب عشق نے اُن کو گھر سے کھینچ بلایا۔ ۷ تم جب کبھی (بیداری میں) مجھے دیکھتے ہو تو سوتے میں بھی تمہیں میرا ہی دھیان رہتا ہے نہیں (ورنہ خواب میں مجھے دیکھ کے) گھبرا کر کیوں چونک چونک پڑتے ہو۔ مراد یہ ہے کہ تمھاری نفرت مجھ سے اس حد تک پہونچ گئی ہے۔ ۸ اُس کوچہ کی کشش کا یہ حال ہے کہ پاؤں بھی وہاں سو کر جاگتے نہیں اسلئے نالۂ زنجیر کا سوتوں کو جگانے کی سعی کرنا بے سود۔

سو جاؤں روتے روتے تو کیا ہنس کے طعن سے — کہتا ہے[۹] سوتے ہو مرے بن آ کے خواب میں

کیا کفر ہے[۱۰] کہ چھوڑ دے سونا ہی گر کبھی
مومن نظر پڑے بتِ ترسا کے خواب میں

۱۳۷

سوزِ دل[۱۱] کے ہاتھ ڈھونڈھوں جو مامن آب میں — ہووے ہر ہر قطرہ داغ افزائے گلخن آب میں
گر ہو[۱۲] وہ دستِ حنائی عکس افگن خواب میں — ہووے مرجاں جوں چنار آتش زن تن آب میں
بیکسی دیکھو وفورِ اشکِ عبرت سے ہوا — بعد مردن جوں غریق اپنا بھی مدفن آب میں
دی دلِ سوزاں کو تشبیہ[۱۳] سمندر نے اب — چھوڑ کر آتشکدہ ڈھونڈے ہے مسکن آب میں
بیحجابانہ یہ رویا کون مجلس میں کہ ہے — غرق[۱۴] جوں آئینہ وہ شوخِ حیافن آب میں
دوستو مرتا ہوں اس رونے عرق آلودہ پر — لاش بھی میری بہانا بعد مردن آب میں
یادِ[۱۵] چشمِ یار میں دریا پہ رویا بن گئیں — مردمِ آبی کی پلکیں شمعِ روشن آب میں

۹ محبوب خواب میں آ کے کہتا ہے کہ تم میرے بن سوتے ہو۔ مصرع ثانی کی نثر سے مطلب واضح ہو جاتا ہے۔
۱۰ اس بتِ ترسا کے کفر کا یہ حال ہے کہ اگر کبھی مومن خواب میں نظر پڑے تو اس کی ضد سے سونا ہی ترک کر دے۔
۱۳۷ ۱۱ اگر میں سوزِ دل سے بچنے کے لئے پانی میں پناہ لوں تو میرے سوز کے اثر سے پانی کا ہر قطرہ گلخن کو بھی رشک سے داغ دے۔ ۱۲ اگر محبوب کا دستِ حنائی پانی میں عکس ڈالے تو اسکی تاثیر سے مونگے (مرجان) میں بھی درخت چنار کی طرح آگ لگانے کی خاصیت آ جائے۔ چنار کو پنجۂ انسان سے تشبیہ دیتے ہیں اور اس میں سے آگ نکلتی ہے۔ مرجاں کی تشبیہ بھی پنجے سے مشہور ہے۔ ۱۳ سمندر ایک جانور جو آگ میں رہتا ہے۔ میرے دلِ سوزاں کی مناسبت سے اب سمندر کو آتشکدہ میں رہنا دشوار ہو گیا ہے اور وہ گرمی کے مارے پانی کی جستجو کرنے لگا۔ ۱۴ معشوق غیر کے رونے پر شرم کے باعث آب عرق میں غرق ہو گیا جیسے آئینہ آب (چمک) میں غرق ہوتا ہے۔ حیا فن بہ معنی حیادار۔ خاص ترکیب ہے۔
۱۵ مردمِ آبی = ایک دریائی جانور جو انسان کی شکل ہوتا ہے۔ یادِ چشمِ یار میں دریا پر رونے کی خاصیت یہ ہوئی کہ مردمِ آبی کی پلکیں شمع کی طرح منور ہو گئیں۔

کون ڈوبا تشنگ آکر غرقِ دریائے الم
کیوں سدا شورِ تموّج سے ہے شیون آب میں

تشنہ کامِ آبِ تیغِ یار ہوں گرمی تو دیکھ
پھر تسکیں تیرتا ہوں تا بہ گردن آب میں

اشکِ چشم و گریۂ زخمِ دل اب میں کیا کروں
ہوگئی سب آستیں تر خوں میں دامن آب میں

کشتۂ غیرت ترے پانی چوانے سے ہے غیر [۱]
مرتے دم پاتا ہوں ذوقِ خونِ دشمن آب میں

ڈوب مریئے کیوں نہ غیرت سے جب اے مومن نہائے
غیر کے ہمراہ وہ طفلِ برہمن آب میں

۱۳۸

دکھاتے آئنہ ہو اور مجھ میں جان نہیں [۲]
کہوگے پھر بھی کہ میں تجھ سا بدگمان نہیں

جو یار صلح پہ ہے اب تو آسمان نہیں
وہ مہربان ہوا تو یہ مہربان نہیں

ترے فراق میں آرام ایک آن نہیں
یہ ہم سمجھ چکے گر تو نہیں تو جان نہیں

نہ پوچھو کچھ مرا احوال میری جاں مجھ سے
یہ دیکھ لو کہ مجھے طاقتِ بیان نہیں

یہ گُل ہیں داغ جگر کے انھیں سمجھ کر چھیڑ
یہ باغِ سینۂ عاشق ہے گلستان نہیں

نہ چاہوں روزِ جزا داد یہ ستم دیکھو [۳]
کب آزماتے ہیں جب وقتِ امتحان نہیں

[۱] تو نے مرتے دم میرے مُنہ میں پانی چوایا اور غیر اس رشک سے ہلاک ہوگیا - یہی سبب ہے کہ میں وقتِ آخر پانی میں غیر کے خون کا مزہ پاتا ہوں -
۱۳۸ [۲] میری حالت تو یہ ہے کہ جان باقی نہیں اور تمھاری یہ کیفیت ہے کہ اس خیال سے مجھے آئنہ دکھاتے ہو کہ مبادا عاشق مکر کر رہا ہو تو کیا اب بھی کہوگے کہ میں تمھاری طرح بدگمانی نہیں کرتا - قاعدہ ہے کہ جب کسی پر سکتہ وغیرہ کا احتمال ہوتا ہے تو مُنہ کے قریب آئنہ لیجاتے ہیں کہ سانس چل رہی یا نہیں -
[۳] یہ بھی معشوق کا ظلم ہے کہ قیامت میں مجھ سے اُمید رکھتا ہے کہ اُسکے ظلم کی داد خدا سے نہ چاہوں - اسلئے کہ وفاؤں کی آزمائش کا موقع دنیا میں تھا - نہ کہ آخرت میں -

نہ پوچھے حال تو جب تک مرا بیاں نہ کروں — مری زباں نہیں گر ترے دہاں نہیں
زبسکہ دیر لگی نامہ بر کو ڈھونڈتے ہم — عدم میں جاتے ہیں گو پاؤں کا نشاں نہیں
شبِ فراق میں پہونچی نہ دل سے جاں تلک[۳] — کہیں اجل بھی تو مجھ سی ہی ناتواں نہیں
وہ حال پوچھے ہے میں چشمِ سرمگیں کو دیکھ[۴] — یہ چپ ہوا ہوں کہ گویا مری زباں نہیں
نہ کیوں نثار ہو جاں فرطِ کینِ جاناں پر[۵] — کہ اُس کو میرے سوا اور کا دھیان نہیں

نکل کے دیر سے مسجد میں جا رہ اے مومن
خدا کا گھر تو ہے تیرے اگر مکاں نہیں

۱۳۹
ہجر اُس[۱] میں بھی زیست کیوں نہ چاہوں — جاں دادۂ شوخِ بے وفا ہوں
ہیں[۲] غیر مرے نکلنے سے خوش — گویا کہ میں اُن کا مدعا ہوں
اُف[۳] کر گئی یاد گرم جوشی — میں آتشِ مردہ سے جلا ہوں

۳ اجل کی ناتوانی اس سے ثابت ہے کہ دل سے جان تک کا فاصلہ طے نہ کر سکی۔ یعنی دل تو مردہ ہوگیا۔ جان ابھی باقی ہے۔
۴ اُس کی چشمِ سُرمگیں کو دیکھ کر میری گویائی جاتی رہی۔ اس میں رعایت یہ ہے کہ سرمہ کھا لینے سے آواز بیٹھ جاتی ہے۔
۵ میں معشوق کی دشمنی پر بھی فدا ہوں کہ اس کو ہر وقت میرا ہی خیال رہتا ہے (گو عداوت کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو) "میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں"

۱ میں ایک شوخ بے وفا پر عاشق ہوں اور چونکہ زیست بھی بے وفا کہلاتی ہے۔ اس لئے آلامِ فرقت کے باوجود اُس (زیست) کو بھی چاہتا ہوں۔ کیونکہ اُس کو بے وفائی میں معشوق سے یک گونہ نسبت ہے۔ یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ میں ہجر میں اس لئے جینا چاہتا ہوں کہ میرے مرجانے پر کہیں وہ بے وفا شوخ مجھے کم ہمتی کا طعنہ نہ دے۔ ۱۳۹

۲ مدعی جس چیز کے نکلنے سے خوش ہوا کرتے ہیں وہ اُنکا مدعا ہے۔ اور چونکہ وہ میرے نکلنے سے خوش ہیں۔ اسلئے گویا میں اُن کا مدعا ہوں۔ ۳ اُف کرنا = پھونک دینا۔ گرم جوشی = اختلاط محبوب کے ساتھ پہلے جو مراسم اختلاط تھے اُنکی یاد نے مجھے پھونک دیا۔ گویا میں بجھی ہوئی آگ سے جلا ہوں گرم جوشی گذشتہ کو آتشِ مردہ کہنا ندرت و لطافت سے خالی نہیں۔

کیا شکوہ۱ جفائے آسماں کا ‏— میں آپ کو دور کھینچتا ہوں
دشمن۲ سے ہے چشم مہربانی ‏— محروم نگاہ آشنا ہوں
ربط۳ اُس سے ہے مثل شعلہ و شمع ‏— مرجاؤں گر ایک دم جدا ہوں
کیونکر۴ نہ بگڑ کے وہ نکالے ‏— میں دل کے غبار سے بنا ہوں
شکوہ نہیں غیر کے ستم کا ‏— انصاف کرو تو میں بھی کیا ہوں
کھاتا ہوں بدن پہ عشق میں داغ ‏— اعمال۵ کی اپنے خود جزا ہوں
ہے طعن سے مدح شام ہجراں ‏— میں کیسی بلا کو چھیڑتا ہوں
اُس کو۹ میں نہ چھوڑ جائے مجھکو ‏— ہرچند عدو کا نقش پا ہوں
خود۱۰ بینی و بیخودی میں ہے فرق ‏— میں تم سے زیادہ کم نما ہوں
بیزار ہے سوز عشق سے جی ‏— کس شعلہ مزاج سے خفا ہوں

۱ه میں اپنی تکالیف کو آسمان سے منسوب کرنا اپنی عالی حوصلگی کے منافی سمجھتا ہوں۔
۲ه دشمن = رقیب۔ چشم بمعنی توقع۔ آشنا سے محبوب مراد ہے۔ ۳ه میرا دوست سے ربط ایسا ہے جیسے شعلہ کا شمع سے۔ جب شعلہ شمع سے جدا ہوتا ہے تو فنا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح میں بھی دوست کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ۴ه میں سرتاسر غبار و کدورت ہوں۔ گویا میری تخلیق غبار دل سے ہوئی ہے۔ پھر محبوب کیوں نہ بگڑ کر مجھے نکالے۔ قاعدہ ہے کہ لوگ بگڑ کر (ناراض ہوکر) دل کا غبار نکالتے ہیں۔ ۵ه یعنی خود میرا وجود میرے عمل کی مکافات ہے۔
۹ه بالفرض اگر میں رقیب کا نقش پا بھی بنجاؤں تو بھی وہ مجھے کوئے یار میں چھوڑنے کا نہیں۔ قاعدہ ہے کہ انسان کہیں سے جاتا ہے تو نقش قدم زمین پر چھوڑ جاتا ہے۔
۱۰ه محبوب کو اپنی کم نمائی پر ناز ہے۔ یعنی یہ کہ وہ خود نمائی نہیں کرتا اور مشتاقوں کو جمال نہیں دکھاتا۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر کم نمائی قابل ستائش ہے تو میں تم سے زیادہ کم نما ہوں۔ اسلئے کہ تم کم از کم خود بینی تو کرتے ہو (تم اپنے آپ کو تو دیکھتے ہو) میری تو بیخودی میں بسر ہوتی ہے (مجھے اپنی بھی خبر نہیں)۔

مجھ[۱۱] رمز شناس سے یہ باتیں		کیا خوب میں غیر سے بُرا ہوں
اسکے[۱۲] کاش عدو کو غیرت آوے		مَیں منتظر اپنی مَوت کا ہوں
	اس نام کے صدقے جس کی دولت[۱۳]	
	مومن زہوں اور بتوں کو چاہوں	
ہر دم[۱] رہین کشمکشِ دست یار ہیں	۱۴۰	چلون کے بند کس کے گریباں کے تار ہیں
بالیدہ دم بدم جو مرے دل کے خار ہیں		ہر آن برچھیاں سی کلیجے کے پار ہیں
کیا کیجیے[۲] کہ طاقتِ نظارہ ہی نہیں		جتنے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں
عمر[۳] دراز کی ہے رقیبوں کو آرزو		دیکھو زمانِ ہجر کے امیدوار ہیں
مضطر[۴] وہ گُل جو میرے دمِ سرد سے ہوا		کیا کیا شمال و بادِ صبا بیقرار ہیں
چھاتی سے میں لگائے رکھوں کیوں نہ رات دن		یہ داغ و زخم دل کی مرے یادگار ہیں

۱۱ شاید معشوق نے اپنی ستمگری کی تائید میں کہا ہے کہ ارباب زمانہ دوستی کے قابل نہیں۔ عاشق رمز شناس تاڑ گیا کہ یہ تعریض مجھ پر ہے چنانچہ کہتا ہے کہ کیا میں غیر سے بھی گیا گذرا ہوں۔ جو مجھ سے یہ دلآزاری کا سلوک اور اُس سے وہ دلجوئی کا برتاؤ۔ ۱۲ یعنی میری یہ کیفیت دیکھکر کاش عدو کو رشک آئے اور وہ بھی طالب مَوت ہو۔ ۱۳ دولت = بدولت۔

۱۴۰ ۱ چلون (چلمن) کے بند جو ہر وقت تاکنے جھانکنے کی وجہ سے دست یار کی کشمکش میں گرفتار ہو کر پارہ پارہ ہو گئے ہیں کسی عاشق کے گریبان کے تار سے مشابہ ہیں کیونکہ یہ بھی دست جنون کی کھینچا تانی میں سلامت نہیں رہتے۔ ۲ یعنی ہم اسلئے شرمسار ہیں کہ ہمیں محبوب کے بے حجابانہ جلووں کے نظارہ کی تاب نہیں ۳ رقیب عمر دراز کے طالب ہیں۔ مگر چونکہ عاشق کے نزدیک زمانہ ہجر ہی دراز ہوتا ہے اس لئے وہ سمجھتا ہے کہ یہ نادان ہجر کے امیدوار ہیں۔
۴ شمال = وہ ہوا جو قطب شمالی سے چلے۔ صبا = پُروا ہوا۔ وہ گُل (محبوب) میری آہ سرد سے بے چین ہو گیا جس کے رشک سے شمال و صبا بیقرار ہیں۔

جز نہ سپہر ہیں مرے دشمن تو اور بھی — لیکن بڑے غضب کے یہی دو تین چار ہیں

ہجوِ۵ ملیح غیر سمجھ کر مزے اُٹھائے — خوش حرف بے نمک سے بھی ہم دلفگار ہیں

کیسا۶ فلک کہ اختر طالع جلا دئے — کیا سرد مہر میرے دم شعلہ بار ہیں

کیونکر نہ رحم حال پہ آئے شبِ وصال — اندوہ و درد روزِ مصیبت کے یار ہیں

پانی کے بدلے برسے گی آج آگ ابر سے — اُٹھتے ہماری خاک سے بھی کچھ بخار ہیں

شبنم۸ خراب مہر کتاں سینہ چاکِ ماہ — لو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں

ناصح سے مجھکو کیونکہ نہوں بدگمانیاں — دشمن ہیں جو مرے وہ ترے دوستدار ہیں

کیسے گلے رقیب کے کیا طعن اقربا — تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

مردوں۹ کو تجھ پہ دیتے ہیں ترجیح جو حسود

مومن یہ جان لے کہ سگِ جیفہ خوار ہیں

۵ محبوب نے غیر کی تعریف کی چونکہ غیر میں کوئی بات تعریف کے قابل نہیں اسلئے ہم نے اُس کو غیر کی ہجو ملیح سمجھ کر لطف اُٹھایا اور دل کو تسلی دے لی گویا ہم دلفگار حرف بے نمک سے بھی خوش ہیں۔ ورنہ دلفگار تو نمک سے خوش ہوا کرتے ہیں۔ مدح غیر کو بے لطف ہونے کی بنا پر حرف بے نمک کہا۔ ہجو ملیح اُس ہجو کو کہتے ہیں جس میں بظاہر مدح کا احتمال ہو۔ ملیح مزے۔ نمک۔ دلفگار میں ایہام تناسب ہے۔ ۶ میری آہ شعلہ بار اس قدر بے مروت ہے کہ آسمان تو ایک طرف۔ میرے نصیب کے ستارے کو بھی جلا دیا کہ وہ بھی آسمان پر تھا۔ مطلب یہ ہے کہ میری آہوں نے میری تیرہ بختی میں اور اضافہ کر دیا۔

۷ اندوہ و درد مصیبت کے دن میرے ساتھی تھے۔ اب وصال کی شب ان دونوں سے جدائی ہوتی ہے۔ اسلئے ان کی بیکسی پر کیوں نہ رحم آئے۔

۸ میں سمجھتا تھا کہ صرف میں ہی ستم زدۂ روزگار ہوں۔ اب معلوم ہوا کہ شبنم بھی آفتاب کی محبت میں برباد اور کتاں بھی ماہ کے عشق میں سینہ چاک ہے قاعدہ ہے کہ شبنم طلوع آفتاب پر فنا ہو جاتی ہے اور کتاں نور مہتاب میں پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ ۹ جو حاسد شعرائے سلف کو مومن پر ترجیح دیتے ہیں اُن کو سگِ مردار خوار قرار دیا ہے۔ جیفہ = مردار۔

۱۴۱

شبِ وصل اُسکے تغافل کی زبس تاب نہیں — تلخیٔ مرگ ہے آنکھوں میں شکرِ خواب نہیں

حسرتیں میرے نصیبوں میں لکھی ہیں کیا کیا — اتنے دفتر میں کہیں فصل نہیں باب نہیں

دل کا کیا حال کرے دیکھئے یہ گرمیِ حسن — ٹھہرتا آئینۂ یار میں سیماب نہیں

سر فروشوں کے اگر آپ خریدار ہوئے — تو گراں ہووے گی وہ جنس جو کمیاب نہیں

جب وہ بدمست اِدھر آیا تو عدو کے گھر سے — اپنی قسمت میں بجز دُردِ مئے ناب نہیں

رستمی کا عوض افلاک سے لوں گا پسِ مرگ — قتلِ عاشق ہے یہ خونریزیٔ سہراب نہیں

کلبۂ تار میں کیونکر ترے بن گذرے گی — دن کو یاں دھوپ نہیں رات کو مہتاب نہیں

محتسب ہم سے ہے تو پہلے پلا دیکھ مجھے — نہ گُلنڈھا پی لے مئے ناب ہے زہرآب نہیں

عشق کیوں درپئے جاں شوق ہے کیوں سینہ شگاف — دشمنیِ دل شکنی شیوۂ احباب نہیں

گلۂ چرخ عبث شکوۂ جاناں بے جا — یاس و حرماں کو مرے حاجتِ اسباب نہیں

کشش ابروئے صنم کی سی کہاں اے مومن
لاکھ سجدے کرے دل مائلِ محراب نہیں
سرلشیں

۱۴۱ ۱ مجھے شبِ وصل یہ کبھی گوارا نہیں کہ ذرا دیر کو بھی محبوب مجھ سے غافل ہو۔ اگر ایسا ہوا تو میرے لئے پیامِ موت ہے۔ اس لحاظ سے شبِ وصل اُسکی آنکھوں میں جو نیند آرہی ہے اُسکے لئے شکرِ خواب ہو مگر میرے حق میں تلخیٔ مرگ ہے کہ اتنی دیر وہ مجھ سے غافل رہیگا۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ میری آنکھوں میں جو شکرِ خواب وصل کا اثر ہے درحقیقت میرے لئے تلخیٔ مرگ کا حکم رکھتا ہے کیونکہ اتنی دیر بھی محبوب سے غفلت مجھکو گوارا نہیں۔ مگر اس صورت میں مصرعِ اول میں "اُس" سے "تغافل" ہونا چاہئے۔ ۲ اُسکی گرمیِ حسن کا یہ عالم ہے کہ ہنگامِ زینت آئینہ میں سیماب نہیں ٹھیرتا۔ دیکھئے اس گرمیِ حسن کے ہاتھوں میرے دل پہ کیا گذرے۔ قاعدہ ہے کہ سیماب گرمی سے اُڑ جاتا ہے۔

۳ یعنی اُس صورت میں یہ جنس کم ارز (سرفروش) گراں قیمت ہو جائیگی۔ شعر میں ندرت یہ ہے کہ عموماً جنس فراواں ارزاں ہوتی ہے۔ لیکن یہاں معاملہ برعکس ہوگا کیونکہ اب اُس کی خریداری بڑھ جائے گی۔ ۴ وہ بدمست رقیب سے ملاقات کرکے میرے یہاں آیا۔ گویا شراب تو رقیب کے حصہ میں آئی اور تلچھٹ میرے حصہ میں ۵ اگر تو آئے تو میرا خانۂ تاریک روشن ہو سکتا ہے۔ ۶ عشق اور شوق کو شاعر نے احباب قرار دیا ہے۔ ۷ یاس و حرمان ازل سے میری فطرت میں ودیعت ہیں۔ اسلئے اُن کے لئے سبب تلاش کرنا بے سود ہے۔ اور چرخ اور معشوق کی شکایت فضول۔

۱۴۲ آہِ[1] فلک فگن ترے غم سے کہاں نہیں — جو فتنہ خیز اب ہے زمیں آسماں نہیں

کہنا[2] پڑا مجھے پئے الزام پند گو — وہ ماجرا جو لائق شرح و بیاں نہیں

ڈرتا[3] ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے — صیّاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

اظہار[4] دوستی کی خوشی کیا شب وصال — دشمن سے سُن چکا ہوں کہ تو مہرباں نہیں

باتیں[5] تری وہ ہوش رُبا ہیں کہ کیا کہوں — جو کوئی رازداں ہے مرا رازداں نہیں

نوشیدئی[6] جواب ہے کیوں اتنے شوق پر — یہ کیا ہوا کہ میں پس قاصد رواں نہیں

پیش عدو سمجھ کے ذرا حال پوچھنا — قابو میں دل نہیں مرے بس میں زباں نہیں

بے[7] صرفہ جانکنی کا مری کچھ تو ہو حصول — محنت کسی کی آج تلک رائگاں نہیں

کرتے[8] وفا اُمید وفا پر تمام عمر — پر کیا کریں کہ اُس کو سر امتحاں نہیں

اُس[9] کو بھی جانتا ہوں فریب وصال غیر — تم کو عبث یقیں ہے کہ میں بدگماں نہیں

۴۲ [1] دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں تیرے غم (عشق) میں آسمان گرانے والی آہیں بلند نہ ہوتی ہوں اسلئے جو فتنے پہلے آسمان سے نازل ہوتے تھے اب تیرے دور میں زمین سے اُٹھتے ہیں۔ [2] پند گو (ناصح) مجھے عشق سے مانع آتا تھا۔ آخر اُسکے قائل کرنے کے لئے مجھے مجبوراً ایسی باتیں یار وصف یار۔ لذت عشق وغیرہ) کہنی پڑیں جو لائق بیان نہ تھیں۔ [3] میری قسمت ہر حال میں کسی نہ کسی آفت کا نشانہ رہتی ہے۔ اگر آشیاں صیاد کی نظر سے بچ گیا تو برق سے تباہ ہوگا۔ [4] میں دشمن سے تیری نامہربانیاں سُن چکا ہوں۔ اسلئے مجھے جو تو اظہار دوستی کرتا ہے اُس کا مجھے اعتبار نہیں آتا۔ یعنی جس طرح تو نے اُس سے قطع ارتباط کیا ہے ایک روز مجھ سے بھی کرے گا۔

[5] تیری باتیں ایسی ہیں کہ سننے والوں کے ہوش اُڑتے ہیں۔ اسلئے جس سے میرا راز الفت بیان کرتا ہوں وہ سرے سے کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ [6] شوق کا تقاضا یہ تھا کہ عاشق قاصد کو روانہ کرکے خود اُسکے پیچھے دوڑا جاتا مگر مایوسی جواب کا یہ اثر ہے کہ قاصد کے پیچھے جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ [7] بے صرفہ = بے فائدہ۔

[8] اگر اُسکو ہماری آزمائش کا خیال ہوتا تو یہ اُمید بندھتی کہ ہماری وفا سے مطمئن ہوکر وہ کبھی ہم سے وفا کرے گا مگر کیا کیجیے کہ اُسکو آزمایش کا خیال ہی نہیں۔ سر = خیال۔ [9] معشوق نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ تم (عاشق) مجھ سے بدگمان نہیں۔ عاشق جواب دیتا ہے کہ تمھارا کہنا دراصل وصال غیر کا فریب ہے۔ یعنی تم یہ چاہتے ہو کہ اس طرح میری تعریف کرکے واقعات وصل غیر پر پردہ ڈالو اور میں اُسکا تجسس نہ کروں

میں[۱۰] اپنی چشم شوق کو الزام خاک دوں
تیری نگاہ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

فطری[۱۱] ہے پیر چرخ نے اپنا مقابلہ
طفلی سے مجھکو حسرت بخت جواں نہیں

گذرے[۱۲] ہیں میری خاک سے غیروں کے ساتھ وہ
فتنہ اُٹھا ہے گرد پس کارواں نہیں

لگ[۱۳] جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فراق
ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

اتنے[۱۴] سبک نظر میں ہیں اوضاع روزگار
دُنیا کی حسرتیں مرے دل پر گراں نہیں

ہر ذرہ میری خاک کا برباد ہو چکا
بس اے خرام ناز کہ تاب و تواں نہیں

نالے کے ساتھ دم کے نکل جانیکا ہے خوف
پر کیا علاج طاقت ضبط فغاں نہیں

میں[۱۵] جانتا ہوں نعش پہ آنے کا مُدعا
آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

اُس[۱۶] بُت کی ابتدائے جوانی مراد ہے
مومن کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں

۱۰ جو مراسم اختلاط میرے اور تیرے مابین ہو چکے ہیں خود تیری نگاہ شرم سے ظاہر ہیں۔ میری چشم شوق کا کیا قصور
۱۱ بخت جوان = طالع نیک۔ مجھے لڑکپن سے بخت جوان کی تمنا نہ تھی۔ اگر ہوتی تو میں آسمان سے دشمنی مول نہ لیتا۔ فطری میں یہ مفہوم ہے کہ آسمان سے مخالفت میری فطرت کا مقتضا ہے "پیر" اور "طفل" کا "مقابلہ" ملحوظ رہے۔ ۱۲ چونکہ وہ میری قبر پر ہو کر گذرے ہیں اور گذرے بھی ہیں تو رقیبوں کے ساتھ۔ اسلئے گرد کارواں کے بدلے زمین سے فتنہ اُٹھا ہے۔ ۱۳ شاید ناصح کی پندگوئی کو افسانہ سمجھکر میں کوئی دم کو سو رہوں۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ شاعر کے نزدیک اُسکی نصیحت افسانہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ بلا کی شوخی ہے۔
۱۴ دنیا کے معاملات کو میں اس قدر سُبک (حقیر) سمجھتا ہوں کہ اگر اُن میں ناکامی ہوتی ہے تو گراں نہیں گذرتی۔ سُبک اور گراں میں ایہام تضاد ہے۔
۱۵ میری نعش پر تیرے آنے کی غرض اسکے سوا کچھ نہیں کہ تیری شوخیاں چاہتی ہیں کہ مجھے مر کر بھی چین نہ ملے۔
۱۶ روایات مذہبی میں آخر زمانہ (قرب قیامت) کے فتنوں کی پیشگوئی کی گئی ہے۔ اُس سے معشوق کے ابتدائے شباب کی ہنگامہ آفرینیاں مراد ہیں اور بس۔

١٤٣ تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں | بیچارگی سے جان پڑی کس عذاب میں
بے نالہ مُنہ سے جھڑتے ہیں بے گریہ آنکھ سے | اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب میں
چرخ و زمیں میں توبہ کا ملتا نہیں سُراغ | ہنگامۂ بہار و ہجوم سحاب میں
[1] اسے زہرہ چہر دشمنِ منحوس کو نہ دیکھ | نالے بہیں گے خون کے اس فتح باب میں
[2] اتنی کدورت اشک میں حیراں ہوں کیا کہوں | دریا میں ہے سراب کہ دریا سراب میں
[3] فکرِ مآل سے مے و شاہد رہے عزیز | پیری میں موت یاد تھی پیری شباب میں
[4] تم نکلے بہر سیر تو نکلے گا مہر بھی | ہووے گا اجتماع شبِ ماہتاب میں
[5] ڈوبی ہجوم اشک سے کشتی زمین کی | ماہی کو اضطراب ہوا جوشِ آب میں
کھولا جو دفترِ گلہ اپنا زیاں کیا | گذری شبِ وصال ستم کے حساب میں

١٤٣ [1] فتح باب = دو ستاروں کی اس طرح نظر کہ اُنکے خانے باہم مقابل ہوں اور جب ایسا واقع ہوتا ہے تو بارش ہوتی ہے۔ مجازاً بارش۔ معشوق حُسن کی وجہ سے زہرہ جمال اور رقیب منحوس ہونے کے باعث زحل شیم ہے۔ اِن دونوں کی نظریں اگر باہم دگر مقابل ہوگئیں تو عاشق کو ڈر ہے کہ پانی کے بدلے خون کے نالے بہ جائیں گے۔ [2] سراب = وہ ریگ جو دور سے پانی معلوم ہو کدورت کو سراب سے اور اشک کو دریا سے تشبیہ دی ہے۔ [3] شراب اور معشوق کی محبت کا سبب یہ تھا کہ مجھے اپنے انجام کار کی فکر تھی یعنی شباب میں خیال تھا کہ ایک دن پیری آنے والی ہے اور پیری میں خوف تھا کہ ایک روز موت آئیگی اسلئے سوچا کہ جس قدر اور جتنی جلد داد عیش دے لوں اچھا ہے۔ شعر میں غضب کی شوخی ہے۔

[4] اجتماع اصطلاح تنجیم میں شمس و قمر کے جمع ہونے کو کہتے ہیں۔ یعنی تمھارا چاند نی میں بہر سیر نکلنا آفتاب کا طلوع ہونا ہے۔ اس طریقہ سے شب مہتاب میں ماہ و مہر کا اجتماع ہو جائیگا۔ ممکن ہے کہ مہر سے حقیقۃً مہر آسمان مراد ہو۔ یعنی تمھارے اشتیاق دید کی وجہ سے شبِ ماہ میں آفتاب برآمد ہوگا۔ [5] میں اس قدر رویا کہ میرے اشکوں کے طوفان سے ماہی زمین بیقرار ہوگئی۔ آخر اُسکی بیقراری کی وجہ سے کشتیٔ زمین جو اُسکے سہارے رُکی ہوئی تھی ڈوب گئی۔

اے حشر جلد کر تہ و بالا جہان کو
یوں کچھ نہ ہو اُمید تو ہے انقلاب میں

قاتل جفا سے باز نہ آیا وفا سے ہم
فتراک میں جو سر ہے تو جاں ہے رکاب میں

بازیچہ کر دیا ستمِ یار و جورِ چرخ
طفلی سے غلغلہ ہے مرا شیخ و شاب میں

مومنؔ[۵۵] یہ عالم اُس صنمِ جانفزا کا ہے
دل لگ گیا جہانِ سراسر خراب میں

۱۴۴
جلتا[۱] ہوں ہجر شاہد و یادِ شراب میں
شوقِ ثواب نے مجھے ڈالا عذاب میں

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

پھیلی[۲] شمیمِ یار مرے اشکِ سُرخ سے
دل کو غضب فشار ہوا پیچ و تاب میں

چینِ[۳] جبیں کو دیکھ کے دل بستہ تر ہوا
کیسی کشودِ کار کشادِ نقاب میں

۵۵ اُس صنمِ جانفزا کے حُسن میں وہ دلکشی ہے کہ اُسکی بدولت جہانِ ویران میں میرا دل لگ گیا۔

۱۴۴ ۱ میں نے شوقِ ثواب کی خاطر سے معشوق کو ترک کیا تھا مگر اب اُنکی جُدائی میں جل رہا ہوں۔ یعنی جس عذاب کے خوف سے معشوق کو چھوڑا تھا وہی پیش آیا۔

۲ پیچ و تاب کی حالت میں میرے دل پر سخت دباؤ پڑا اور اشکِ سُرخ دل سے آنکھوں کی راہ نکلے۔ جس طرح پھولوں کے نچوڑنے سے عطر نکلتا ہے۔ مگر عطر سے خوشبو برآمد ہوتی ہے۔ یہاں میرے اشکِ سُرخ سے بوئے یار پھیلی کیونکہ وہی میرے اندر بسا ہوا ہے۔ ۳ پہلے تو اُمید تھی کہ رُخ سے یار کے نقاب اُٹھے گی تو کشود کار (کامیابی) نصیب ہوگی۔ مگر جب نقاب اُٹھی تو چینِ جبیں نظر آئی جس سے اور زیادہ دل گرفتگی بڑھ گئی۔ بستہ کشود اور کشاد میں رعایت ہے۔

۵۵ ہم کچھ تو بد تھے جب نہ کیا یار نے پسند
اے حسرت اسقدر غلطی انتخاب میں

رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام
آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

۵۶ آنکھ اُسکی پھر گئی تھی دل اپنا بھی پھر گیا
یہ اور انقلاب ہوا انقلاب میں

۵۷ بدنام میرے گریہ رسوا سے ہو چکے
اب عذر کیا رہا نگہِ بے حجاب میں

مطلب کی جستجو نے یہ کیا حال کر دیا
حسرت بھی اب نہیں دلِ ناکامیاب میں

۵۸ گویا کہ رو رہا ہوں رقیبوں کی جان کو
آتش زبانہ زن ہوئی طوفانِ آب میں

ناکامیوں سے کام رہا عمر بھر ہمیں
پیری میں یاس ہے جو ہوس تھی شباب میں

۵۹ ہے اختیار یار میں سود و زیاں مگر
فاضل تھے ہم جہاں سے قضا کے حساب میں

۶۰ ناصح ہے عیب جوئے و دل آزار اسقدر
گویا ثواب ہے سخنِ ناصواب میں

۶۱ دونوں کا ایک حال ہے یہ مدعا ہو کاش
وہ ہی خط اُس نے بھیج دیا کیوں جواب میں

۵۵ اے حسرت تو نے ہمیں منتخب کرنے میں غلطی کی - ہم اگر کسی قابل ہوتے تو معشوق کی نظر انتخاب میں کیوں نہ آتے - ۵۶ ہم سے محبوب کی آنکھ پھر گئی تھی - یہی کیا کم تھا - اب ہمارا دل بھی ہم سے پھر گیا - ۵۷ میرے رونے نے تم کو بدنام تو کر ہی دیا - اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا - اسلئے میری جانب نگہ بے حجاب کرنے میں کیا تامل ہے -

۵۸ میرے گریہ سے طوفان آب برپا ہوا اور طوفان میں سے آگ کے شعلے اُٹھنے لگے - گویا میں رقیبوں کی جان کو رو رہا ہوں جسکے اثر سے رونے میں طوفان کی کیفیت اور آتش رقابت کی بنا پر شعلہ ہائے آتش کی شکل پیدا ہو گئی - زبانہ زن = شعلہ زن -

۵۹ تمام نفع و نقصان یار (معشوق حقیقی) کے اختیار میں ہے - وہ جسے جو چاہے دے مگر ہم ایسے بے نصیب تھے کہ نہ ہم کو نفع ملا نہ نقصان - گویا ہم قضا کے حساب میں تمام جہان سے الگ مد فاضل تھے -

۶۰ ناصح نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ سخن ناصواب (عیب جوئی و دلآزاری) میں ثواب ہے - ۶۱ شاعر نے معشوق کو خط بھیجا جو بجنسہ اُس نے بگڑ کر واپس کر دیا - شاعر کہتا ہے کہ کاش اس واپسی کی وجہ یہ ہو کہ دونوں کا ایک حال ہے یعنی اشتیاق کے بارے میں مضمون واحد ہے - یہ طفل تسلی بھی خوب ہے -

تقدیر بھی بُری مری تدبیر بھی بُری
بگڑے وہ پرسشِ سببِ اجتناب میں

کیا[1] جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں
بے بادہ مست ہوں میں شبِ ماہتاب میں

منتوں[2] کا وقت شکایت رہی رہی
آئے تو ہیں منانے کو وہ پر عتاب میں

تیری[3] جفا نہ ہو تو ہے سب دشمنوں سے امن
بدمستِ غیر محو دل اور بخت خواب میں

بے پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

۱۴۵

یوں ہوں نالاں کہ وہ گویا صفِ محشر میں نہیں
بیدادوستم[1] کچھ دلِ مضطر میں نہیں

دل میں تو ہے وہ گلِ اندام اگر بر میں نہیں
خار[2] بستر پہ شبِ ہجر بچھاؤں کیونکر

دھیان جس وقت یہ آتا ہے کہ وہ گھر میں نہیں
سر پٹکتا ہوں کہ بس ہم بھی نہوں گھر بھی نہ ہو

ایک قطرہ بھی سبو و خم و ساغر میں نہیں
مجھ سے میکش کی طرف محتسب آتا ہے تو آئے

[1] شبِ ماہتاب کو دیکھ کر جلوۂ ماہوش یاد آیا اور میں بے پیئے مست ہوگیا۔

[2] محبوب اگرچہ میرے منانے کے لئے آیا ہے مگر چونکہ عتاب کی حالت میں آیا ہے اسلئے مجھے منت کرنی چاہئے شکایت کا موقع جاتا رہے تو جانے دو۔ دستور یہ ہے کہ جب کوئی مناتا ہے تو اُس سے شکایت کی جاتی ہے اور جب عتاب میں ہوتا ہے تو اُسکی منت کی جاتی ہے۔

[3] شاعر نے غیر[1]۔ دل[2] اور بخت[3] تینوں کو اپنا دشمن قرار دیا ہے مگر چونکہ وہ بدمست[1]۔ محو[2]۔ اور خوابیدہ[3] ہیں اسلئے اُنسے ضرر کا اندیشہ نہیں۔

۱۴۵ [1] میں محشر میں اس بے باکی سے نالے کر رہا ہوں کہ گویا معشوق یہاں موجود نہیں ورنہ دنیا میں اُسکی بیداد کے خوف سے نالہ کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ [2] میری ایذا پسندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہجر میں بستر پر خار بچھاتا۔ مگر یہ ڈر لگتا ہے کہ اُس گُل اندام کو (جو میرے دل میں ہے) اذیت پہونچیگی۔ مگر شاعرانہ ہے۔

جی اُٹھے اور وہی رنج محبت کے عذاب[۱۳] | ہم نہ مانیں گے کہ ایذا تری ٹھوکر میں نہیں
ہمنفس[۱۴] کیونکہ مسخر وہ پری رو ہو گا | نام اہلِ ہوس اور افسونگر میں نہیں
قطع[۱۵] اُمید سے سر کاٹنے کو کیا نسبت | مجھ میں وہ دَم ہے ابھی جو ترے خنجر میں نہیں
دے[۱۶] دیا کیجئے بوسہ طلبِ اوّل پر | سچ کہا تم نے مزا حرف مکرّر میں نہیں

کیا مؤثر ہو دعا وصل صنم کی مومن
ہم طلب کرتے ہیں وہ شے جو مقدر میں نہیں

ردیف الواؤ

۱۴۶ سُرمگیں[۱۷] آنکھ سے تم نامہ لگاتے کیوں ہو | خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو
گرم جولاں مرے مدفن پہ تم آتے کیوں ہو | اپنے دل سوختہ کی خاک اُڑاتے کیوں ہو

۱۳ یہ بات شاعر کے نزدیک طے شدہ ہے کہ معشوق کی ٹھوکر میں جاں بخشی کا اثر ہے۔ مگر کہتا ہے کہ تیری ٹھوکر میں ایذا ضرور ہے کیونکہ اگرچہ ہم اُسکی تاثیر سے جی اُٹھے۔ تاہم وہی اگلا سا عذاب محبت باقی ہے۔ ۱۴ اے ہمدم فسونگر کے عمل تسخیر سے اس پریرو کا مسخّر ہونا خیال خام ہے کیونکہ وہ اگر کسی کا مسخر ہے تو اہل ہوس (رقیبوں) کا اور اہل ہوس کا نام عمل فسوں میں شامل نہیں۔ الفاظ میں رعایت ہے۔

۱۵ تیرا خنجر سر کاٹتا ہے اور میں اُمید قطع کرتا ہوں۔ اسلئے مجھ میں جو دَم ہے تیرے خنجر میں نہیں۔ کیونکہ جو اہم کام (قطع اُمید) میں کر سکتا ہوں تیرے خنجر کے اختیار سے باہر ہے۔ ابھی سے یہ مراد ہے کہ ہنوز جبکہ موت کے کنارے ہوں۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ تیرا خنجر میرا سر کاٹ سکتا ہے مگر میرے رشتہ اُمید کو قطع نہیں کر سکتا۔ ۱۶ عاشق نے پہلے بوسہ طلب کیا۔ معشوق نے اعراض کیا۔ دوبارہ مانگا تو اُس نے جواب دیا کہ حرف مکرّر میں مزا نہیں۔ عاشق کہتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو پہلے بار طلب کرنے پر بوسہ دیدیا کیجئے
۱۴۶ اس طرح اُسی کی بات اُس پر لوٹ دی۔ ۱۷ سُرمہ کو خاک سے مشابہت دی ہے۔ نامۂ دشمن کی تعظیم سے باز رکھنے کی خوب ترکیب سوچی۔

شعلہ ہائے تپ دل آگ لگاتے کیوں ہو
گر ہو دلسوز[۱؎] مرے مجھکو جلاتے کیوں ہو

کون سے سوختہ اختر کا خیال آیا ہے
شرمہ[۲؎] جب دیتے ہو تم اشک بہاتے کیوں ہو

بار گردن تو نہیں تیغ ستمگار آخر
جاں نثار و سر مشتاق جھکاتے کیوں ہو

جن سے منظور وفا ہے ہو جفا بھی ان پہ
مجھ سے کچھ کام نہیں ہے تو ستاتے کیوں ہو

کھول[۳؎] دو وعدہ کہ تم پردہ نشیں ہو پہ وصال
آپ چھپتے ہو چھپو بات چھپاتے کیوں ہو

دل بیتاب کی اکسیر بناؤ گے کہیں
اس قدر شوق تہ دل سے جلاتے کیوں ہو

نہیں[۴؎] منظور اگر بوالہوسی کا شکوہ
غیر کو تم مرے اشعار سناتے کیوں ہو

توڑنا جان کا ہو جائے گا دشوار آخر
چارہ ساز و مری امید بڑھاتے کیوں ہو

اس نے کیا غیر کو وزدیدہ نظر سے جھانکا
رخنہ ہائے در یار آنکھ چراتے کیوں ہو

خیر[۵؎] ہے کس نے کہا شور قیامت تم کو
نالہ ہائے سحری دھوم مچاتے کیوں ہو

دم قدم سے ہے لگا جان نکل جائے گی
دیکھو بیٹھے سے مرے پاؤں اٹھاتے کیوں ہو

کھل گیا عشق صنم طرز سخن سے مومن
اب چھپاتے ہو عبث بات بناتے کیوں ہو

۱؎ دل سوز = ہمدرد - ۲؎ شرمہ دینا پہلے شرمہ لگانے کے معنی میں مستعمل تھا -
۳؎ وعدہ وصال کھل کر کرنا چاہئے کیونکہ تم پردہ نشین سہی تمھارا وعدہ وصال تو پردہ نشین نہیں جسکے چھپانے کی ضرورت ہو - ۴؎ تم شاید اس لئے غیر کو میرے اشعار سناتے ہو کہ اسکی بوالہوسی کا شکوہ منظور ہے - یعنی تم اس کو یہ جتانا چاہتے ہو کہ مومن اسقدر باوفا ہے اور تو (غیر) ایسا ہوتا
۵؎ مطلب یہ ہے کہ تم شور قیامت سے بھی بڑھکر ہو -

۱۴۷

(۱) اگر زنجیر کش سوئے بیاباں اپنی وحشت ہو
تو پائے قیس کا ہر ایک چھالا چشمِ حیرت ہو

(۲) ہمارے قتل سے قاتل نہ کیوں غیروں کو عبرت ہو
بہم جوہر سے جوہر تیغ کا جیسے دستِ حسرت ہو

کسی کے ابروئے خوش خم کا کشتہ ہوں تعجب کیا
جو میری خاک سے تعمیرِ محرابِ عبادت ہو

(۳) دمِ بسمل خیالِ شکوۂ قاتل گر آجاوے
لبِ زخمِ جگر میں دشنہ انگشتِ ندامت ہو

سمجھتا خوب ہوں میں اس بناوٹ کی لگاوٹ کو
قسم کھا جاؤں گا گر تیرے دل میں کچھ محبت ہو

ہوئے بیخواب آہِ نیم شب سے تو لگے کہنے
کہ سوتوں کو جگا دیتے ہو تم بھی کیا قیامت ہو

(۵) جلا جاتا ہوں سوزِ رشک سے مانندِ پروانہ
جلا مت اور کو تو گرچہ میری شمعِ تربت ہو

عدو سے بزم میں تم نے کی ہی چشمک زنی کیا کیا
نہ دیکھا حال میرا تم بھی کتنے بے مروت ہو

بجائے سبزہ نکلے خاک سے میری زبانِ ظالم
دلِ نالاں میں ہر دن جو سر گرمِ شکایت ہو

بھلا ایسے صنم کو خاک دل دے کوئی اے مومن
نہ جس کو کچھ مروت ہو نہ خاطر ہو نہ الفت ہو

۱۴۷ (۱) اگر میرا جنون سیرِ بیابان کی سلسلہ جنبانی کرے تو میرے جوشِ وحشت کو دیکھ کر پائے قیس کا ہر ایک چھالا چشمِ حیرت بن جائے۔ (۲) جوہر = وہ خطوط جو اصل تلوار یا آئینہ میں ہوتے ہیں۔ تیغِ قاتل پر جوہر کا بہم ہونا دستِ حسرت ملنے سے مشابہ ہے۔ یعنی جوہر بھی ہمارے قتل پر کفِ افسوس ملتے ہیں۔ (۳) دمِ ذبح اگر مجھے قاتل کی شکایت کا خیال بھی آئے تو میری شرمندگی کا یہ حال ہو کہ لبِ زخمِ جگر میں خنجر کے ہونے سے انگشتِ ندامت کی صورت پیدا ہو جائے۔ قاعدہ ہے کہ ندامت کے وقت لب میں انگلی دیتے ہیں۔ زخمِ جگر کو لب سے اور دشنہ کو انگشتِ ندامت سے تشبیہ دی ہے۔ (۵) میں پروانہ کی طرح رشک کی آگ سے جلا جاتا ہوں اور جلن اس بات کی ہے کہ تم دوسروں کو کیوں جلاتے ہو۔ یعنی مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ تم کسی کو جلاؤ (کہ یہ بھی گونہ ارتباط کی شکل ہے) خواہ وہ میری شمعِ تربت ہی کیوں نہ ہو۔

۱۴۸

کیسے مجھ سے بگڑے تم اللہ اکبر رات کو — ذبح ہی کرتے جو ہوتا پاس خنجر رات کو
اپنی آوازِ قدم سے بھی وہ ڈر کر رات کو — مُڑ کے پیچھے دیکھ لے تھا ہر قدم پر رات کو
ہم میں کیا باقی رہا تھا اے ستمگر رات کو — جاں بلب تھے بچ گئے قسمت سے مر کر رات کو
یاں جو تو اے مہروش تھا جلوہ گستر رات کو — چُھٹ رہی تھی کیا ہوائی مہ کے مُنہ پر رات کو
صرصرِ آہ و فغانِ شعلہ زن طوفانِ اشک — جمع سامانِ خرابی تھا مرے گھر رات کو
بوئے گُل کا اے نسیمِ صبح اب کس کو دماغ — ساتھ سویا ہے ہمارے وہ دشمن بر رات کو
[1] صبحدم مہتاب کا سا رنگ کیوں ہے گر نہ تھا — بوالہوس کے پاس تو اے نازپرور رات کو
[2] بزمِ دشمن میں نہ ہو وہ نغمہ گر آتی رہی — ہر فغاں کے ساتھ لب پر جانِ مضطر رات کو
[3] روزِ ہجراں سے شبِ فرقت نہ ہو کیوں سخت تر — گاہے گاہے دن کو ملتے تھے وہ اکثر رات کو
رشک سے جلتا ہوں روز اے شمعِ بزمِ عام سن — دن کو ہے مجھ پر وہی صدمہ جو تجھ پر رات کو
دیکھئے وہ کونسی شب ہوئیگی اللہ رے جھوٹ — روز کہتے ہو کہ آؤں گا مقرر رات کو
رہ گئے ہم جھانکنے سے بھی یہ کیا اندھیر ہے — بند کس نے کر دیئے تھے روزنِ در رات کو
بن ترے پیشِ نظر تھی یہ اندھیری چھا گئی — جائیں آنکھیں پھوٹ گر دیکھے ہوں اختر رات کو
کود کر گھر میں تو پہونچائیں ترے پر کیا کروں — دم نکل جاتا تھا کھٹکے کے برابر رات کو
[4] یاد دلوائی تپش نے تیری شوخی وصل کی — مر گئے ہم دیکھکر چیں ہائے بستر رات کو

۱۴۸ [1] تیرا رنگ اس طرح فق ہو گیا ہے جس طرح صبح کو چاند کی حالت ہوتی ہے۔ [2] آتی رہی کا تعلق مصرع ثانی سے ہے۔ [3] دوست سے ملاقات دن کو کمتر اور رات کو بیشتر ہوتی تھی اسلئے ہجر میں گذشتہ ایام عیش یاد آکر دن سے زیادہ رات میں مجھپر اذیت گذرتی ہے۔

[4] ہم ہجر میں اس قدر تڑپے کہ تمام بستر شکن آلودہ ہو گیا۔ بستر کی شکن دیکھکر ہمیں تیری وصال کی شوخیاں یاد آئیں اور جان نکل گئی۔

کیا کہوں تم جو نہ آئے کیا قیامت آگئی | میہماں تھا میرے گھر میں روزِ محشر رات کو

کیا اُسی بتخانہ کو فرماتے ہو ظلمت کدہ[5]
حضرتِ مومن جہاں جاتے ہو چھپکر رات کو

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو[1]	۱۴۹	ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو
اُس بُت کے لئے مَیں ہوسِ حُور سے گذرا[2]		اس عشقِ خوش انجام کا آغاز تو دیکھو
چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرتِ ناصح[3]		طرزِ نگہِ چشمِ فسوں ساز تو دیکھو
اربابِ ہوس ہار کے بھی جان پہ کھیلے[4]		کم طالعیِ عاشقِ جانباز تو دیکھو
مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اُٹھے وہ[5]		بدنامیِ عُشاق کا اعزاز تو دیکھو

[5] مومن بتخانے کو کفر کی مناسبت سے ظلمت کدہ کہتا ہے مگر خود رات کو چھپکر وہیں پہونچتا ہے شعر میں طنز کا پہلو ہے۔

۱۴۹ [1] معشوق کی آنکھوں کا اندازِ حیا در اصل رقیبوں پر ستم ہے۔ کیونکہ وہ بے تکلّفی کے خواہاں ہیں اور حیا بے تکلفی کی منافی ہے۔ دوست کا ناز معشوقانہ یہ ہے کہ وہ ایسے نا اہلوں پر جفا کرتا ہے جو جفاکشی کے درخور نہیں۔ [2] مَیں نے اُس بُت کی خاطر حوروں کی تمنّا چھوڑدی۔ عشق خوش انجام کا آغاز تو یہ تھا۔ اب دیکھیے انجام کیا ہو۔ خوش انجام کا لفظ طنزاً استعمال کیا ہے۔ اگر خوش انجام کو حقیقی معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ابھی تو (کہ ابتدائے عشق ہے) بت کے سودے میں خیال حور سے کنارہ کش ہوا ہوں۔ آخر میں جب وصالِ بُت میسّر ہوگا تو اُسکے سامنے کائنات کی تمام لذتیں ہیچ ہو جائیں گی۔

[3] میری وحشت پر کیوں اعتراض کرتے ہو۔ محبوب کی سحر آفریں نگاہوں کو دیکھو تو معلوم ہو کہ میری وحشت حق بجانب ہے۔ [4] رقیب امتحان گاہِ محبت میں ناکام رہے مگر جی چھوڑ کر بھاگنے کے بجائے اپنی جان پر کھیل گئے (یعنی مر گئے) یہ بھی عاشقِ جاں باز کی بد قسمتی کہ اس طرح بوالہوسوں کو اُس سے گونہ ہمطرحی کا دعویٰ ہو گیا۔

[5] مجلس میں عاشقِ بدنام کا کسی نے ذکر کیا تھا کہ معشوق نفرت کی وجہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ عاشق اپنے دل کو تسلّی دیتا ہے کہ اُسکا کھڑا ہونا نفرت کی بنا پر نہیں بلکہ عاشقوں کی بدنامی کی تعظیم منظور رہی ہے۔

محفل[1] میں تم اغیار کو وزدیدہ نظر سے — منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو
اس[2] غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک — شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو
دیں[3] پاکیِ دامن کی گواہی مرے آنسو — اس یوسفِ بیدرد کا اعجاز تو دیکھو

جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے
جورِ اجل تفرقہ پرداز تو دیکھو

۱۵۰
یہ قدرت ضعف میں بھی ہے فغاں کو — کہ دے پٹکے زمیں پر آسماں کو
وفا سکھلا رہے گا دل ہمارا — تمہاری خاطرِ نامہرباں کو
پڑی ہے اس گلی میں لاش دشمن — اٹھاؤں کیونکر اس بارِ گراں کو
کہاں[1] ہے تابِ نازِ برق لے کاش — جلا دے آتشِ گل آشیاں کو
پسینے کی جگہ آنے لگا خوں — چھپاؤں کس طرح زخمِ نہاں کو
سمجھتا[2] کیونکہ دیوانے کی باتیں — نہ پایا محرم اپنے رازداں کو

[1] تاڑنے والے تمہاری وزدیدہ نظری سے تاڑ جائیں گے کہ ان کو اغیار سے ربط نہانی ہے۔
[2] ناہید = زہرہ جسکو مطربہ فلک بھی کہتے ہیں۔ دیپک ایک قسم کا راگ ہے جسکے اثر سے آگ لگ جاتی ہے۔
[3] حضرت یوسفؑ کا یہ اعجاز تھا کہ ایک شیرخوار لڑکے نے اُنکی پاکدامنی کی شہادت دی تھی۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے یوسف بیدرد (معشوق) کا معجزہ دیکھو کہ میرے طفلِ اشک اُسکی پاکیِ دامن کی گواہی دیتے ہیں۔ یعنی میرا رونا اس امر کا ثبوت ہے کہ نہیں محرومِ وصالِ یار رہا ہوں۔ آنسو کو طفل قرار دینا شعرا کے یہاں عامۃ الورود ہے۔

۱۵۰ [1] آتشِ گل = پھولوں کی سُرخی جو آگ سے مشابہ ہے۔ کاش آتشِ گل ہی میرے آشیانے کو جلا کر خاک کر دے اسکے لئے برق کا احسان کون اُٹھائے۔ یعنی حسنِ گل ہی میری خانہ بربادی کے لئے کافی ہے۔ [2] میرا رازداں دراصل میرے رازِ محبت کی حقیقت سے ناواقف ہے۔ اسلئے کہ میں جنونِ عشق میں اپنا بھید کہہ بھی گذرتا ہوں تو وہ سمجھتا نہیں۔ ظاہر ہے کہ دیوانے کی بات کون سمجھے۔

عدو کے گھر میں ہے تصویر شیریں
نہیں[۱] آتا وہ لیلیٰ وش سکھا دے
ہمارا[۲] غش تو کیا مرجائیں تو بھی
دیا اُس بد گماں کو طعنۂ غیر
دلِ مضطر کی بیتابی نے مارا

دکھاؤں کس طرح اُس بدگماں کو
کوئی مجنوں کا قصہ ساربان کو
نہ کھولے طرّۂ عنبر فشاں کو
غضب ہے کیا کہوں اپنی زباں کو
کہاں سے لاؤں اُس آرام جاں کو

سُن اے مومن یہ ایماں ہے ہمارا
نہ کہنا کفر پھر عشقِ بُتاں کو

۱۵۱

ایسے[۳] سے کیا درستیِ پیمان بستہ ہو
دم[۴] ہی اُلٹ گیا جو سُنا ہے ترا مریض
پروانہ وار گرم تپش ہیں قلق سے ہم
ممنون[۶] جوشِ گریۂ شادی ہوں چشمِ تر

جو قول دے تو رنگ حنا کا شکستہ ہو
کیا حضرتِ مسیح سے درماں خستہ ہو
تم شوخیوں سے شعلۂ[۵] بیتاب جستہ ہو
صبحِ شبِ وصال کا گر بند رستہ ہو

۱؎ لیلیٰ عاشق نواز تھی اور مجنوں کے دیکھنے کے لئے صحرا کو گئی تھی۔ مومن کہتا ہے کہ وہ لیلیٰ وش (محبوب) میرے پاس نہیں آتا۔ کاش کوئی اُسکے ساربان کو قصۂ مجنوں سکھا دے۔ تاکہ وہ برسبیل تذکرہ اسکو سنائے اور میری ملاقات کا محرک ہو
۲؎ وہ میرے غش ہونے پر طرّۂ زلف کیوں سُنگھانے لگے۔ اُن سے تو یہ اُمید بھی نہیں کہ مرنے پر میرے ماتم میں بال کھولیں۔
۱۵۱ ۳؎ وہ اس قدر بے وفا ہے کہ جب قول دینے کے لئے ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے تو اُسکے دست نگارین کی حنا کا رنگ شکستہ ہو جاتا ہے (یعنی اُڑ جاتا ہے) پھر ایسے سے کیا توقع ہو کہ عہد باندھکر شکست عہد کا مرتکب نہ ہوگا۔ ۴؎ حضرت مسیح نے جب یہ سُنا کہ عاشق تیرا مریض ہے تو (معاذ اللہ) دفعتہً اُن کے اوسان خطا ہو گئے۔ کیونکہ ایسا مریض ناقابل علاج ہے۔
۵؎ شعلہ بے تاب جستہ = شعلہ جو بیقرار ہو کر بھڑک اُٹھے۔
۶؎ عاشق شب وصال خوشی کا رونا روتا ہے اور اپنے چشم تر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اگر تیری بدولت صبح شب وصال کے آنے کی راہ بند ہو جاسے تو میں تیرا شکر گذار رہوں گا۔

کب[شہ] جان دے ہے بسملِ ابرو نہ جب تلک — خنجر کا تیرے شاخِ غزالاں کا دستہ ہو
شاید کبھی وہ میکشِ بدمست مُنہ لگائے — خاک اپنی کاش دُردِ[ھڈ] تہِ خُم نشستہ ہو

مومن نہ توڑ رشتۂ زنّار برہمن
مت کرو وہ بات جس سے کوئی دل شکستہ ہو

۱۵۲
وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو — وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لُطف مجھ پہ تھے پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر — مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں — وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو تو اشارتوں ہی سے گفتگو — وہ بیانِ شوق کا برملا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم — گلۂ ملامتِ اقربا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمھارے جی کو بری لگی — تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی — کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
سُنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اِک آپ نے وعدہ تھا — سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی مرے دل سے صاف اُتر گئی — تو کہا کہ جانے مری بلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا — وہ نہیں نہیں کی ہر آں ادا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے با وفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

شہ جب تک تیرے خنجر کا دستہ شاخ غزالاں (ہرن کے سینگ) کا نہ ہوگا تیرے ابرو کا بسمل (عاشق) جان نہ دے گا۔ شاخ غزالاں کی خصوصیت اس لئے ہے کہ وہ پورے طور پر ابروئے یار سے مشابہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ میرے قتل کے لئے خنجر کافی نہیں۔ بلکہ مناسبت ابروئے جاناں چاہئے۔

ھڈ دُرد تہ خُم نشستہ = شراب کی تلچھٹ جو خُم کے نیچے بیٹھ جائے۔

۱۵۳

آئے ہو جب بڑھا کر دل کی جلن گئے ہو — جوں سوز دل کہا ہے تم آگ بن گئے ہو
روٹھے سو روٹھے ہم سے ملتے نہیں ہو کیونکر — غیروں سے جب لڑے ہو لڑتے ہی من گئے ہو
باقی[1] نہیں کدورت شوقِ ستم کی ہرگز — کیا اے دل و جگر تم تیروں سے چھن گئے ہو
جاؤ تو جاؤ سوئے دشمن سوئے فلک کیوں — اے گرم نالہا اے آتش فگن گئے ہو
بادِ بہار میں ہے کچھ اور عطر ریزی — تم آج کل میں شاید سوئے چمن گئے ہو
کیا حال ہے عدم کا کہلا تو بھیجو جو تم — اے خوگرانِ غربت[2] سوئے وطن گئے ہو

ہے کچھ تو بات مومن جو چھا گئی خموشی
کس بت کو دیدیا دل کیوں بت سے بن گئے ہو

۱۵۴

پونچھنے[1] سے ہر مو دریا ہے کیونکر خشک ہو — سب کے دامن تر ہوں پر کب دیدۂ تر خشک ہو
آہ کی گرمی سے دنیا میں ہو جو تر خشک ہو — نوح کا طوفاں بھی ہو تو خشک ہو پر خشک ہو
اُف رے سوزِ نالہ واللہ رے سیلابِ سرشک — اس سے تر روئے زمیں اُس سے سمندر خشک ہو
سوزِ دل آبِ[2] جگر لینے دے دم تو کب تلک — تر رہیں آنکھیں ہمیشہ اور لب اکثر خشک ہو
موج زن ہے ایک دریا ہائے جوشِ اشک ہائے — آستیں ہو جائے تر دامانِ تر گر خشک ہو

---

[1] جب کسی چیز میں روزن ہو جاتے ہیں تو اُسکے اندر کوئی چیز نہیں ٹھیرتی - عاشق کہتا ہے کہ میرے دل اور جگر میں شوق ستم کشی کے پورانہ ہونے کی وجہ سے گرد ملال تھی - مگر جب سے دل و جگر قاتل کے تیروں سے چھن گئے وہ گرد ملال (کدورت) نکل گئی -

[2] غربت سے دنیا اور وطن سے ملک عدم مراد ہے -

[1] میرے دیدہ تر کے پونچھنے والوں کے دامن تر ہو جائینگے مگر یہ دریا، دیدۂ تر خشک نہ ہوگا -

[2] آب جگر سے یہ مراد ہے کہ جگر پانی ہو کر آنکھوں کی راہ بہا جاتا ہے -

شمع[53] ساں میں سوز گریہ سے سراپا جل گیا
ابر بھی کھل جاے ہے دریا بھی گہہ تھم جاے ہے

روز محشر آپ کے اس تشنۂ دیدار کا
گریۂ[54] خونیں کو قصدِ عالمِ بالا ہے پھر

تشنہ کامِ عشق ہوں گر خاک سے میری بنے
رونے کی جا ہے اگر ہو بعد ملنے کے فراق

ہے تعجب گر شجر پانی کے اندر خشک ہو
دیدۂ پرنم کبھی تو بھی تو دم بھر خشک ہو

حلق تشنہ تر نہ ہو اور حوضِ کوثر خشک نا ہو
کیوں نہ خوں روحانیوں کا آسماں پر خشک ہو

آب جوں جوں بھر ئے ووں ووں اور ساغر خشک ہو
ہے غضب گر نخل کوئی پھول پھل کر خشک ہو

نیس

شعر تر وہ ہیں مرے مومن کہ ہنگامِ جواب
خوف سے مُنہ اور زبانِ ہر سخنور خشک ہو

اے ناصحو آہی گیا وہ فتنۂ ایام لو
مجنون[1] محوِ یار ہوں سودے کا میرے کیا علاج
کیا قہر ہے کب تک کوئی رہ جائے آنسو پی کے یوں

۱۵۵ ہم کو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام لو
گر چارہ ساز و ہو سکے تو فصد لیلیٰ فام لو
ہنس ہنس کے میرے آگے تم دستِ عدو سے جام لو

۵۳ درخت اگر پانی میں کھڑا ہو تو خشک نہیں ہوتا۔ مگر میرا معاملہ بر عکس ہے۔ کیونکہ میں اشکوں کی گرمی کی وجہ سے شمع کی طرح سرتاپا جل گیا۔

۵۴ یعنی یہ سیلاب (گریہ خوں) فرشتوں کو غرق کر کے چھوڑے گا۔ روحانی یعنی فرشتہ۔

۱۵۵ ۱ سودا کی حالت میں مریض کی فصد لیجاتی ہے تاکہ خون فاسد کے اخراج سے مزاج کی اصلاح ہو شاعر چارہ سازوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ یوں تو میرے سودے کا علاج ناممکن ہے۔ ہاں اگر ہو سکے تو اُس لیلیٰ فام (محبوب) کی فصد کھولو اور چونکہ اُسکے عشق میں میری محویت حد کو پہونچ گئی ہے اسلئے اُدھر اُسکی فصد کھلے گی اِدھر میرے جسم سے خون نکلے گا اور آخر جوشِ جنون کو افاقہ ہو گا۔ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ لیلیٰ نے فصد کھلوائی اور مجنوں کی رگ سے خون جاری ہو گیا۔

بندے ہیں ہم صیاد کے کہتا ہے کس لطف سے[۱] — گر ہو سکے راہِ چمن اے رستگانِ دام لو
ایسی[۲] ادا سے بوسہ دو لب کا کہ شادی مرگ ہوں — جور و ستم کا میری جاں لطف و کرم سے کام لو
بختِ سیاہ اے منعمو آخر ملائے خاک میں — یک چند ملکِ ہند لو یا سرزمینِ شام لو
دن رات فکرِ جور میں یوں رنج اٹھاتا کب تلک — میں بھی ذرا آرام لوں تم بھی ذرا آرام لو
پھر[۳] سوئے مقتل آئے وہ ہاتھ آئے تو بہرِ نثار — اے کشتگانِ شوق جاں زندوں سے سودِ وام لو

مومن تم اور عشقِ بتاں اے پیر و مرشد خیر ہے
یہ ذکر اور منہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

۱۵۶

یہ مایوسی دل و جاں نالۂ شبگیر تو کھینچو — کھنچے گا اُس کا دل آہِ فسوں تاثیر تو کھینچو
شفیعِ[۱] بیگناہاں ہے نزاکت اس کلائی کی — بھلا خوں تو کروگے پہلے تم شمشیر تو کھینچو
سبکروحِ[۲] تجرد بھی کہیں پابند ہوتا ہے — شمیمِ گُل کی نقاشو بھلا تصویر تو کھینچو

۲؎ ہم تو صیاد کی محبت میں گرفتار ہیں اور وہ ہم کو دام سے رہا کر کے کس ادا سے کہتا ہے کہ اب ہو سکے تو چمن کی راہ لو۔ ۳؎ اگر تم مجھے قتل کرنا چاہتے تو اُسکی آسان تدبیر یہ ہے کہ مجھے اس ادا سے بوسۂ لب دے دو۔ کہ شادی مرگ ہو جاؤں اور کرم سے وہی مقصد حاصل ہو جائے جو ستم سے ہوتا۔

۴؎ قاتل دوبارہ مقتل میں آیا ہے۔ اے کشتگانِ شوق تم تو اپنا نقد جان نذر کر چکے۔ اب اگر ممکن ہو سکے تو اُس پر نچھاور کرنے کے لئے زندوں سے جان کا سودا بطور قرض کر لو۔ یعنی زندوں سے جان قرض لیکر قاتل پر نثار کر دو۔ وامِ بمعنی قرض۔

۱۵۶ ۱؎ تمھاری کلائی کی نزاکت ہم بے گناہوں کی سفارش خواہ ہے۔ یعنی نزاکت قتل سے مانع ہے۔ خون کرنا تو درکنار تم سے شمشیر کھینچنا ہی مشکل ہے۔

۲؎ تجرد = تعلقاتِ دُنیا سے علیحدگی۔ سبکروحِ تجرد = وہ شخص جسکی روح علائق کے بوجھ سے گرانبار نہ ہو۔ سبکروحِ تجرد پابند علائق نہیں ہو سکتا جس طرح بوئے گُل کی (کہ بیحد سُبک ہوتی ہے) تصویر نہیں کھینچی جا سکتی۔ پہلا مصرع دعویٰ ہے اور دوسرا دلیل۔ شعر مثالیہ ہے۔

وہ آئے یا نہ آئے زیست میری ہو نہ ہو لیکن — ذرا اے چارہ ساز و زحمتِ تدبیر تو کھینچو
اثر[۱] ہوتا ہے کب ہم سے وفاداروں کو ناصح — فغاں سے پیشتر تم خجلتِ تقریر تو کھینچو
سرِ[۲] زور آزمائی جذبِ دل کو آج ہی دیکھو — کھنچے گا ہاتھ سینے سے تم اپنا تیر تو کھینچو
عبث[۳] نالش ہے آہ تیرہ روز چشمِ جادو کی — وہاں بندِ ہوس سرمہ کی اک تحریر تو کھینچو
دکھا دونگا تماشا بس نہ چھیڑو مجھ سے مجنوں کو — ہلا دوں گا زمین و آسماں زنجیر تو کھینچو

لو

کہاں اُس نوجوان کے ناز کی طاقت تجھے مومن
ابھی سرِ مشق[۴] تو ہو جورِ چرخِ پیر تو کھینچو

۱۵۷

اعجازِ جاں دہی ہے ہمارے کلام کو — زندہ کیا ہے ہم نے مسیحا کے نام کو
لکھو سلام غیر کے خط میں غلام کو — بندے کا بس سلام ہے ایسے سلام کو
اب[۱] شور ہے مثال جو دی اس خرام کو — یوں کون جانتا تھا قیامت کے نام کو

۱؎ ناصح تو فغاں کرنے سے روکتا ہے مگر ہم پر اثر نہیں ہوتا۔ ہم تو فغاں ضرور کھینچیں گے مگر تو پہلے اس تقریرِ بے حاصل پر شرمندگی تو کھینچ۔ شاعر نے فغاں کشیدن اور خجلت کشیدن کا ترجمہ کر دیا ہے۔ ۲؎ اگر تم میرے جذبِ دل کو برسرِ زور آزمائی دیکھنا چاہتے ہو تو آج ہی امتحان کر لو۔ اُسکی صورت یہ ہے کہ اپنے تیر کو جو میرے دل میں پیوست ہے سینے سے کھینچو۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جذبِ دل کے اثر سے خود تمہارا ہاتھ میری طرف کھنچ آئے گا۔

۳؎ نالش = شکایت۔ تیرہ روزِ چشمِ جادو = معشوق کی سحر بھری نگاہوں کا عاشق بدنصیب وہاں بندِ ہوس = بوالہوسوں کا مُنہ بند کرنے والا۔ وہاں بند اُس تعویذ کو بھی کہتے ہیں جس سے کسی کا مُنہ کیل دیا جائے رقیب اگر مجھ بدنصیب کی آہ کی تم سے شکایت فضول کرتے ہیں۔ تم ذرا اپنی آنکھوں میں سرمہ کی تحریر کھینچو۔ پھر دیکھنا کہ ان اہلِ ہوس کا مُنہ کیونکر بند ہوگا۔ یعنی رقیب بھی خود آہ کرنے پر مجبور ہوں گے اور میری آہ کی شکایت کرنا چھوڑ دیں گے۔
۴؎ سرِ مشق = قطعہ جس پر خوشنویسی کی مشق کی جائے۔ یعنی پہلے سرِ مشق تو بن لو کیونکہ اُس نوجوان کا ناز چرخِ پیر کے جور سے زیادہ جانستاں ہے۔
۱؎ جب سے ہم نے خرامِ یار کو قیامت سے مثال دی ہے دُنیا میں قیامت کا نام مشہور ہوگیا ہے پہلے کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ ۱۵۷

آتا ہے بہر قتل وہ دور اے ہجوم یاس ۔ گھبرا نہ جائے دیکھ کہیں ازدحام کو
گو آپ نے جواب بُرا ہی دیا و لے ۔ مجھ سے بیاں نہ کیجے عدو کے پیام کو
یا[۱] وصل ہے تلافیِ ہجراں میں اے فلک ۔ کیوں سوچتا ہے تازہ ستم انتقام کو
تیر[۲] ے سمند ناز کی بیجا شرارتیں ۔ کرتی ہیں آگ نالۂ اندیشہ گام کو
گریہ پہ میرے زندہ دلو ہنستے کیا ہو آہ ۔ روتا ہوں اپنے میں دلِ جنت مقام کو
سُن سُن کے نادرست تری خو بگاڑ دی ۔ سہ شہ ۔ ہم نے خراب آپ کیا اپنے کام کو
اُس[۳] سے جلا کے غیر کو اُمید پختگی ۔ لگ جائے آگ دل کے خیالاتِ خام کو
بخت[۴] سعید آئینہ داری کرے تو میں ۔ سپید ۔ دکھلاؤں دل کے جور اُس آئینہ فام کو
جب[۵] تو چلے جنازۂ عاشق کے ساتھ ساتھ ۔ پھر کون وارثوں کے سُنے اذنِ عام کو
شاید کہ دن پھرے ہیں کسی تیرہ روز کے ۔ اب غیر اُس گلی میں نہیں پھرتے شام کو

مدت سے نام سُنتے تھے مومن کا بارے آج
دیکھا کبھی ہم نے اُس شُعَرا کے امام کو

[۱] اے فلک ہمیں وصل یار میسر ہوا اور تو ہم سے اس کا انتقام لینے کے واسطے تازہ ستم سوچنے لگا اتنا تو غور کر کہ یہ وصل تو خود سابقہ مصائب ہجر کا معاوضہ ہے۔ لہٰذا حساب برابر ہو گیا۔ اگر کوئی نئی راحت (بے معاوضہ) ملتی تو تجھے ہم سے انتقام لینے کا موقع تھا۔ [۲] نالۂ اندیشہ گام = نالہ جسکے قدم کی رسائی خیال کی طرح دور تک ہو۔ یعنی تیرے ناز کی شوخیٔ ناروا میرے نالۂ دُور رس کو اور زیادہ مشتعل کر دیتی ہے (نالہ کو زیادہ تحریک ہوتی ہے)۔ [۳] میرے دل کے خیالات خام کو آگ لگے کہ غیر کو جلا کر محبوب سے استواری محبت کی توقع رکھتا ہوں۔ یعنی یہ اُمید رکھتا ہوں کہ میں رقیب کو جلاؤں اور پھر بھی معشوق مجھ سے رشتۂ الفت قائم رکھے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ وہ رقیب کو جلائے اور مجھ سے تعلقات محبت استوار کرے۔ جلانا۔ آگ۔ پختگی اور خام میں جو خوبی ہے ظاہر ہے۔ [۴] میرا بخت سعید اگر معشوق کے حضور میں آئینہ داری کی خدمت انجام دے تو میں اُس آئینہ فام کو اُسکے ظلم (جو میرے دل پر ہوتے ہیں) دکھاؤں یعنی اگر نصیب یاور ہو تو دوست سے حال دل کہنے کا موقع ملے۔ آئینہ دار = وہ شخص جو کسی کو آئینہ دکھائے۔ آئینہ فام = آئینہ رُو۔ رعایت الفاظ کا ماحصل یہ ہے کہ میرے حال دل کا عکس بخت سعید ہی کی مدد سے اُس آئینہ رو کے دل پر منعکس ہو سکتا ہے۔ [۵] قاعدہ ہے کہ نماز جنازہ کے بعد میت کے وارث اذن عام دیتے ہیں کہ جو لوگ کسی ضرورت سے واپس جانا چاہیں چلے جائیں یعنی جب تو میرے جنازے کے ساتھ ہو تو تیرے اشتیاق معیت میں ہزاروں مدفن تک جانے کو تیار ہونگے۔

۱۵۸

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو — عذر کچھ چاہیئے ستانے کو

سنگ[1] در سے ترے نکالی آگ — ہم نے دشمن کا گھر جلانے کو

صبح عشرت ہے وہ نہ شام وصال — ہائے کیا ہوگیا زمانے کو

بوالہوس روئے میرے گریہ پہ اب[2] — منہ کہاں تیرے مسکرانے کو

برق کا آسمان پر ہے دماغ — پھونک کر میرے آشیانے کو

سنگ[3] سودا جنوں میں لیتے ہیں — اپنا ہم مقبرہ بنانے کو

شکوہ[4] ہے غیر کی کدورت کا — سو مرے خاک میں ملانے کو

روز محشر بھی ہوش گر آیا — جائیں گے ہم شراب خانے کو

سن کے وصف اس پہ مرگیا ہمدم — خوب آیا تھا غم اٹھانے (بٹانے) کو

کوئی دن ہم جہاں میں بیٹھے ہیں — آسماں کے ستم اٹھانے کو

ق

چل[5] کے کعبے میں سجدہ کر مومن — چھوڑ اس بت کے آستانے کو

نقش پائے رقیب کی محراب — نہیں زیبندہ سر جھکانے کو

۱۵۸ [1] ہم نے تیرے سنگ در پر اس قدر ناصیہ فرسائی کی کہ اس سے آگ نکلنے لگی جس سے دشمن کا گھر جل گیا۔ [2] پہلے تم گریہ پر مسکراتے تھے۔ اب میری تباہ حالی اس درجہ کو پہونچ گئی کہ بوالہوس سا سنگدل بھی میرے گریہ پر رونے لگا۔ لہذا تمھارے مسکرانے کا موقع نہ رہا۔ [3] سنگ سودا ایک قسم کا سیاہ پتھر جو ہلکا اور اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے۔ ہم سنگ سودا مقبرے کے لئے اس واسطے لیتے ہیں کہ مر کر بھی یادگار جنون قائم رہے۔ لفظ سودا اور جنون میں ایہام تناسب۔ [4] یعنی مجھے تمھارا غیر سے اسقدر علاقہ بھی گوارا نہیں کہ تم مجھ سے اسکی کدورت کی شکایت کرو۔ [5] یہ اور شعر مابعد قطعہ بند ہیں۔ شعر دوم کے معنی یہ ہیں کہ اس بت کے در پر رقیب کا نقش پا ہے جو محراب سے مشابہ ہے اور مومن کو زیبا نہیں کہ ایسی جگہ سجدہ کرے۔

۱۵۹

صد حیف سینہ سوز فغاں کارگر نہ ہو
یاں جان پر بنے ترے دل میں اثر نہ ہو

دیکھیں[۱] غمِ درونہ پہ کب تک نظر نہ ہو
میرا شگافِ سینہ ترا چاکِ در نہ ہو

اے[۲] آہ آسماں میں عبث رخنہ گر نہ ہو
ڈرتا ہوں میں نزولِ بلا بیشتر نہ ہو

فریاد[۳] بے گناہ کشی جابجا کروں
گر وہم جاں نثاریِ پیغامبر نہ ہو

معشوق و مے سے زاہدِ مفلس کو یاس ہے
قطعِ تعلقات کس امید پر نہ ہو

ایسے سے قدرِ مہر و وفا کی امید کیا
جس کو ہنوز اپنے ستم کی خبر نہ ہو

ہوں[۴] خانماں خراب ستم سے زیادہ تر
ایسا نہ ہو کہ اب بھی ترے دل میں گھر نہ ہو

عابد فریبِ شوخی و رغبت فزا نگاہ
میں کیا کسی سے صبر تجھے دیکھ کر نہ ہو

اے[۵] گردشِ زمانہ کبھی تو تغیر آئے
حسرت مجھے قبول اگر اس قدر نہ ہو

سودا ہے مجھ کو گرمیِ بازارِ عشق کا
اس کا کہاں خیال کہ اپنا ضرر نہ ہو

پائے[۶] طلب شکستہ نہ کوتاہ دستِ شوق
ہم بھی ستم کریں جو وہ نازک کمر نہ ہو

حزن[۷] و ملال میں ہے دل آزردگی کا وہم
کیسی بری بنے جو گلہ بے اثر نہ ہو

---

[۱] دیکھوں تو میرے غمِ درونہ (غمِ پنہاں) پر کب تک تو نہ کرے گا اور جس طرح تو اپنے چاکِ در کو (تاک جھانک کیلئے) ہردم پیشِ نظر رکھتا ہے میرے شگافِ سینہ کو (جس سے غمِ پنہاں کی حالت بخوبی معلوم ہو سکتی ہے) کب تک پیشِ نظر نہ رکھے گا۔ [۲] آسمان سے یوں بھی بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ اگر آہ نے شگاف کر دیا تو اور زیادہ بلائیں آئیں گی۔ [۳] عاشق کو وہم ہے کہ میرا قاصد (جسکے مرنے کی خبر آئی ہے) کہیں معشوق کے حُسن پر شیفتہ ہو کر جان نہ دے بیٹھا ہو۔ اگر یہ بدگمانی نہ ہوتی تو وہ (عاشق) معشوق کی عادتِ بے گناہ کشی کا لوگوں میں ضرور چرچا کرتا۔ [۴] میں تیرے ظلم کی وجہ سے پہلے سے بھی زیادہ خانہ خراب ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اب بھی تیرے دل میں میرا گھر نہ ہو۔ یعنی میرا گھر تو برباد ہو چکا۔ اس حالت پر بھی تیرے دل میں گھر نہ ہوگا تو کہاں ٹھکانا ملے گا۔ [۵] میرا یہ مطالبہ نہیں کہ حسرت بالکل نہ رہے۔ صرف یہ خواہش ہے کہ کبھی کبھی اُس میں تغیر ہوتا رہے اور جتنی اب ہے اُس سے کم ہوتی رہے۔ یعنی میری حسرت انتہائی نقطہ پر پہونچ چکی ہے۔ اب تغیر ہوگا تو کمی کی جانب ہی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ انسان بالطبع تغیر پسند ہے۔ [۶] یعنی نزاکتِ یار کا خیال مانع ہے ورنہ ہم بھی ستم رسیدہ باکی کرتے نہ چوکتے۔ [۷] شکر ہے کہ میری شکایت کا دوست پر اثر نہیں۔ ورنہ اُسکو حزن و ملال ہوتا اور اُسکے ملال سے مجھے دل آزردگی ہوتی۔

ہیں آرزو سے[۸] مرگ کی بے التفاتیاں
جینا مرا محال تو دشمن اگر نہ ہو

صحبت میں ایک رات کی[۹] وہ تنگ آگئے
طول امل سے قصہ مرا مختصر نہ ہو

لذت[۱۰] بغیر جاں دہی مردگاں محال
آب بقا فشردۂ دامان تر نہ ہو

ہیں جاں نثار کہیے تو مرجائیں ہم ابھی
یہ کام بوالہوس سے کبھی عمر بھر نہ ہو

جب فرق بے کلاہ ہوا چین آگیا
راحت زیادہ تر ہو اگر تن پہ سر نہ ہو

پامال کیجے شوق سے پر بزم خاص میں
اتنا تو ہو کہ خاک مری دربدر نہ ہو

سوتے[۱۱] سے اٹھ کر آئے ہیں یارب بجائیں وہ
شرمندۂ آہ شب سے دعائے سحر نہ ہو

اب[۱۲] کیجے آہ تاب گسل ہر جفا کے ساتھ
جب جان سے گذر گئے پھر درگذر نہ ہو

مومن ہوا رقیب خدا سے صنم پرست
ایسے سے ڈریے جس کو خدا کا بھی ڈر نہ ہو

۸ تو مجھ سے دشمنی کرتا ہے جس پر میں تنگ آکر مرگ کی آرزو کرتا ہوں۔ مگر جیسا کہ قاعدہ ہے جس چیز کی آرزو کی جاتی ہے اُس کے حصول میں دشواریاں ہوتی ہیں۔ اسی لئے مرگ بھی مجھ سے بے التفاتیاں کرتی ہے۔ اور میں مر نہیں سکتا۔ اگر تو دشمنی نہ کرتا تو میں کبھی کا مرچکا ہوتا۔ گویا میری زندگی تیری نامہربانی پر موقوف ہے۔ خیال میں بہت ندرت ہے۔ ۹ یعنی مجھے خوف ہے کہ کہیں طول مدعا میرا کام تمام نہ کردے یا رسم محبت ختم نہ کردے کیونکہ ایک ہی شب کے عرض تمنا میں دوست مجھ سے تنگ آگیا۔

۱۰ آب حیات سے مُردوں میں جان آتی ہے جیسا کہ نظامی کہتے ہیں۔ شگفتہ نشد کا ب حیواں گہر ٭ کند ماہی مردہ را جانور مگر جب تک آب حیات میں لذت نہ ہوگی جان بخشی کا اثر ہونا معلوم۔ اس سے ثابت ہوا کہ اُس میں لذت ضرور ہے۔ اور چونکہ شاعر کے نزدیک تمام لذتوں کا سرچشمہ دامان تر ہے۔ اسلئے قیاس چاہتا ہے کہ آب حیات دامان تر کا نچوڑا ہوا ہے جو اس میں اس قدر مزہ ہے۔ دامان تر (دامن گناہ آلودہ) سے لذت کا تعلق بدیہی ہے۔ جاں دہی = جان بخشی دیکھو مطلع غزل ١٥٧۔ ۱۱ آہ شب نے تو اپنا اثر دکھایا کہ دوست رات سوتے سے اٹھ کر میرے گھر آیا۔ اب اگر صبح کو وہ چلا گیا تو دعائے سحری بے اثری ثابت ہوگی۔ اسلئے آرزو ہے کہ وہ اب نہ جائے تاکہ میری دعائے سحری شرمندہ نہ ہو۔

۱۲ جب جان کا خیال چھوڑ دیا تو آہ میں کوتاہی کیوں کی جائے۔

۱۶۰ خالیؔ[۱] ہوائے فتنہ سے گا ہے جہاں نہ ہو
اِس دم قیامت آئے اگر آسماں نہ ہو

اعجاز[۲] سے زیادہ ہے سحر اُنکے ناز کا
آنکھیں وہ کہہ رہی ہیں جو لب سے بیاں نہ ہو

یوں تو بہت سے دل کے خریدار ہیں ولے
جو ہے سو بد معاملہ کیونکر زیاں نہ ہو

لکھتا[۳] ہوں اس کو بستگیِ دل کا ماجرا
آنسو رواں نہ ہو تو سیاہی رواں نہ ہو

شیخِ حرم سے کام نہ پیرِ مغاں سے ربط
کیا کفر و دیں جو پاس وہ زیبا جواں نہ ہو

تر کر دیا ہے ابرِ بہاری نے اس قدر
بجلی گرے تو گرم مرا آشیاں نہ ہو

اب شوقِ وصل ہے نہ غمِ قربِ مدعی
پامال ہو چکا ہوں عبث سرگراں نہ ہو

کرنی[۴] نہ تھیں بگاڑ کی باتیں گلے میں ہائے
کیسی بنے جو دل سے وہ نامہرباں نہ ہو

عزمِ سفر جہاں سے کروں کیا شبِ فراق
میں جانتا ہوں چین کہاں تو جہاں نہ ہو

اس شرط پر جو لیجے تو حاضر ہے دل ابھی
رنجش نہ ہو فریب نہ ہو امتحاں نہ ہو

یہ جامہ[۵] پارہ پارہ تڑپنے سے ہو گیا
صبحِ شبِ فراق ہے تو بدگماں نہ ہو

مومنؔ[۶] بہشت و عشقِ حقیقی تمھیں نصیب
ہم کو تو رنج ہو جو غمِ جاوداں نہ ہو

۱۶۰ ۱؎ دنیا کبھی فتنوں سے خالی نہیں ہوتی۔ اگر جورِ فلک نہ ہو تو فتنۂ قیامت برپا ہو جائے۔

۲؎ لب کو جاں بخشی کی رعایت سے صاحبِ اعجاز اور آنکھوں کو فتنہ انگیزی کے اعتبار سے ساحر قرار دیا ہے۔ ۳؎ بستگیِ دل = دل گرفتگی۔ انقباض۔ حالِ بستگیِ دل کے لکھنے کا یہ اثر ہے کہ دوات کی سیاہی بھی جم گئی۔ اگر میرے آنسو نہ جاری ہوتے تو سیاہی کا رواں ہونا محال تھا۔

۴؎ میں نے غلطی کی کہ محبوب سے شکایت میں بگاڑ کی باتیں کہیں۔ کیونکہ اگر اُسکی برہمی محض اوپری دل سے ہے تو کسی روز ان باتوں کی بدولت مجھے اُس سے شرمندہ ہونا پڑے گا۔

۵؎ عاشق کا جامہ پارہ پارہ ہونے سے محبوب کو بدگمانی ہوئی کہ یہ نتیجہ ہے کسی دوسرے حسین کے ساتھ وصال میں کشمکش کا۔ اسلئے اسکی بدگمانی کو دور کرتا ہے۔

۶؎ شاعر غمِ جاوداں (غمِ عشق) کو بہشت کے عیشِ مخلّد پر ترجیح دے رہا ہے۔

ردیف الہاء

چل پرے ہٹ مجھے نہ دکھلا مُنہ	۱۶۱	اے شبِ ہجر تیرا کالا مُنہ
آرزو سے نظارہ تھی تو نے		اتنی ہی بات پر چھپایا مُنہ
دشمنوں سے بگڑ گئی تو بھی		دیکھتے ہی مجھے بنایا مُنہ
بات پوری بھی مُنہ سے نکلی نہیں		آپ نے گالیوں پہ کھولا مُنہ
ہو گیا رازِ عشق بے پردہ		اُس نے پردہ سے جو نکالا مُنہ
شبِ غم کا بیان کیا کیجے		ہے بڑی بات اور چھوٹا مُنہ
جب کہا یار سے دکھا صورت		ہنس کے بولا کہ دیکھو اپنا مُنہ
کس[1] کو خونِ جگر پلائے گا		ساغرِ مے کو کیوں لگایا مُنہ
پھر گئی آنکھ مثلِ قبلہ نما		جس طرف اُس صنم نے پھیرا مُنہ
گھر میں بیٹھے تھے کچھ اداس سے وہ	ق	بولے بس دیکھتے ہی میرا مُنہ
ہم بھی غمگین سے ہیں آج کہیں		صبح اُٹھے تھے دیکھ تیرا مُنہ

سنگِ[2] اسود نہیں ہے چشمِ بتاں
بوسہ مومن طلب کرے کیا مُنہ

جو[3] تیرے مُنہ سے ہو شرمسار آئینہ	۱۶۲	تو رُخ کرے سوئے آئینہ دار آئینہ
کہے ہے دیکھ کے رخسارِ یار آئینہ		کہ اس صفائی پہ صدقے نثار آئینہ

[1] تو نے ساغرِ شراب کو مُنہ لگایا ہے یقین ہے کہ عاشق اس رشک سے خونِ جگر پئیں گے۔
[2] یعنی بتوں کی چشمِ سیاہ کا رتبہ سنگِ اسود سے بڑھ کر ہے۔
[3] آئینہ تیری صفائی رخ کی وجہ سے شرمندہ ہو کر آئینہ دار سے آنکھیں چُراتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اُسکی طرف رُخ نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ آئینہ دار کی طرف آئینہ کی پشت ہوتی ہے۔ شعر میں حسنِ تعلیل ہے۔

[۱] سیاہ رو نہ کرے ترک الفتِ گلفام
میں بوالہوس کو دکھاؤں ہزار آئینہ

[۲] صفائے دل کی کہاں قدر تیرہ روزی میں
چراغ صبح ہے شبہائے تار آئینہ

[۳] سمجھ لیا مگر اس سبز رنگ کو طوطی
کہ ہے نظارہ کا امیدوار آئینہ

[۴] وہ سخت جاں ہوں کہ دکھلائیں گر دمِ نزع
تو توڑ دے کمرِ کوہسار آئینہ

[۵] مقابل اُس رُخِ روشن کے کھل گئی قلعی
نہ ٹھہرا آگ پہ سیماب وار آئینہ

سما رہے ہیں مگر تیرے نو بنو جلوے
کہ بن گیا ہے طلسمِ بہار آئینہ

[۶] شکستِ رنگ پہ مستی میں ہنستے ہیں ہم بھی
دکھائیں گے اُنھیں وقتِ خمار آئینہ

[۷] مجھے تو کہتے ہو مت دیکھ میری جانب تو
اور آپ دیکھتے ہو بار بار آئینہ

[۸] بلا ہے منع وفا نور اُڑ گیا ناصح
تو لے کے دیکھ تو رنگِ عذار آئینہ

سمجھ تو مومن اگر ناروا ہے خود بینی
تو دیکھیں کاہے کو پرہیزگار آئینہ

[۱] رقیب سیاہ رو اس حسین کی الفت ترک کرنیوالا نہیں۔ اگرچہ میں اسکو ہزار آئینہ دکھاؤں کہ کہاں تیرا منہ کہاں اس کا عشق۔ [۲] سیاہ بختی کی حالت میں صفائے دل کی قدر نہیں ہوتی جس طرح شبہائے تار میں آئینہ چراغ صبح کی مانند بے رونق ہوتا ہے۔ [۳] قاعدہ ہے کہ طوطی کے آگے تصویردار آئینہ رکھتے ہیں تاکہ وہ اس میں اپنی شبیہ دیکھکر سرگرم گفتار ہو۔ آئینہ نے اُس سبز رنگ دلربا کو شاید طوطی سمجھ لیا ہے کہ اسکے نظارہ جمال کا امیدوار ہے۔ "سبز رنگ" کی مناسبت "طوطی" سے ظاہر ہے۔ اگرچہ سبز رنگ اصطلاح میں سانولے کو کہتے ہیں۔ [۴] میں اسقدر سخت جان ہوں کہ اگر مجھے مرتے وقت آئینہ دکھائیں تو آئینہ جیسی نازک چیز میں اسقدر سختی آجائے کہ پہاڑ کی کمر کو توڑ دے۔ قاعدہ ہے کہ بیہوشی کی حالت میں سکتہ اور موت کے امتیاز کے لئے آئینہ منہ کے قریب لیجاتے ہیں۔ آئینہ کا تعلق کوہسار سے ظاہر ہے۔

[۵] رُخ روشن کو آگ اور آئینہ کو سیماب سے تشبیہ دی ہے۔ [۶] معشوق مستی کی حالت میں ہے اور میرے رنگ رخ کے اُڑنے پر ہنس رہا ہے۔ اب جب اُسکا نشہ اُترے گا اور رنگ فق ہوگا تو میں اُسکو آئینہ دکھاؤں گا۔ [۷] تم اپنے جلوے کے اسقدر مشتاق ہو تو میں اُسکا مشتاق کیوں نہ ہوں۔ [۸] ناصح وفا سے منع کرنا بُرا ہے۔ جس کے اثر سے تیرے چہرے کا نور جاتا رہا۔ ذرا آئینہ اُٹھا کر رنگ رُخ تو دیکھ۔

۱۶۳ سیماب ہے پہلو میں مرے دل تو نہیں یہ — اس دل نے ستایا مجھے غارت ہو کہیں یہ
معلوم[۱] رسائی ترے کانوں تک اگرچہ — نالہ مرا کہتا ہے کہ ہے عرش بریں یہ
کچھ شورِ محبت کی تو لذت ہی نہ پوچھو — ہے آپ کے بھی حسن سے کتنا نمکیں یہ
اک آہ ہی کر لوں کہ ہو شاید اُسے تاثیر — فرصت نہیں اب ہے نفسِ بازپسیں یہ
حسرت سے کہا خضر نے دیکھ اُسکی گلی کو — مرتا ہوں ابھی گر ملے مدفن کو زمیں یہ
کیا یار کے آنے کی سُنی کچھ کہ اجل کی — کاہے کی خوشی ہجر میں ہے جانِ حزیں یہ
کیوں[۲] چھیڑتے ہو مجھکو بُرا ہونے لگا کیوں — ہے غیر کا نامہ نہ مرا خط جبیں یہ
ہاش یاں[۳] پردہ اُٹھا ورنہ کھلا شوقِ نہانی — اب مجھ سے تو چھپتا نہیں اے پردہ نشیں یہ
یاں کاہے کو وہ آتے لگا لے کششِ دل — تو لاکھ کہے پر کوئی آتا ہے یقیں یہ
ق بیدم سا پڑا تھا کوئی اس کوچہ میں اُسنے — دروازے میں آ جھانک کے دیکھا جو کہیں یہ
اس رحم کے صدقے وہیں گھبرا کے کہا ہائے — جا کر کوئی دیکھو کہیں مومن تو نہیں یہ

۱۶۴ دلبستگی سی ہے کسی زلفِ دوتا کے ساتھ — پالا پڑا ہے ہم کو خدا کس بلا کے ساتھ
کب تک نبھائیے بُتِ ناآشنا کے ساتھ — کیجے وفا کہاں تلک اُس بیوفا کے ساتھ
یاد ہوائے یار نے کیا کیا نہ گُل کھلائے — آئی چمن سے نکہتِ گل جب صبا کے ساتھ

۱۶۳ ۱؎ اگرچہ میرا نالہ عرش کے قریب پہونچ گیا مگر تیرے کانوں تک رسائی محال۔
۲؎ محبوب نے چھیڑنے کو مزاحاً کہا کہ غیر کا خط بُرا ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ یہ کیوں بُرا ہوتا۔ یہ غیر کا نامہ ہے میرا خط نہیں (خطِ تقدیر) تھوڑا ہی ہے جو بُرا ہو۔
۳؎ تیرے پردے کی وجہ سے مجھے اضطراب ہوگا اور رازِ عشق ظاہر ہو جائے گا۔ اسلئے پردہ اُٹھا دے۔

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی ‏— آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

ہے کس کا انتظار کہ خوابِ عدم سے بھی ‏— ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ

یارب[2] وصالِ یار میں کیونکر ہو زندگی ‏— نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

اللہ رے سوزِ آتشِ غم بعد مرگ بھی ‏— اُٹھتے ہیں میری خاک سے شعلے ہوا کے ساتھ

سوزِ ندگی نثار کروں ایسی موت پر ‏— یوں روئے زار زار تو اہلِ عزا کے ساتھ

ہردم[3] عرق عرق نگہِ بے حجاب ہے ‏— کس نے نگاہ گرم سے دیکھا حیا کے ساتھ

مرنے[4] کے بعد بھی وہی آوارگی رہی ‏— افسوس جاں گئی نفسِ نارسا کے ساتھ

دستِ جنوں نے میرا گریباں سمجھ لیا ‏— اُلجھا ہے اُن سے شوخ کے بندِ قبا کے ساتھ

آتے ہی تیرے چل دئے سب ورنہ یاس کا ‏— کیسا ہجوم تھا دلِ حسرت فزا کے ساتھ

میں کینے سے بھی خوش ہوں کہ سب تو کہتے ہیں ‏— اُس فتنہ گر کو لاگ ہے اس مبتلا کے ساتھ

مومن وہی غزل پڑھو شب جس سے بزم میں
آئی تھی لب پہ جان زہ وحبذا[5] کے ساتھ

سلہ یہ کرشاعرانہ اور ندرت خیال قابل داد ہے۔ مرزا غالب نے بھی اسی مضمون کو باندھا ہے مگر اسقدر تغزل ۱۶۴
اور لطافت پیدا نہ کرسکے۔ مرزا کا شعر ہے۔ خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ + کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے
سلہ۲ وصل میں محبوب کی ہر ادا جانستاں ہے۔ پھر زندگی کیونکر ہوگی۔ خیال میں جدت ہے۔ سلہ۳ معشوق نے شرم
کے ساتھ نگاہ گرم (نگاہ غضب) سے مجھے دیکھا جس کا یہ اثر ہوا کہ میری نگاہ بے حجاب پسینے پسینے ہوگئی۔ اپنی نظر کو
بے حجاب اسلیئے کہا ہے کہ وہ نظر بازی میں بے باک ہے۔ سلہ۴ نفس نارسا = آہ بے اثر جس طرح میری آہ نارسا
ہمیشہ اپنی منزل مقصود سے بیگانہ رہی اسی طرح مرنے کے بعد میری روح بھی اپنے ٹھکانے پر پہونچنے کے بجائے
بھٹکتی رہی۔ یعنی جو آوارگی حیات میں تھی بعد ممات بھی باقی ہے۔ سلہ۵ زہ و حبذا دونوں کلمہ تحسین ہیں۔
جیسے شاباش، مرحبا۔

۱۶۵

اُلٹے[۱] وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ	بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ
بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ	دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ
بے[۲] پردہ غیر پاس اُسے بیٹھا نہ دیکھتے	اُٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ
وہ[۳] لالہ رو گیا نہ ہو گلگشتِ باغ کو	کچھ رنگ بوئے گل کے عوض ہے صبا کے ساتھ
اس کی گلی کہاں یہ تو کچھ باغِ خلد ہے	کس جا سے مجھکو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ
آتی[۴] ہے بوئے داغِ شبِ تارِ ہجر میں	سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو قبا کے ساتھ
گلبانگ[۵] کس کا مشورۂ قتل ہو گیا	کچھ آج بوئے خوں ہے وہاں کی ہوا کے ساتھ
تھے[۶] وعدے سے پھر آنے کے خوش یہ خبر نہ تھی	ہے اپنی زندگانی اُسی بیوفا کے ساتھ

۱۶۵ — ۱ھ معشوق عاشق سے اپنی جفاؤں کی معذرت کرتا ہے مگر دیکھنا کس ادا کے ساتھ کہتا ہے کہ میں نادم ہوں کہ میں نے تم پر اس قدر ظلم کئے حالانکہ تم میرے ظلم کے متحمل نہ ہونے کی بنا پر اس سلوکِ خاص کے اہل نہ تھے گویا عذر کا عذر ہے اور شکوہ کا شکوہ۔ شکوہ سے مراد عاشق کی بے طاقتی کا طعنہ ہے کیونکہ وہ ستم برداشت نہ کر سکا۔ ۲ھ جس طرح دنیا سے حیا اُٹھ گئی کاش ہم بھی اُٹھ جاتے کہ یہ رشک نہ سہنا پڑتا۔

۳ھ صبا کے ساتھ ہمیشہ بوئے گل آیا کرتی تھی۔ مگر ابکی صبا بوئے گل کی عوض رنگینی میں ڈوبی ہوئی ہے جس سے اس امر کا سراغ چلتا ہے کہ وہ لالہ رو (محبوب) سیرِ باغ کو گیا ہوگا۔ لالہ رو کی مناسبت سے رنگ کا لفظ استعمال کیا۔

۴ھ ہجر میں تڑپنے کی وجہ سے قبا چاک ہو گئی ہے۔ ڈر ہے کہ قبا کے ساتھ کہیں سینہ بھی شق نہ ہو گیا ہو ورنہ جگر کے داغ کی بو کیوں آتی۔ دوسرے مصرع میں جو شک ظاہر کیا ہے اُسکی وجہ یہ ہے کہ شبِ تاریکِ ہجر میں اچھی طرح نظر نہیں آ سکتا۔

۵ھ گلبانگ = آوازِ خوش۔ مراد آوازِ معشوق یعنی معشوق کے یہاں پہلے عاشق کا مشورہ قتل ہوتا تھا۔ اب اُس مشورے نے معشوق کی زبان سے اعلان کی صورت اختیار کر لی۔ جسکو شاعر نے گلبانگ سے تعبیر کیا ہے۔ چونکہ ہوا کے ساتھ گل سے بوئے گل آیا کرتی ہے۔ ضرور ہے کہ گل بانگ سے (جو قتلِ عاشق سے متعلق ہے) بوئے خون آئے گل کی رعایت سے بو اور قتل کی رعایت سے بوئے خوں لکھا ہے۔ ۶ھ محبوب نے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا اور ہم سادہ دلی سے خوش ہو گئے۔ مگر اُدھر اُسنے قدم باہر رکھا اِدھر ہماری جان نکل گئی کیونکہ ہماری زندگی اُسی سے وابستہ تھی۔

کوچے سے اپنے غیر کا منہ ہے ہٹا سکے ۔۔۔ عاشق کا سر لگا ہے ترے نقش پا کے ساتھ

اللہ ری گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

۱۶۶

۱؎ تکلیف سے جوں پنجۂ گل لال ہوا ہاتھ ۔۔۔ نازک ہے وہ بس چھوڑ دے لے رنگ حنا ہاتھ

۲؎ میں اپنے گریباں کے ٹکڑوں کا ہوں پیرو ۔۔۔ چلتے ہیں جنوں میں مرے پاؤں سے سوا ہاتھ

۳؎ ہے دست مری نبض کی تفت سے ید بیضا ۔۔۔ یہ معجزۂ تازہ مسیحا کے لگا ہاتھ

۴؎ ہنگام وداع آہ گلا کاٹ رہے تھے ۔۔۔ کیا کھینچتے دامن کو ترے کام میں تھا ہاتھ

۵؎ رکھا تو دل و چشم سے اب اٹھ نہیں سکتا ۔۔۔ قربان نزاکت کے میں کیا پاؤں ہے کیا ہاتھ

ہونے نہ دیا چاک گریبان کفن کو ۔۔۔ یاروں نے کئے دفن مرے تن سے جدا ہاتھ

۵؎ رقیب مجھے اپنے کوچے سے نہیں ہٹا سکتا کیونکہ وہاں تیری آمد و رفت ہے اور جہاں تیرا نقش قدم ہوگا وہاں عاشق کا سر ہونا ضروری ہے۔

۱۶۶ ۱؎ شاعر محبوب کے کف نگارین کی رنگینی کی توجیہ یوں کرتا ہے کہ رنگ حنا نے اسکا ہاتھ پکڑا اسلئے وہ نزاکت کی وجہ سے پنجۂ گل کی طرح سُرخ ہوگیا۔ ۲؎ جنوں کی حالت میں میرے ہاتھ پاؤں سے زیادہ چلتے ہیں یعنی میں دشت نوردی کے مقابلہ میں جامہ دری کی مشق زیادہ کرتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے اپنے گریبان کے پرزے کرکے آگے پھینکتا ہوں اور پھر بادیہ گردی کے لئے قدم بڑھاتا ہوں۔ اس حساب سے پارہ ہائے گریبان میرے پیشرو ہیں اور میں انکا پیرو۔
۳؎ حضرت مسیحؑ نے میری نبض پر ہاتھ رکھا تھا کہ نبض کی حرارت سے ہاتھ پر داغ پڑ گیا اور انکے ہاتھ میں ید بیضا کی شان پیدا ہوگئی۔ ید بیضا = حضرت موسیٰؑ کا ہاتھ جس پر آگ کا داغ پڑ گیا تھا اور بعد کو بطور معجزہ آفتاب کی طرح چمکتا تھا۔ مراد یہ ہے کہ (معاذ اللہ) میری بدولت جناب مسیحؑ کو وہ ہی معجزہ ملا جو حضرت موسیٰؑ کو حاصل تھا۔
۴؎ تیرے رخصت ہونے کے وقت ہم اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ رہے تھے اسلئے تجھے روک نہ سکے کہ ہاتھ خالی نہ تھے۔
۵؎ معشوق نے میرے دل پر ہاتھ رکھا کہ تسکین ہو اور میری آنکھوں پر پاؤں رکھا کہ آنکھوں کی حسرت پابوس نکل جائے۔ مگر نزاکت کے قربان جاؤں کہ اب وہ اپنے ہاتھ یا پاؤں کو ہٹا نہیں سکتا۔

یہ دستِ بریدہ مرے قاصد کا نہ ہووے
ہے مہر کا خط ہائے شعاعی سے پھرا ہاتھ

جیسا مجھے آرام ترے ہاتھ سے آیا
اللہ کرے یوں ہی ترا سینہ مرا ہاتھ

جوشِ شاخِ گل اے جوشِ جنوں زار ہوں جیسے
جب چاک ہوا جامۂ تو بس ٹوٹ گیا ہاتھ

بیٹھا کفِ افسوس ملے گا پسِ کشتن
غیروں سے بھی ظالم تو مرے ساتھ اٹھا ہاتھ

ہم اور یہ بدعت تپشِ دل کے سبب سے
مومن مرے سینہ پہ رہے بعدِ فنا ہاتھ

۱۶۷

ہم میں فلک اک نگہ کی بھی طاقت نہ چھوڑ دیکھ
دستِ مژہ سے پنجۂ خورشید مروڑ دیکھ

اے جامہ زیب میں ہوں وہ مجنوں کہ قیس کا
پھٹ جائے سینہ میرے گریباں کے جوڑ دیکھ

دورِ خمار کا بھی ہے کچھ دھیان یا نہیں
اے مستِ حسن شیشۂ دل کو نہ توڑ دیکھ

گر ناز کی سے بار ہے دشنہ تو اک نگاہ
ہم نیم بسملوں کو تڑپتا نہ چھوڑ دیکھ

پنجۂ مہر میں خطِ شعاعی دیکھ کر عاشق خیال کرتا ہے کہ یہ میرے قاصد کا دستِ بریدہ معلوم ہوتا ہے جو میرا خط لیکر گیا تھا اور اسی جرم میں کاٹا گیا ہے۔ آفتاب کو قاصد کے کفِ دست سے اور خطِ شعاع کو تحریر سے مشابہت دی ہے۔ جس طرح تو نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا (اور مجھے تسکین ہوگئی) اسی طرح اللہ کرے الی آخرہ۔ شعر میں شوخی ہے اور شاعر نے یہ فرض کر لیا ہے کہ سینے پر ہر شخص کے ہاتھ رکھنے سے تسکین ہوتی ہے۔ اسلئے دعا دیتا ہے۔ اے جوشِ جنوں میں شاخِ گل کی طرح کمزور و ناتواں ہوں جیسے شاخِ گل کے جامہ کے چاک ہونے پر (پھول کے کھلنے پر) گل کے توڑتے ہی شاخِ گل بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسے ہی جیب میں نے وحشت میں کپڑے پھاڑے تو ضعف کے باعث ہاتھ ٹوٹ گئے۔ گل کی مناسبت جامہ سے اور شاخِ گل کی ہاتھ سے ظاہر ہے۔ یعنی میرے قتل کے بعد غیر بھی خوف سے دعوائے عشق چھوڑ بیٹھیں گے اور تو پچھتائے گا۔ مومن کی شان نہیں کہ بدعت کا مرتکب ہو۔ مگر دل کے تڑپنے سے مجبور ہو کر میں نے مرنے کے بعد اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ لیے۔ کہ شاید اسی طرح کچھ تسکین ہو۔ واضح رہے کہ مرتے پر میت کے ہاتھ سیدھے کر دئے جاتے ہیں۔ سینہ پر رکھنا بدعت ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں سینہ کوبی کی طرف اشارہ ہو جو شرعاً ممنوع ہے۔

۱۶۷ اے فلک ہم میں اتنی طاقت بھی نہ چھوڑ کہ کسی پر نگاہ کر سکیں۔ ورنہ ہم اپنے دستِ مژہ سے پنجۂ خور کو مروڑ ڈالیں گے اور تو اس کا باعث ہوگا۔ مژہ (پلک) کو ہاتھ سے اور خور (آفتاب) کو پنجہ سے تشبیہ دی ہے۔ خمار = انقطاعِ نشہ۔ نشہ اترنا۔ اے مستِ حسن دیکھ میرے شیشۂ دل کو نہ توڑ ورنہ جب نشۂ حسن اترے گا تب تو عاشقوں کو یاد کر کے پچھتائے گا۔

اغوا[1] سے غیر کے نہ جگا خفتہ فتنہ کو — میں غش نہیں ہوں لاش مری مت جھنجھوڑ دیکھ

آئینہ[2] خانہ بن گیا دل توڑتا نہ تھا — یعنے اب ایسے جلوہ نما ہیں کروڑ دیکھ

طوفاں[3] ہیں اب ہر اک گہر اشک میں نہاں — اے یادِ دوست دامنِ مژگاں نچوڑ دیکھ

میرا[4] قلق بھی قبلہ نما سے نہیں ہے کم — باور نہیں تجھے تو ذرا منہ کو موڑ دیکھ

کیا[5] رحم دیکھنے کی بھی بندی ہو چاہئے — اے چشم اُسکے سامنے تو ہاتھ جوڑ دیکھ

جلنا[6] ترا بتوں میں بھی تاثیر کر گیا
مومن یقیں نہیں ہے تو پتھر کو پھوڑ دیکھ

ردیف الیاء

۱۶۸ منظور[7] نظرِ غیر ہی اب ہمیں کیا ہے — بے دید تری آنکھ سے دل پہلے پھرا ہے

کھائی[8] ہے قسم ہم نے کہ پرہیز کرینگے — گر درد سے بھر جائے طبیعت تو مزا ہے

[1] میں مرگیا ہوں مگر غیر کے بہکانے سے تجھے میری موت کا یقین نہیں آتا اور میری لاش کو جھنجھوڑتا ہے۔ دیکھ ایسا نہ ہو کہ کوئی نیا فتنہ اُٹھ کھڑا ہو۔ [2] تو نے میرا شیشۂ دل اِس ضد پر توڑ ڈالا کہ اُس میں تیری صورت جلوہ گر تھی۔ لیکن اب دل کے ہر ٹکڑے میں تیری صورت نظر آنے لگی اور دل آئینہ خانہ بن گیا۔ اسلئے تیری کوشش رایگاں گئی۔ یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ اب تیری یکتائی کا دعویٰ باطل ہوگیا۔

[3] یادِ دوست میں میرا یہ حال ہے کہ ہر آنسو میں ایک طوفان پوشیدہ ہے۔ اگر میرا دامنِ مژگاں نچوڑا جائے تو میرے دعوے کی تصدیق ہوسکتی ہے۔ پلکوں کو اکثر دامن سے تشبیہ دیتے ہیں۔

[4] میرے دل کی تڑپ تجھے پھیر کر تیری جانب کر دے گی۔ خواہ تو کسی جانب رُخ کرے۔

[5] اے چشم اُس سے رحم کی توقع عبث ہے۔ ڈر یہ ہے کہ کہیں تجھے دیکھنے کی بھی بندش نہ ہو جائے۔ یقین نہ ہو تو اُسکے سامنے ہاتھ جوڑ کر دیکھ لے۔ واضح رہے کہ آنکھ کا ہاتھ جوڑنا آنکھ کا بند ہونا ہے۔

[6] پتھر سے آگ کا نکلنا اس کا ثبوت ہے کہ تیرے سوزِ عشق نے بتوں پر بھی اثر کیا۔

۱۶۸ [7] یعنی تیری آنکھ پھرنے سے پہلے ہمارا دل تجھ سے پھر گیا۔ بے دید = بے مروّت۔ [8] اگر درد عشق سے طبیعت بیزار ہو جائے تو بہتر ہے۔ کیونکہ ہم نے قسم کھائی ہے کہ (طلب یار سے) پرہیز کرینگے۔

جب گھر میں نہ ہو تم تو رہیں کوچے میں ہم کیوں
شکوہ جو تمھارا تو ہمارا بھی بجا ہے

بس بس نہ کرو بات کہ یاد آتے ہے مجھکو
ناصح سے جو کچھ بے خودیوں میں کبھی سنا ہے

کس طرح نہ اُس شوخ کے رونے پہ ہنسوں میں
نظر دل میں مروت ہے نہ آنکھوں میں حیا ہے

اب شوق سے تم محفلِ اغیار میں بیٹھو
یاں گوشۂ خلوت میں عجب لطف اُٹھا ہے

یارب کوئی معشوقۂ دلجو نہ ملے اب
جو اُن کی دعا ہے وہی اپنی بھی دعا ہے

توبہ کنہ عشق سے فرماتے ہے واعظ
یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

آزردۂ حرمانِ ملاقات سے ملے کیا
یعنے کہ نہ ملنا ہی نہ ملنے کی سزا ہے

پرہیز سے اُس کے گئی بیماریِ دل آہ
بیگانگیوں میں بھی عجب ربط رہا ہے

میری بیخودی کے زمانہ میں ناصح یہ کہکر عشق سے منع کرتا تھا کہ معشوق بے وفا ہے۔ مگر میں دھیان نہ دیتا تھا لیکن کان پڑی بات کبھی نہ کبھی کام آجاتی ہے۔ چنانچہ تمھارے ظلم دیکھکر اب اُسکی باتوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ اسلئے میرے سامنے صفائی پیش کرنے سے فائدہ۔ معشوق ارتباط غیر کی تردید میں اپنے کو بے قصور ثابت کرنے کے لئے روتا ہے۔ اور میں اُسکے رونے پر ہنستا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اُس کا رونا تصنع کی بنا پر ہے۔ دعا دونوں کی ایک ہے مگر نیت مختلف۔ معشوق عاشق سے ناراض ہوکر دعا کررہا ہے اور عاشق عشق سے بیزار ہوکر ہوسکتا ہے کہ یہاں دو دلجو کے دو معنی مراد ہوں یعنی مہربانی کرنے والا اور دل کا تلاش کرنے والا۔ معشوق نے معنی اول مراد لئے ہوں اور عاشق نے معنی ثانی دیکھو مطلع غزل ۲۳۔ مراد یہ ہے کہ اگر واعظ گنہگار نہ ہوتا تو توبہ کیوں کرتا۔ "فرماتے ہے" طنزاً استعمال کیا ہے۔ ممکن ہے کہ "توبہ فرماتے ہے" توبہ می فرماید" کا ترجمہ ہو یعنی توبہ کا حکم دیتا ہے۔ جو شخص ملاقات یار سے محروم رہنے کی وجہ سے آزردہ ہے (یعنی عاشق) وہ اب معشوق کے منانے سے بھی نہیں من سکتا۔ کیونکہ معشوق جو اتنے عرصہ تک نہیں ملا اُس کی سزا یہی ہے کہ عاشق بھی آیندہ اُس سے نہ ملے۔ عموماً ربط باہمی یگانگی کی حالت میں ہوتا ہے۔ مگر یہاں بیگانگی میں بھی ربط (یکسانی طبیعت) کا یہ حال رہا۔ ادھر دوست نے ہم سے پرہیز کیا ادھر ہماری بیماری دل رخصت ہوئی۔ یعنی اُسکی سرد مہری نے ہمارا جوش الفت فرو کردیا۔ گویا جس طرح اُسکی طبیعت بدلی اُسی طرح ہماری طبیعت بھی پلٹی یا یہ کہ بیگانگی کے باوجود اُسکی ذات سے مجھے یہ فائدہ پہونچا کہ بیماری دل جاتی رہی۔ آہ کا لفظ مصرع ثانی سے متعلق ہے اور یہ پند دے رہا ہے کہ عاشق کو اب اسقدر بیشارکت بھی پسند نہیں۔

تھا[۹] محوِ رخِ یار میں کیا آئینہ دیکھوں
چاہا[۱۰] کرے دل لاکھ نہ بولونگا جو ہمدم
میں[۱۱] ترکِ وفا سے بھی وفادار ہوں مشہور

معلوم ہے یارو مجھے جو رنگ مرا ہے
وہ میرے منانے کو رقیبوں سے خفا ہے
کیں تجھ سے جو اے دشمنِ اربابِ وفا ہے

مومن[۱۲] نہ سہی بوسہ پا سجدہ کرینگے
وہ بُت ہے جو اوروں کا تو اپنا بھی خدا ہے

۱۶۹

خوشی نہ ہو مجھے کیونکر قضا کے آنے کی
ہے[۱۵] ایک خلق کا خوں سر پہ اشک کے مرے
سمجھ[۱۶] کے اور ہی کچھ مر چلا ئیں اسے ناصح
اُمید[۱۷] مرہم میں تکتے ہیں راہ دیدۂ زخم

خبر ہے لاش پہ اس بیوفا کے آنے کی
سکھائی طرز اُسے دامن اُٹھا کے آنے کی
کہا جو تو نے نہیں جان جا کے آنے کی
شمیم سلسلۂ مشک سا کے آنے کی

۹ احباب نے عاشق سے کہا کہ ذرا آئینہ لیکر تو دیکھو۔ عشق کی بدولت تمھارے چہرے کی کیا حالت ہوگئی ہے اُس کا جواب دیتا ہے کہ میں رُخ یار میں محو تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کے رنگ رُخ کا کیا حال ہوگا۔ پھر آئینہ دیکھنے سے کیا حاصل۔ اس میں لطافت یہ ہے کہ رُخ یار خود آئینہ فام ہے۔ آئینہ کی حاجت نہیں۔ ۱۰ اگر دوست میرے منانے کی خاطر رقیبوں سے خفا ہوا ہے تو میں اُس سے ہرگز نہ بولونگا (کتنا ہی دل کیوں نہ چاہے) کیونکہ میری تو عین خواہش ہے کہ وہ ہمیشہ رقیبوں سے ناراض رہے۔ اگر میں اُس سے مَن گیا تو ڈر ہے کہ وہ یہ سمجھ کر کہ مقصود تو حاصل ہو ہی گیا پھر اُن سے ملتفت نہ ہو جائے۔ ۱۱ کیونکہ تجھ جیسے دشمن ارباب وفا سے میرا ترک وفا کرنا بھی اہل عقل کے نزدیک داخل وفاداری ہے۔ کیں = دشمنی ۱۲ اگر بُت کا بوسہ پا نہیں ملتا۔ تو نہ ملے۔ ہم آئندہ سے خدا کو سجدہ کرینگے۔ غزل میں سرتا پا واسوخت کا رنگ ہے۔
۱۶۹ ۱۵ میرے اشک خوں کو دیکھ کر محبوب نے دامن اُٹھا لیا کہ آلودہ خون نہ ہو جائے۔ لوگ اس ادا کو دیکھ کر ہلاک ہو گئے اور سب کا خون میرے اشک خون کی گردن پر رہا۔ ۱۶ ناصح نے سمجھایا کہ جان جا کر آنے والی نہیں جس سے اُسکی مراد یہ تھی کہ عمر چند روزہ کو مغتنم سمجھو اور عمل خیر کی طرف توجہ کرو۔ عاشق اپنی "خوش فہمی" سے یہ سمجھا کہ جب زندگی کا اعتبار نہیں تو جہاں تک ہو سکے "کاروبار" عاشقی سے غافل نہ رہنا چاہیئے۔ مرچلا = مرنے لگا۔ عشق کرنے لگا۔ ۱۷ شمیم سلسلۂ مشک سا = زلف مشکیں کی بو۔ جس طرح آنکھ سرمہ کی طالب ہوتی ہے میرے دیدہ ہائے زخم زلف مشکیں کی شمیم کا انتظار کر رہے ہیں۔ زخم کو شکل کے اعتبار سے آنکھ سے تشبیہ دیجاتی ہے سرمہ۔ دیدہ سلسلۂ مشک سا میں رعایت ہے۔

چلی ہے جان نہیں تو کوئی نکالو راہ
تم اپنے پاس تک اس مبتلا کے آنے کی

نہ جائے کیوں دلِ مرغِ چمن کہ سیکھ گئی
بہار وضع ترے مسکرا کے آنے کی

مشامِ غیر میں پہونچے ہے نکہتِ گُلِ داغ
یہ بے سبب نہیں بندی ہوا کے آنے کی

جو بے حجاب نہ ہوگے تو جان جائے گی
کہ راہ دیکھی ہے اُس نے حیا کے آنے کی

پھر اب کی لا ترے قربان جاؤں جذبۂ دل
گئے ہیں یاں سے وہ سوگند کھا کے آنے کی

خیالِ زلف میں خود رفتگی نے قہر کیا
اُمید تھی مجھے کیا کیا بلا کے آنے کی

کروں میں وعدہ خلافی کا شکوہ کس کس سے
اجل بھی رہ گئی ظالم سُنا کے آنے کی

کہاں ہے ناقہ ترے کان بجتے ہیں مجنوں
قسم ہے مجھکو صدائے درا کے آنے کی

کاشانۂ محبوب میں ہوا کا گذر نہیں۔ شاعر اسکی توجیہ یوں کرتا ہے کہ ہوا کے ذریعے سے میرے داغِ عشق (جو گُل سے مشابہ ہے) کی بو غیر کے دماغ میں پہونچتی ہے۔ اس وجہ سے ہوا کی بندش کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ غیر کو نکہتِ گُلِ داغ کیوں پسند آنے لگی۔ وہ اس لذت سے واقف ہی نہیں ہیں

اگر تم خلوت میں مجھ سے بے حجاب نہ ہوگے تو میری جان جائے گی۔ مانا کہ خلوت میں آمد و رفت کی راہیں بند ہیں۔ تاہم جس راہ سے تمھاری حیا یہاں آگئی اُسی راہ سے میری روح کا نکل جانا بھی ممکن ہے۔ زلف کی محبت میں مجھ لذت کش ایذا کو بلا کے آنے کی اُمید تھی۔ مگر خیالِ زلف میں اس قدر بیخودی رہی کہ مجھے بلا کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی اور اُسکا خیر مقدم کرنے سے قاصر رہا۔ زلف کو بلا سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اسی مناسبت سے عاشق بلاکش نزولِ بلا کا مشتاق تھا۔

اگر مصرعِ اول میں "سے" کی بجائے "کی" ہو تو عبارت زیادہ صاف ہو جائے۔ یعنی محبوب تو درکنار۔ اجل بھی وعدہ خلاف نکلی اور آنے کی خبر سُنا کر رہ گئی۔ اب کس کس کی وعدہ خلافی کی شکایت کی جائے۔ درا = جرس۔ گھنٹہ۔ قافلہ یا ناقہ کی گھنٹی۔ یہاں آخر الذکر مراد ہے۔ مجنوں! مجھے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ کی قسم ہے کہ ناقۂ لیلیٰ کا کہیں پتہ نہیں۔ تجھے جو صدائے جرس کا گمان ہے یہ دراصل تیرے کان بجتے ہیں۔

مرے[۹] جنازہ پہ آنے کا ہے ارادہ تو آ | کہ دیر اُٹھانے میں کیا ہے صبا کے آنے کی

مجھے[۱۰] یہ ڈر ہے کہ مومن کہیں نہ کہتا ہو
مری تسلّی کو روزِ جزا کے آنے کی

۱۷۱

میں[۱] اگر آپ سے جاؤں تو قرار آجائے | پر یہ ڈرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو یار آجائے

باندھو[۲] اب چارہ گرو چلّے کہ وہ بھی شاید | وصل دشمن کے لئے سوئے مزار آجائے

کر[۳] ذرا اور بھی اے جوشِ جنوں خوار و ذلیل | مجھ سے ایسا ہو کہ ناصح کو بھی عار آجائے

نام[۴] بدبختیِ عشاق خزاں ہے بُلبل | تو اگر نکلے چمن سے تو بہار آجائے

جیتے[۵] جی غیر کو ہو آتشِ دوزخ کا عذاب | گر مری نعش پہ وہ شعلہ عذار آجائے

کلفت[۶] ہجر کو کیا روؤں ترے سامنے میں | دل جو خالی ہو تو آنکھوں میں غبار آجائے

[۹] میرے جنازے کے اُٹھانے میں دیر کیا ہے (صرف) صبا کے آنے کی (دیر ہے) اسلئے اگر شرکت جنازہ مقصود ہے تو جلد آ۔ صبا کا ذکر اسلئے کیا گیا ہے کہ عاشق ناتواں کی مشتِ خاک تھوڑی دیر میں اُڑ جائیگی۔ [۱۰] عاشق ہدف ستم ہو رہا ہے۔ اسکا ایک ہمدم (مومن) اُسے اطمینان دلاتا ہے کہ قیامت میں ان مظالم کی تلافی ہو جائیگی۔ اس پر وہ کہتا ہے کہ مجھے خوف ہے کہیں مومن یہ باتیں محض میرے "دل کے بہلانے" کی غرض سے تو نہیں کرتا۔

۱۷۹ [۱] میری تڑپ کا صرف یہ علاج ہے کہ بیخود رہوں۔ مگر یہ خوف ہے کہ اگر ایسی حالت میں دوست آیا تو مجھے بیخودی کی وجہ سے اُسکے آنے کی خبر بھی نہ ہوگی۔ [۲] عاشق اپنی زیست سے مایوس ہو کر چارہ گروں سے کہتا ہے کہ زندگی میں تو محبوب کے آنے کی کوئی صورت نہ ہو سکی۔ اب ایک تدبیر باقی ہے۔ کہ میرے مزار پر اعتکاف کرنا۔ شاید وہ بھی کسی مقبول الدعوات بزرگ کی قبر سمجھ کر وصل دشمن کی دعا کرانے کے لئے اِدھر آ نکلے اور میری تمنائے دیرینہ بر آئے۔ [۳] یعنی میری دیوانگی کی وجہ سے محبوب تو مجھ سے ملتا نہیں۔ کاش جوشِ جنوں کے ہاتھوں میری رسوائی اس درجہ کو پہونچ جائے کہ ناصح بھی مجھ سے ملنے میں کراہت کرنے لگے۔ [۴] عاشق بلبل سے (جو بہار کی طالب اور گُل پر عاشق ہے) کہتا ہے کہ خزاں دراصل عشاق کی بدنصیبی کا دوسرا نام ہے اسلئے تو اگر باغ سے جائے تو بہار آ جائے صرف تیرے دم تک چمن میں خزاں ہے۔ [۵] عذاب سے عذابِ رشک مراد ہے شعلہ عذار (شعلہ رخسار) اور آتش دوزخ میں مناسبت ہے۔ [۶] کُلفت = کدورت۔ غبار۔ جب آدمی روتا ہے تو دل خالی ہو جاتا ہے اور دل کا بخار نکلجاتا ہے اگر میں کدورت ہجر کو روؤں تو ڈر ہے کہ جو غبار ابتک دل میں مستور تھا آنکھوں میں جاگزیں ہو جائے گا۔

محو دلدار ہوں کس طرح نہ ہوں دشمنِ جاں		مجھپہ جب ناصحِ بیدرد کو پیار آجائے
ٹھیسر جا جوشِ تپش ہے تو تڑپنا لیکن		چارہ سازوں میں ذرا دمِ دل زار آجائے

حسنِ انجام کا مومن مجھے بارے ہے خیال
یعنے کہتا ہے وہ کافر کہ تو مارا جائے

تیری پابوسی سے اپنی خاک بھی مایوس ہے	۱۷۱	نقش پا پر نقش پا ظالم کفِ افسوس ہے
ہائے یادِ مرغ مجنوں کی جنوں افزائیاں		میرے سر کو سایۂ بالِ ہما منحوس ہے
چشم دریا بار ہے کس کے خیالِ خط میں جو		فلسِ ماہی داغ افزائے پرِ طاؤس ہے
کیا یہ مطلب ہے کہ برعکسِ وفا ہوگی جفا		جو تمہارے عہد نامہ میں خطِ معکوس ہے
یاں جلا یا جی حجابِ شمع رونے اور بھی		سوزِ پروانہ کو مانع پردۂ فانوس ہے
بسکہ شامِ وصل آغازِ سحر میں مر گئے		سینہ کوبی اہلِ غم کی ہم صدائے کوس ہے

میں محوِ دلدار ہوں۔ یعنی یادِ یار میں اسقدر محو ہوں کہ اب خود مجھ میں جلوۂ یار کا پرتو نظر آتا ہے۔ اسلئے جب کبھی ناصح جیسے بیدرد کو میری حالت پر رحم یا مجھپر پیار آتا ہے تو میرا جذبۂ رشک بھڑک اٹھتا ہے اور یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ کہیں ناصح مجھکو مظہرِ جمالِ یار سمجھکر تو محبت نہ کرتا ہو۔ اسلئے اپنا دشمنِ جان ہوں۔ کہ نہ میں ہونگا نہ ناصح کو مجھپر پیار آئے گا۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ میں ناصح کا دشمنِ جان ہوں۔ وہ کافر (محبوب) ناراض ہوکر مومن سے کہتا ہے کہ تو مارا جائے۔ حضرت اسکی تاویل فرماتے ہیں کہ اسمیں بھی اس کافر کو میرے حسنِ انجام کا خیال ہے۔
۱۷۱ کیونکہ مومن اگر مارا جائے گا تو درجۂ شہادت پائیگا۔ میری خاکِ مزار کو بھی یہ امید نہیں کہ تیری قدمبوسی نصیب ہو۔ اسلئے میری خاک کفِ افسوس ملتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ خاک پر جب راہرو چلتے ہیں اور نقشِ پا پر نقشِ پا بنجاتا ہے تو کفِ افسوس ملنے کی شکل پیدا ہوتی ہے۔ مرغِ مجنوں = وہ طائر جس نے مجنوں کے سر میں آشیانہ بنایا تھا۔ بالِ ہما کا سایہ مجھ دیوانے کے سر پر پڑا اور معاً اسکو دیکھکر مجھے مرغِ مجنوں کی یاد آئی جس سے وحشت کو اور ترقی ہوئی۔ اس اعتبار سے سایۂ ہما سعد ہونے کے عوض میرے حق میں نحس ثابت ہوا۔ میری آنکھ کس حسین کے خطِ عارض کی یاد میں آنسوؤں کا دریا بہا رہی ہے کہ دریا کی مچھلی کے فلس (سنے) حسن میں پرِ طاؤس کو رشک دے رہے ہیں۔ عہدنامہ = اقرار نامۂ محبت۔ خطِ معکوس = وہ تحریر جو الٹی لکھی جائے۔ پردۂ فانوس کی وجہ سے پروانہ جلنے سے محفوظ رہتا ہے۔ یہاں اسکے برعکس اُس شمع رو کے پردہ کرنے سے جی جل گیا۔ اودھر شبِ وصل ختم ہوئی اور سحر کا آغاز ہوا اودھر ہم نے جان دیدی یہی وجہ ہے کہ ہمارے اقربا کے ماتم کی آواز کوس کی آواز میں مل گئی ہے کوس سے یہاں صبح کی نوبت مراد ہے۔

[۷] غیرتِ آمد شدِ دشمن سے تلووں سے لگی
جل بجھیں گے اب کہ حالِ مشعلِ منکوس ہے

[۸] گر نہو شکر جفائے متصل سے دردِ سر
لب پہ کچھ کچھ التماسِ جانِ غم مانوس ہے

[۹] نزع میں جی کا نکلنا تیرا آنا ہوگیا
بسکہ مرتے مرتے دل میں حسرتِ پابوس ہے

[۱۰] شاعری اپنی ہوئی نیرنگیِ دانشوری
جو سخن ہے سو طلسمِ رازِ بطلیموس ہے

[۱۱] کر چکا ہوں دورِ اخلاصِ بتاں میں امتحاں
میں نہ مانوں گا کہ مومن زاہدِ سالوس ہے

۱۷۲

[۱۲] دیتے ہو تسکین مرے آزار سے
دوستی تم کو نہیں اغیار سے

[۱۳] کچھ نہ سوجھا حسرتِ دیدار سے
سہل چھوٹے مردنِ دشوار سے

۷ مشعل منکوس = الٹی یا اوندھی مشعل - جلتی ہوئی مشعل کو اگر سرنگوں کر دیا جائے تو جلد جل بجھتی ہے - دشمن کی آمد و رفت کے رشک کے باعث میرے تلووں سے آگ لگی ہے جسکی وجہ سے میرا مشعل منکوس کا سا حال ہے - یقین ہے کہ جلد جل کر خاک ہو جاؤنگا -

۸ جانِ غم مانوس = وہ جان جسے غم پسند ہو - میں تمھاری جفائے پیہم کا شکر کرتا ہوں اور تم کو اُس سے بھی سرگرانی ہوتی ہے - اگر بار خاطر نہ ہو تو میں جانِ غم مانوس کی طرف سے کچھ عرض کروں - یعنی شکر ستم کروں -

۹ مرتے مرتے میرے دل میں تیری پابوسی کی حسرت ہے - اس لئے اس حسرت کی وجہ سے نہ جیتا ہوں نہ مرتا ہوں گویا میرا دم نکلنا ایسا ہی دشوار ہو گیا جیسے تیرا آنا - یعنی دونوں معرض تعویق میں پڑ گئے -

۱۰ طلسم راز بطلیموس = بطلیموس (حکیم اسکندریہ) کا طلسم راز - میری شاعری عقل و خرد کے عجائبات کا مجموعہ ہے - اسی لئے میرے ہر شعر میں طلسم کی کیفیت ہے -

۱۱ سالوس = ریاکار - مکار - جس طرح مومن پہلے بتوں کی محبت میں راسخ تھا - اسی طرح اب ترک عشق کے بعد زہد میں بھی یقیناً صادق ہو گا -

۱۷۲ ۱۲ تم رقیبوں کی دلجوئی کی غرض سے مجھ پر ظلم کرتے ہو اور اتنا نہیں سمجھتے کہ میرے حال عبرت خیز سے اور اُنکی ہمت ٹوٹ جائیگی اور وہ دعوے الفت سے دست بردار ہو جائینگے اس سے معلوم ہوا کہ تمھیں اُنسے دوستی نہیں ورنہ ایسا نہ کرتے شعر میں کس شاعرانہ ہے - ۱۳ مجھے حسرتِ دیدار میں اسقدر محویت رہی کہ آسانی سے جان نکل گئی اور موت کی تکالیف کا احساس تک نہ ہوا - نہ سوجھا = احساس نہ ہوا

داغ خوں سے میرے وہ حیراں ہوا
دامن الجھا ہے گُلِ بے خار سے

چھوڑ جلد اے بوالہوس سرکو کہ اب
جھانکتے ہیں روزنِ دیوار سے

فصد کی حاجت مجھے کیا چارہ گر
بہ گیا خوں دیدۂ خونبار سے

مال کیا جاں بھی دے کر بوالہوس
گر بنے تو دل چھڑا لوں یار سے

مت کرو کنگھی نہ یہ دزدِ حنا
دل چُرا لے طرۂ طرّار سے

آہ دورِ چرخ کی کیا خاک اُڑائے
فتنہ برپا ہے تری رفتار سے

کھا گیا جاں آکے دو دل اسکو نکال
میں نہیں خوش صحبتِ غمخوار سے

یوں کہے درد آیا اپنی چیز کا
حال دل گر پوچھئے دلدار سے

گر نصیحت گر یہی سچ ہوں سادہ لوح
تو نبھے گی خوب اُس عیّار سے

کیوں نہ کاٹیں لب اطبا مرگیا
حال پوچھا تھا ترے بیمار سے

وعدہ کرکے وہ نہ آئے نامہ بر
تو نے پوچھا ہوگا تکرار سے

۔ داغ خوں کو گل سے تشبیہ دیجاتی ہے مگر اسقدر فرق ہے کہ اس گل میں خار نہیں ہوتا۔ قاتل اپنے دامن پر میرے خون کا داغ دیکھکر حیران ہے۔ گویا اُس کا دامن ایسے گل سے اُلجھ گیا ہے جس میں خار نہیں۔ خیال میں ندرت ہے۔ ۔ وہ پردہ نشین روزن دیوار سے جھانک رہا ہے۔ اے رقیب جلد اپنا سر پھوڑ کہ اُسکے ذوق تماشا کے لئے کچھ سامان چاہئے۔ مبادا اُسکی زحمتِ نظر رائگاں جائے۔ ۔ میری آنکھوں سے خون بہ گیا اور جو فصد کا مقصد تھا حاصل ہو گیا۔ ۔ دزد حنا = مہندی کا چور۔ ہاتھ کی ہتھیلی = سفیدی جو حنا لگانے کے بعد ہاتھ میں رہ جائے۔ طرۂ طرّار = زلف چالاک۔ طرّار گرہ کٹ کو بھی کہتے ہیں۔ میرا دل تمھاری زلف میں ہے۔ کنگھی کرنے میں یہ خوف ہے کہ ہاتھ میں جو دزد حنا ہے وہ زلف سے دل نہ چُرا لے۔ ۔ میری آہ دورِ چرخ کو کیا تباہ کرے۔ کیونکہ اصل میں تو تیری رفتار سے دنیا میں فتنہ بپا ہے۔ اُسکا کیا علاج ہوگا۔ فتنۂ چرخ مٹ گیا تو کیا اور قائم رہا تو کیا۔ ۔ ہمدم (یا ناصح) سے میں خوش نہیں۔ تم آؤ تاکہ میں اسکو نکال دوں اور تمھاری موجودگی میں اسکی غمخواری کی ضرورت نہ رہے۔ ۔ نصیحت گر (ناصح) نے کہا کہ تم سادہ لوح ہو۔ تم کو اس عیّار (معشوق) سے دور رہنا چاہئے۔ مبادا اُسکے دام میں گرفتار ہو جاؤ۔ عاشق جواب دیتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو خوب نبھے گی کیونکہ سادہ لوحی کی وجہ سے مجھے اُسکی عیّاریوں کا احساس کیوں ہونے لگا۔ ۔ تیرے بیمار ناتواں سے اطبا نے حال پوچھا ہی تھا کہ وہ اس صدمے سے مرگیا۔ لب کاٹنا = افسوس کرنا۔

دستِ [11] قاصد کاٹے کیوں ثابت ہے کیا
دزدیِ مضمون مرے طومار سے

ہائے [12] بختِ خفتہ کی یوں جھپکی آنکھ
دشمنوں کے طالعِ بیدار سے

مجھ سے وہ چھپتے پھریں اسکے سوا
اور حاصل عشق کے اظہار سے

کہہ غزل اک اور بھی مومن کہ ہے
شوق اُس بت کو ترے اشعار سے

۱۷۳

زہر [1] ٹپکے ہے نگاہِ یار سے
موت سوجھی نرگسِ بیمار سے

قتل ہو کر ہم بچے آزار سے
عمر کے دن کٹ گئے تلوار سے

جابجا [2] نہریں ہیں جاری میں نے اشک
پونچھے ہوں گے دامنِ کہسار سے

گر نہ [3] کھیلیں جان پر جی ہار دیں
عشق بازی سیکھئے اغیار سے

لاغری [4] سے زندگی مشکل ہوئی
ہے گراں تر جان جسمِ زار سے

کر [5] علاجِ جوشِ وحشت چارہ گر
لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

---

[11] شرع میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے۔ طومار = خط۔ مکتوب۔ [12] آنکھ جھپکنے سے یہاں خفیف و خجل ہونا مراد ہے۔

۱۷۳ [1] محبوب کی نگاہ سے زہر ٹپکتا ہے (یعنی اُسکی نظر ہلاکت آفریں ہے) گویا اُسکی نرگس بیمار (آنکھ) سے ہمیں اپنی موت نظر آ رہی ہے۔ [2] قاعدہ ہے کہ اشک دامن سے پونچھے جاتے ہیں۔
[3] جان پر کھیلنا = جان دے دینا۔ جی ہار دینا = ہمت ہارنا۔ دوسرے مصرع میں طنز کا پہلو ہے۔ [4] جسم زار کی لاغری کا یہ عالم ہے کہ جان (جیسی لطیف شے) بھی اُسکے مقابلے میں بھاری ہے۔ اسوجہ سے زندگی دشوار ہے۔ جان کے گراں تر ہونے میں یہ مفہوم ہے کہ اب جسم نحیف اُسکے برداشت کرنے کے قابل نہیں۔
[5] میرے جوش وحشت کا علاج صرف جنگل میں ممکن ہے۔ اگر علاج کرتا ہے تو بازار سے جنگل لا دے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے یہ محال ہے ویسے ہی تیرے ہاتھ سے میرے جنوں کا افاقہ پذیر ہونا محال۔

ذکرِ[۱] اشکِ غیر میں رنگینیاں — بوئے خوں آئی تری گفتار سے

عشق[۲] میں ناصح بھی ہے کیا مدعی — جرم ثابت ہو گیا انکار سے

چھڑکے[۳] ہے کانِ ملاحت لون کیا — خود لپٹ جا سینۂ افگار سے

گر دعا کرتا ہوں مومن وصل کی — ہاتھ باندھے ہے وہ بُت زنار سے

۱۷۴

ہے نگاہِ لطف دشمن پر تو بن ہی جائے ہے — یہ ستم اے بیمروت کس سے دیکھا جائے ہے

سامنے سے جب وہ شوخِ دلربا آ جائے ہے — تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

حالِ دل کیونکر کہوں میں کس سے بولا جائے ہے — سر اُٹھے بالیں سے کیا کچھ جی ہی بیٹھا جائے ہے

جاں نہ کھا وصلِ عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں — جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

رشکِ دشمن نے بنا دی جان پر اے بیوفا — کب تلک کوئی نہ بگڑے حال بگڑا جائے ہے

[۱] تو غیر کے گریۂ محبت کا ذکر اس قدر رنگ آمیزی سے کرتا ہے کہ میرا دل رشک سے خون ہوا جاتا ہے۔ گویا تیری باتوں سے مجھے خون کی بو آتی ہے۔

[۲] ناصح منکرِ محبت ہے (عشق کا قائل نہیں) اُسکے انکار سے اُسکا جرم ثابت ہے۔ یعنی یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا کہ وہ بھی مدعی (رقیب) ہے ورنہ اپنی پند و نصیحت سے مجھے عشق سے کیوں باز رکھتا۔ انکار سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ ناصح کہتا ہے کہ میں صرف تمہارے بھلے کے لئے نصیحت کرتا ہوں ورنہ مجھے معشوق کی محبت سے سروکار نہیں کہ تمہارے ترکِ عشق سے مجھے ذاتی مفاد مدِ نظر ہوتا۔ اس انکار سے عاشق کی بدگمانی بڑھتی ہے۔

[۳] کانِ ملاحت = محبوب جو سرتاپا ملاحت (نمک) ہے۔ اگر تجھے زخم پر نمک چھڑکنے میں لطف آتا ہے تو اُسکی آسان تدبیر یہ ہے کہ تو خود میرے زخمی سینے سے آکر لگ جا کیونکہ تو ہمہ تن کانِ نمک ہے اس طرح تیری تمنائے ستم پوری ہو جائیگی۔ مکر شاعرانہ ملاحظہ ہو۔

تلخ کام[۱] عشق شیریں لب جئے تو کیا ہوا
شور بختی سے مزا ہی زندگی کا جائے ہے

حسن روز افزوں یہ غرہ کس لئے اے ماہرو
یوں ہی گھٹتا جائے گا جتنا کہ بڑھتا جائے ہے

پونچھے[۲] آنسو وارثوں کے کیا کروں اب ہائے ہائے
داغ میرے خون کا دامن سے چھوٹا جائے ہے

غیر[۳] کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں
کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

تاب و طاقت صبر و راحت جان و ایماں عقل و ہوش
ہائے کیا کہئے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے

رو رہا[۴] ہوں خندۂ دنداں نما کی یاد میں
آب گوہر کے لئے آنکھوں سے دریا جائے ہے

خاک میں مل جائے یارب بیکسی کی آبرو
غیر میری نعش کے ہمراہ روتا جائے ہے

اب تو مرجانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو
ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے

پند گو اب تو ہی فرما کس کو سودا ہے یہ کون
اور کی سنتا نہیں اپنی ہی بکتا جائے ہے

دیکھئے[۵] انجام کیا ہو مومن صورت پرست
شیخ صنعاں کی طرح سوئے کلیسا جائے ہے

۱؎ تلخ کام عشق شیریں لب = معشوق شیریں لب کے عشق میں گرفتار مصیبت۔ شور بختی = بدنصیبی۔ تلخ کام شیریں۔ شور۔ مزہ میں رعایت ہے۔ ۲؎ دامن قاتل سے آنسو پونچھنے میں میرے خون کا داغ چھوٹا جاتا ہے داغ چھوٹنے میں حقیقی اور مجازی (یعنی جرم کا ہلکا ہونا) دونوں پہلو مدنظر ہیں۔ ۱۰۴

۳؎ یعنی مجھے حیرت ہے کہ دوست کی پیشوائی کے لئے فرط خوشی سے میری جان نکلی جارہی ہے یا دشمن کی معیت کے رشک سے صدمے کے باعث۔ ۴؎ دنداں کی رعایت سے آب گوہر اور رونے کی مناسبت سے دریا استعمال کیا ہے رونے اور خندہ میں تضاد اور آب گوہر اور دریا میں ایہام تناسب ہے۔

۵؎ شیخ صنعاں ایک بزرگ تھے جو سفر حج کے دوران میں عشق خانہ خراب کے ہاتھوں مجبور ہو کر دین مسیحی میں داخل ہوگئے تھے۔ "صورت پرست" میں یہ نکتہ ہے کہ مسیحیوں کے کلیسا (کیتھولک چرچ) میں تصویروں کی پرستش کی جاتی ہے۔

۱۷۵

ہوئی تاثیر آہ و زاری کی
رہ گئی بات بیقراری کی

شکوۂ دشمنی کریں کس سے
واں شکایت ہے دوستداری کی

مبتلائے شبِ فراق ہوئے[1]
ضد سے ہم تیرہ روزگاری کی

یاد آئی جو گرمجوشی یار[2]
دیدۂ تر نے شعلہ باری کی

کیوں نہ ڈر جاؤں دیکھ کر وہ زلف
ہے شبِ ہجر کی سی تاریکی

یاس[3] دیکھو کہ غیر سے کہدی
بات اپنی اُمید واری کی

بسکہ ہے یار کی کمر کا خیال
شعر کی سوجھتی ہے باریکی

کردے روزِ جزا شبِ دیجور
ظلمت اپنی سیاہ کاری کی

تیرے ابرو کی یاد میں ہم نے
ناخنِ غم سے دلفگاری کی

قتل[4] دشمن کا ہے ارادہ اُسے
یہ سزا اپنی جاں نثاری کی

کیا مسلماں ہوئے کہ اے مومن
حاصل اُس بُت سے شرمساری کی

۱۷۵ [1] تیرہ روزگاری (سیاہ بختی) نے ہم سے دشمنی نکالی اور مبتلائے شبِ فراق کر دیا۔ دوسرے معنی یہ کہ تیرہ روزگاری کی ضد پر ہم نے شبِ فراق کو اختیار کیا کہ وہ بھی سیاہ ہے۔ یعنی "غمِ روزگار" سے بچنے کے لئے "غمِ عشق" قبول کیا۔ [2] گرمجوشی (اختلاط) کی رعایت سے شعلہ باری کا لفظ استعمال کیا ہے۔ [3] ہم عشق میں اس قدر مایوس ہو گئے ہیں کہ رقیب سے بھی اپنی آرزو بیان کر دی کیونکہ یہ یقین تھا کہ بر آنے والی نہیں۔ پھر چھپانے سے حاصل مضمون نیچرل ہے۔ [4] یعنی "خنجر آزمائی" کے مستحق تو ہم جاں نثار تھے نہ کہ دشمن۔

۱۷۶ دفن[1] جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے | فلسِ ماہی کے گلِ شمعِ شبستاں ہونگے
ناوکِ انداز جدھر دیدۂ جاناں ہونگے | نیم بسمل کئی ہونگے کئی بے جاں ہونگے
تاب[2] نظارہ نہیں آئنہ کیا دیکھنے دوں | اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہونگے
تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے | ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہونگے
ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم | لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہونگے
کر کے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں | گر وہ ہونگے بھی تو بے وقت پشیماں ہونگے
ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس | ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہونگے
ہم[3] نکالیں گے سن اے موجِ ہوا بل تیرا | اُس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہونگے
صبر[4] یارب مری وحشت کا پڑیگا کہ نہیں | چارہ فرما بھی کبھی قیدیِ زنداں ہونگے
منت[5] حضرت عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی | زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہونگے

۱۷۶ [1] سوختہ ساماں = بے سروساماں - گُلِ شمعِ شبستاں = شمعِ کاشانہ کا گُل - ہم سوختہ ساماں جب زمین میں دفن ہونگے تو ہماری سوختہ سامانی کے اثر سے ماہی زمین کے سِنّے بھی گل شمع کی طرح جلنے لگیں گے یا گل شمع کا کام دینگے - [2] معشوق کے نظارۂ جمال کی کسی کو (حتیٰ کہ خود اُسکو بھی) تاب نہیں - اسلئے میں اُسکو آئینہ نہیں دیکھنے دیتا - مبادا وہ اپنی صورت دیکھکر خود حیران ہو جاے اور پہلے سے زیادہ تصویر بن جاے - واضح رہے کہ تصویر کو شعرا حیران قرار دیتے ہیں - حیرانی سے آئینہ کی مناسبت بھی روشن ہے -

[3] بل نکالیں گے = سیدھا کر دیں گے -

[4] کاش میرے جنوں کا صبر پڑے اور چارہ گر بھی (جنھوں نے مجھ دیوانہ کو زنداں میں قید کر دیا ہے) کبھی قید زنداں میں گرفتار ہوں - [5] مصرع ثانی میں استفہام انکاری ہے - "زندگی" کے لفظ پر زور دیا ہے - یعنی زندگی جیسی بے حقیقت چیز کے لئے کیا شرمندۂ احساں ہونگے -

تیرے[۲] دل تفتہ کی تربت پہ عدو جھوٹا ہے
گُل نہ ہونگے شررِ آتشِ سوزاں ہونگے

غور[۳] سے دیکھتے ہیں طوف کو آہوئے حرم
کیا کہیں اُسکے سگِ کوچہ کے قرباں ہونگے

داغِ دل نکلیں گے تربت سے مری جوں لالہ
یہ وہ اخگر نہیں جو خاک میں پنہاں ہونگے

چاک پردہ سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہونگے

ق
پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہونگے

سنگ[۵] اور ہاتھ وہی وہ ہی سر و داغ جنوں
وہ ہی ہم ہونگے وہی دشت و بیاباں ہونگے

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

۱۷۷
سینہ[۱] کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اُٹھے
کیا علَم دھوم سے تیرے شہداکے اُٹھے

آج اُس بزم میں طوفان اُٹھا کے اُٹھے
یاں تلک روئے کہ اُس کو بھی رُلا کے اُٹھے

دل سے کیونکر یہ دھواں ساتھ ہوا کے اُٹھے
شعلہ ہائے تپِ غم سینہ جلا کے اُٹھے

۲؎ پہلے مصرع میں تعقید ہے۔ دشمن نے محبوب کو خبر دی کہ تیرے دل تفتہ (عاشق دل سوختہ) کی تربت پر گل پڑے ہوئے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔ سوزِ عشق کی لذت کیا جانے۔ عاشق کی قبر پر گُل نہ ہونگے۔ آتشِ دل کی چنگاریاں ہونگی جو مدفن سے باہر آگئی ہیں۔ ۳؎ آہوئے حرم = حرم تک کے ہرن جنکو شکار کرنا ممنوع ہے۔ آہوانِ حرم زائرانِ کعبہ کے طواف کو غور سے دیکھتے ہیں۔ کہیں اُنکا مقصد یہ نہ ہو کہ طرز طواف سیکھکر اُس کافر کے سگِ کوچہ کے گرد پھریں اور اپنے آپکو قربان کردیں۔ ۵؎ یہ اور شعر ما قبل قطعہ بند ہیں۔ اُدھر اطفال کے ہاتھ ہونگے اور سنگ ہونگے جن سے دیوانہ کو ماریں گے۔ اِدھر دیوانہ کا سر ہوگا اور اُس پر زخموں کے داغ ہونگے۔

۱۷۷ ۱؎ جس وقت تیرے شہیدانِ محبت کے علَم اُٹھے تو اہلِ ماتم نے اُنکے غم میں اسقدر سینہ کوبی کی کہ زمین ہلنے لگی۔

۱ گر نہ ہو دل میں خیالِ نگہِ خواب آلود
درد کیا کیا اثرِ خفتہ جگا کے اُٹھے

۲ شمع کے چور کا محفل میں جو مذکور ہوا
دل چرا بیٹھے تھے جب آنکھ چرا کے اُٹھے

۳ گو کہ ہم صفحۂ ہستی پہ تھے اک حرفِ غلط
لیک اُٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اُٹھے

ہو عذابِ شبِ ۴ یلدا ۵ سے رہائی یارب
زلف منہ سے کہیں اس مہرلقا کے اُٹھے

اُف رے گرمیٔ محبت کہ ترے سوختہ جاں
جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اُٹھے

ہیں دکھاتا تمہیں تاثیر مگر ہاتھ مرے
ضعف کے ہاتھ سے کب دستِ دعا کے اُٹھے

سوزشِ دل سے ہوا کیا ہی ہیں ہائے ہائے
وہ جو پہلو سے پسینے میں نہا کے اُٹھے

جی ہی مانند نشانِ کفِ پا بیٹھ گیا
پاؤں کیا کوچے سے اس ہوش ربا کے اُٹھے

۶ شعر مومن کے پڑھے بیٹھ کے اسکے آگے
خوب احوال دلِ زار سُنا کے اُٹھے

۱ میں صرف اسوجہ سے نہیں تڑپتا کہ محبوب کی نگاہ خواب آلودہ کا خیال ہے۔ اگر اُسکی نیند میں خلل پڑنے کا اندیشہ نہ ہو تو درد اس طریقہ سے اُٹھے کہ سویا ہوا اثر بھی جاگ جائے (یعنی محبوب کے دل میں تاثیر کرے)

۲ شمع کا چور = دزدِ شمع۔ شمع کا گل کاٹنے کے بعد جو ریشہ باقی رہجائے۔ معشوق جو میرا دل چرا چکا تھا دزدِ شمع کا ذکر سنتے ہی محفل سے خفیف ہوکر اُٹھ گیا۔ مثل مشہور ہے کہ چور کی داڑھی میں تنکا۔ ۳ نقش بٹھانا = اثر قائم کرنا۔ ۵ یلدا = سب سے لمبی اور اندھیری رات جو ایکبار ہر سال پوس کے مہینے میں پڑتی ہے۔ یہاں زلفِ سیاہ سے عارضِ روشن کے چھپ جانے کو شبِ یلدا سے تعبیر کیا ہے

۶ مراد یہ ہے کہ مومن کے اشعار حالیہ ترجمان واردات دل ہوتے ہیں " جو سنتا ہے اُسی کی داستان معلوم ہوتی ہے" ہم نے اس بہانے سے دوست کو اپنا حال دل سُنا دیا۔

۱۷۸
منہ[۱] کو نہ سیا ناصح کی بخیہ گری اتنی
لوں میں بھی ابھی لتے ہیں پردہ دری اتنی

تم اُٹھ[۲] گئے محفل سے ذکر آتے ہی مجنوں کا
سایہ سے مرے وحشت لے رشک پری اتنی

دل لے کے وفا کیسی پر قول تو دینا تھا
اے سیمتن آفت ہے تو مفت[۳] بری اتنی

بے پردہ پسِ چلون یکبار تم آ بیٹھے
ہے تاب نظر کس کو کیوں جلوہ گری اتنی

لازم[۴] تھا حذر مجھ سے ناچیز کے نالوں سے
پر تجھ کو کہاں غیرت لے بے اثری اتنی

لو[۵] چھیڑے ہے نکہت کو گلہائے شبینہ کی
اب تم سے بھی چل نکلی بادِ سحری اتنی

یہ[۶] کون کہے اُس سے کی ترک وفا میں نے
کر تو ہی ذرا ناصح پیغامبری اتنی

کیا[۷] ہو گئی خود بینی اب غیر سے چشمک ہے
یا خوش نگہی وہ کچھ یا بد نظری اتنی

۱۷۸ [۱] لتے لینا = خبر لینا - ہیں کلمہ تنبیہ ہے - یعنی کیوں میرے راز محبت کی پردہ دری کر رہا ہے - میرے چاک گریباں کو تو نے سیا مگر اپنے منہ کو نہ سیا ہے شرط جو ابھی تیری خبر لوں [۲] جنوں کے باب میں عاشق اپنے کو اصل اور مجنوں کو اپنا سایہ قرار دیتا ہے مجنوں - سایہ - وحشت - پری میں رعایت ہے - [۳] مفت بری = مفت اُڑا لے جانا - اگر ہے تو اتنی مفت بری ضرور آفت ہے (۱) [۴] یعنی سب نے (جتنی کہ اثر نے) حقیر سمجھ کر مجھ سے کنارہ کیا مگر اسے بے اثری تو بے غیرت ہے کہ میرے نالوں کا ساتھ نہیں چھوڑتی - مگر شاعرانہ ہے (۱) "تو" کو ضمیر مخاطب بھی کہہ سکتے ہیں -
[۵] لو باد سحری تم سے بھی شوخیاں کرنے لگی کہ تمھارے رات کے باسی ہار کے پھولوں کو چھیڑتی ہے یعنی پھولوں کی نکہت کو اڑائے پھرتی ہے کہ شب گذشتہ کے عیش کی پردہ دری کر کے تمھیں خجل کرے - [۶] اصلاً ترک وفا مقصود نہیں بلکہ شاید شوخی سے ناصح کی نصیحت قبول کرنے کا ادعا کیا ہے اور اُسکو پیغامبر بنانا چاہا ہے تاکہ وہ خود جا کر جمال جاناں کی تجلی دیکھ لے اور آئندہ عاشق کو عشق میں معذور سمجھے -
[۷] تم ہر وقت غیر سے نظر بازی کرتے ہو - وہ تمھاری خود بینی اب کہاں گئی ہے

کہتا۸ ہے مرے آگے وہ مجھ پہ عدو غش ہے ۔۔۔ ہے ہے مری الفت سے سہے بےخبری اتنی

سجدہ۹ نہ کہیں کرنا مومن قدم بت پر
کعبے ہی میں ہوتی ہے بیہودہ سری اتنی

۱۷۹

پھر وہ وحشت کے خیالات ہیں سر میں پھرتے ۔۔۔ دشت یاد آتے ہیں آہو ہیں نظر میں پھرتے

واہ۱۰ اے طالع برگشتہ کہ وہ پھر ہی گیا ۔۔۔ آنکر دیکھ مجھے راہ گذر میں پھرتے

پھرتے۱۱ دن اپنے تو غیروں کی طرح راتوں کو ۔۔۔ کیسے ہم کوچۂ مہتاب قمر میں پھرتے

عطر۱۲ غیروں کو لگا کر جو رُلایا اُس نے ۔۔۔ تر مرے سے ہیں مرے دیدۂ تر میں پھرتے

منتظر کس کے یہ رہتے ہیں کہ ہم ہر شب کو ۔۔۔ تا سحر شام سے اُٹھ اُٹھ کے ہیں گھر میں پھرتے

ہے۱۳ زباں بند اثر دل سے شبِ وصل میں اور ۔۔۔ فکر سو سو ہیں دلِ مرغ سحر میں پھرتے

قلق۱۴ دل سے ہے جنبش ترے پیکانوں کو ۔۔۔ پوچھ مت حال کہ برمے سے ہیں بر میں پھرتے

۸ اگر اسے میری محبت کا اندازہ ہوتا تو غیر کی فریفتگی کا یوں اظہار نہ کرتا۔ ۹ یہ شعر گویا دوسرے کی زبان سے ادا کیا ہے۔ مومن کو سجدۂ بت سے انکار ہے۔ معترض کہتا ہے کہ خیر تمھیں ضد ہے تو قدم بت پر سجدہ نہ کرنا۔ سچ ہے اس قسم کی لغویات (سجدہ وغیرہ) تو کعبے ہی میں ہوا کرتی ہیں۔ نعوذ باللہ منہ۔ شعر کا لہجہ سخت طنزیہ ہے۔ ۱۰ میں انتظار یار میں رہ گذر میں پھر رہا تھا۔ اسکا اثر یہ ہونا چاہئے تھا کہ محبوب میرے وفور شوق کی قدر کرتا۔ مگر میرے نصیب کی برگشتگی دیکھئے کہ وہ مکان پر میری عدم موجودگی کا بہانہ تلاش کر کے اپنے گھر واپس چلا گیا۔ اور میرے یہاں نہ آیا ۱۱ اگر ہمارے دن اچھے ہوتے تو دیکھتے کہ ہم بھی کس آزادی سے (کیسے) راتوں کو رقیبوں کی طرح اُس قمر لقا (محبوب) کے کوچے میں پھرتے۔ اگر غیروں سے بیگانے مراد لیں اور کیسے بمعنی

کاہے کو ہو تو یہ معنی ہونگے کہ ہم کاہے کو شب میں بیگانوں کی طرح اُسکے کوچے میں پھرتے اور اُسکی محفل ناز سے محروم رہتے۔ ۱۲ معشوق نے رقیبوں کے عطر لگا کر مجھے جو رشک سے رُلایا ہے تو میرے دیدۂ تر میں ترمرے سے پھرتے ہیں ترمرے ضعف کی وجہ سے آنکھوں کے آگے جو تارے سے نظر آتے ہیں نیز چکنائی کے داغ جو پانی کے اوپر نظر آئیں۔ عطر اور دیدۂ تر کی مناسبت سے دوسرے معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ ۱۳ آسمان کی دشمنی کا تقاضا تو یہ تھا کہ میرے شب وصل میں ہر شام سے مرغ سحر بولنے لگتا مگر نہ بولنے کا سبب یہ ہے کہ میرے دل کی تاثیر سے اسکی زبان بند ہو گئی ہے۔ اگرچہ اسکے دل میں سو سو خیال آ رہے ہیں کہ کسطرح عاشق کی شب عیش کا خاتمہ ہو۔ ۱۴ بر = پہلو۔ میرے پہلو میں تیرے تیر پیوست ہیں جو دل کی تڑپ سے جنبش کرتے ہیں اسوجہ سے میرے پہلو میں وہ تکلیف ہے جو برمے کے گھمانے سے ہو سکتی ہے

۱۷۹

ایک[۶] دم گردشِ ایام سے آرام نہیں	گھر میں ہیں تو بھی ہیں دن رات سفر میں پھرتے
گر گئے تھے تو تسلی کو مری کہہ جاتے	کہ اب آتا ہوں وہ گو آٹھ پہر میں پھرتے
زرد[۷] رخ رنگ طلائی کے ہوئے دیوانے	کیمیا ساز بھی ہیں خواہشِ زر میں پھرتے
شرمگیں[۸] چشم کی گردش جو نہ بھاتی تو	خاک یوں کاہے کو ہم ڈالتے سر میں پھرتے

جنبشِ[۹] نرگسِ جنت نے رلایا مومن
چشمِ کافر کے اشارے ہیں نظر میں پھرتے

پامال[۱] اک نظر میں قرار و ثبات ہے	۱۸۰	اُس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے
پیغامبر رقیب سے ہوتے ہیں مشورے		سنتا نہیں کسی کی یہ کہنے کی بات ہے
چھوٹ[۲] کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی		ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

۶ہ ہمیں گھر میں بھی سفر کی سی صعوبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ "گردش ایام" سے کسی وقت راحت نہیں گردش کو سفر سے تعبیر کیا ہے۔ ۷ہ زرد رخ سے یہاں چمپئی رنگ حسین مراد ہیں اور اسی مناسبت سے انکو کیمیا ساز قرار دیا ہے کہ زرد (چمپئی رنگ) رکھتے ہیں۔ چمپئی رنگ والے حسین بھی معشوق کے کندنی رنگ کے دیوانے ہو گئے۔ گویا کیمیا ساز بھی زر کی جستجو میں پھرتے ہیں۔ رنگ طلائی کی مناسبت سے زر کا لفظ استعمال کیا۔ ۸ہ سر کی مناسبت خاک سے اور گردش کی مناسبت پھرنے سے ظاہر ہے۔ ۹ہ جنت میں نرگس جنت کی جنبش دیکھکر چشم کافر کے غمزے یاد آتے ہیں اور رونا آتا ہے

۱۸۰ ۱ہ محبوب کا میری طرف نہ دیکھنا بھی نگہ التفات کا حکم رکھتا ہے کیونکہ اگر وہ ادھر دیکھتا تو میرا قرار و ثبات پامال ہو جاتا۔ ۲ہ ناصح عاشق کو ترک محبت کی ترغیب دیتا ہے تاکہ بندِ غم سے رہائی ہو۔ وہ جواب دیتا ہے کہ بندِ غم میرے حق میں بمنزلہ قید حیات ہے اسلئے اگر بندِ غم سے چھوٹ گیا تو میرا جینا محال ہے۔ مرزا نے بھی یہ مضمون فلسفیانہ انداز میں باندھا ہے مگر لطف تغزل نہیں قید حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں + موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

کیا یوں ہی جائے گی مری فریاد سرزنش؎ / واعظ کو روزِ حشر امید نجات ہے

بد نامیوں؎ کے ڈر سے عبث تم چلے کہیں / ہوں تیرہ روز میری سحر بھی تو رات ہے

لکھا؎ جو اُس کو خط میں بلانوشیوں کا شکر / بالیدگی سے جوں خمِ گردوں دوات ہے

کیا؎ مال ہیں کہ جان و دیں دیتے ہیں دم تمھیں / اغیار بوالہوس کی یہی کائنات ہے

کیا ابتدائے حسن میں میں تجھ پہ مر گیا / خلقت کا تیری دن مرا روزِ وفات ہے

چھوٹی؎ شراب اپنی مجھے مرتے دم تو دے / یہ آبِ تلخ شربتِ قند و نبات ہے

کیونکر؎ خدا کو دوں کہ بتوں کو ہے احتیاج / مومن یہ نقدِ دل زرِ جاں کی زکات ہے

؎ واعظ مجھے سرزنش (ملامت) کرتا ہے اور میں اُسکے طرزِ عمل پر فریاد۔ اب واعظ کو جو حشر میں اپنی نجات کی اُمید ہے تو کیا اُس نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ میری فریاد یوں ہی رائگاں جائیگی۔ ؎ تم صبحِ شبِ وصال بدنامی کے خیال سے کیوں جا رہے ہو۔ میں تو ازلی تیرہ روز (سیاہ بخت) ہوں اور میری صبح بھی رات کی طرح تاریک ہے۔ پھر بدنامی کا کیا ڈر۔ تیرہ روز ہونے کی بنا پر اپنی سحر کو رات قرار دیا ہے۔ ؎ بلانوشی = کثرت مے نوشی۔ میں نے اپنی کثرتِ شرابخواری کا شکر جو دوست کو تحریر کیا تو اُسکے اثر سے دوات بڑھکر خمِ گردوں کے برابر ہوگئی یعنی چونکہ بلانوشی میں کثرت کا مفہوم داخل ہے۔ اسلئے ہر چیز میں بالیدگی آگئی حتیٰ کہ دوات میں بھی بلانوشی اور خم کی مناسبت ظاہر بعض نسخوں میں شکر کی جگہ ذکر ہے۔ ؎ کیا مال ہیں = کیا چیز ہیں۔ دم دیتے ہیں = دھوکا دیتے ہیں۔ ؎ آبِ تلخ سے شراب مراد ہے۔ کہ تلخ ہوتی ہے یعنی مجھے شربت کی طرح مرغوب ہے۔ قاعدہ ہے کہ مرتے وقت مُنہ میں شربت ٹپکاتے ہیں ؎ میرا نقدِ دل زرِ جاں کی زکوٰۃ ہے یعنی جان (جو بمنزلہ راس المال ہے) کے مقابلہ میں دل کی حقیقت زکوٰۃ سے زیادہ نہیں۔ اب یہ دل خدا کو کیونکر دوں وہ تو بے نیاز ہے۔ ہاں بتوں کو دینا چاہیئے کہ اُنکو اس (دل) کی احتیاج ہے اور زکوٰۃ محتاج ہی کو دیجاتی ہے نہ کہ غنی کو۔

۱۸۱ ۱؎ نہ دینا بوسۂ پا گو فلک جھکتا زمیں پر ہے — کہ یہ اُتنا زمیں کے نیچے ہے جتنا زمیں پر ہے

۲؎ تڑپتا ہے پڑا شوقِ شہادت خاک و خوں میں — گرا کوچے میں تیرے یہ لہو کس کا زمیں پر ہے

خرامِ ناز نے کس کے جہاں کو کر دیا برہم — زمیں گرتی فلک پر ہے فلک گرتا زمیں پر ہے

۳؎ تری دُوری میں بھی کیا جا کے جاں اس پاس جاتا ہے — کہ جس نے آسماں پر سے اُسے پٹکا زمیں پر ہے

۴؎ رہا اس کو میں مٹی یار لیجائیں تو لیجائیں — کہ پڑتا پاؤں مانندِ نشانِ پا زمیں پر ہے

۵؎ تو یہ قتل سے بھی ہو دلِ مضطر کو کیا تسکیں — کہ قدرِ نیم رقصِ مرغِ بسمل جا زمیں پر ہے

مری فریاد سن کہتا ہے اسرافیل۶؎ حیرت سے — قیامت آگئی کیونکر یہ غل کیسا زمیں پر ہے

۷؎ گلہ ہے گردشِ چشمِ سیہ کا تیرے وحشی کو — کہ تنگی سے سدا ہے یہ فلک لکھتا زمیں پر ہے

وہ سر جو کل ترے زانو پہ تھا سو آج اے ظالم — کبھی رہتا ہے پتھر پر کبھی رہتا زمیں پر ہے (کبھو)

۱۸۱ ۱؎ کسی شخص کی عیاری کا ذکر کرتے ہیں تو کہا کرتے ہیں کہ یہ جتنا اوپر (نمایاں) ہے اُتنا ہی نیچے (گہرا) ہے۔ آسمان کی نسبت قدیم ہیئت کا خیال تھا کہ یہ زمین کے اوپر اور نیچے انڈے کی سفیدی کی طرح محیط ہے۔ چنانچہ شاعر معشوق سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اگرچہ آسمان بطور خوشامد زمین پر جھکتا ہے تاہم اسکو اپنے پاؤں کا بوسہ نہ دینا۔ کیونکہ یہ عیار ہے۔ اس کی ظاہری عاجزی کا کیا اعتبار۔

۲؎ تیرے کوچے میں کس (رقیب) کا لہو زمین پر گرا ہے کہ میرا شوقِ شہادت اُس (لہو) کو دیکھکر خاک و خون میں تڑپ رہا ہے یعنی میں بے تاب ہوں کہ یہ سعادت مجھے کیوں نہ ملی۔

۳؎ شاعر ہجر میں اپنے نہ مرنے کی توجیہ کرتا ہے کہ اگر مر جاؤں گا تو اُس (خدا) کے پاس جانا ہوگا جس نے اس جان کو آسمان سے زمین پر دے پٹکا یعنی دنیا میں بھیجا۔ جب پہلے ہی اُس نے میری جان کی قدر نہ کی تو اب کیا کرے گا۔

۴؎ میں تو اب کوئے یار کا ہو رہا۔ ہاں مرنے کے بعد اگر احباب چاہیں تو میری مٹی لے جائیں۔ زندگی میں محال ہے کیونکہ جس طرح نشانِ قدم گر کر نہیں اُٹھتا میرا پاؤں بھی اُس کوچے کی زمین سے نہیں اُٹھتا۔ ۵؎ زمین میں اس قدر وسعت نہیں کہ مرغِ بسمل کے نیم رقص کے لئے جگہ نکل سکے اسلئے میرے دل مضطر کو مژدۂ قتل سنکر بھی تسکین نہیں کیونکہ قتل کے بعد تڑپنے کے لئے گنجائش کہاں آئیگی۔ ۶؎ اسرافیل = ایک فرشتہ کا نام جو قیامت کو صور پھونکے گا اور تمام کائنات درہم برہم ہو جائیگی۔ ۷؎ تیرا دیوانہ تنگ آکر زمین پر یہ تحریر "فلک" لکھتا ہے مگر اصل میں اسکو فلک کی نہیں بلکہ تیری چشمِ سیاہ کی گردش کی شکایت مقصود ہے کیونکہ اُس کے نزدیک فلک بھی چشمِ سیاہ کے اشاروں پر چلتا ہے۔ زمین پر لکھنا علامت جنوں ہے مجنوں کی نسبت بھی ایسا ہی قصہ مشہور ہے۔

فرشتو لیچلے اُس کو سے کیوں جنت میں تم مجھکو ۔۔۔ بھلا کیا ساکنانِ چرخ کا دعوی زمیں پر ہے

ہوا [۵۹] مُہرِ براتِ عفو نقشِ سجدہ مومن کو
قدم رکھتا فلک پر ہے کہ سر رکھتا زمیں پر ہے

۱۸۲
مجھے یاد آگئی بس وہ ہیں اُسکے قد و قامت کی ۔۔۔ چمن میں دیکھکر گل سرو میں نے کیا قیامت کی
دیا [۶۰] ظالم کو دل جاں غیر کو آرام وحشت کو ۔۔۔ کسی کا شکوہ کیا کیجے یہ خوبی اپنی قسمت کی
ستم پیشہ ہے بدخو ہے ستمگر ہے جفا جو ہے ۔۔۔ کروں کیا کیا شکایت دوستو اُس بے مروّت کی
ہوئے [۶۱] ہیں حسرتِ دیدار میں خوں روتے روتے ہم ۔۔۔ عجب کیا ہے جو نکلے سرخ نرگس اپنی تربت کی
مبارک [۶۲] خفتگانِ خاک کو تصدیع بیداری ۔۔۔ کہ گورِ تیرہ سے یاد آئی مجھکو رات فرقت کی
جفا کا شکوہ اب کیوں جو کیا اچھا کیا اُس نے ۔۔۔ سزا ہے اے دلِ ناداں اس الفت اس محبت کی
تری [۶۳] دل گرمیاں آخر جلا رہونگی غیروں کو ۔۔۔ کہ دوزخ نے قسم کھائی ہے میرے سوزِ غیرت کی

۵۹ برات = روپیہ کا چک۔ دستاویز۔ سجدہ کا نقش مومن کے لئے فرمان مغفرت کی مُہر بن گیا یعنی باعث بخشش ہو گیا گویا مومن کا زمین پر سجدے کے لئے سر رکھنا آسمان پر پاؤں رکھنے کا حکم رکھتا ہے۔ آسمان پر پاؤں رکھنے میں حصول افتخار و شرف کا مفہوم ہے۔ نقش سجدہ کو مہر سے تشبیہ دی ہے۔

۱۸۲ ۶۰ ہم نے ظالم (معشوق) کو دل۔ رقیب کو جان اور جنون کو اپنا آرام دے ڈالا۔ قسمت بمعنی تقدیر بھی ہے اور بمعنی تقسیم بھی اسلئے شاعر نے اس لفظ سے خاص فائدہ لیا ہے۔ ۶۱ حسرتِ دیدار کی رعایت سے نرگس اور خون رونے کی مناسبت سے سُرخ استعمال کیا ہے۔ ۶۲ خفتگان خاک = اہل قبور۔ تصدیع تکلیف۔ چونکہ گور تیرہ و تاریک شبِ ہجر سے مشابہ ہے اسلئے قبر میں پہونچکر مجھے شبِ ہجر یاد آئی اور میں آمادۂ فریاد ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام مردے میرے نالوں سے جاگ اُٹھیں گے۔ "مبارک" میں جو طنز ہے قابل داد ہے۔ ۶۳ دل گرمی = اختلاط۔ گرم جوشی۔ میرا سوزِ رشک اس حد تک پہونچ گیا ہے کہ آتش دوزخ بھی اُس کو مانتی ہے اور اُسکی قسم کھاتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر تو رقیبوں سے گرم جوشی کریگا تو میں غیرت سے جلونگا بالآخر ایک دن یہی میرا سوزِ غیرت اُنکو پھونک دیگا۔

مژدہ خوابِ عدم کا بیستوں کو کاٹ کر پایا
ملی فرہاد شیریں کام کو راحت یہ محنت کی

گلہ کیا کیجیے اس بدگماں عیارِ پرفن کا
کہ عرضِ حال سے جسکو شکایت ہو شکایت کی

یہی مذہب ہے اپنا بھی جو قیس و کوہکن کا تھا
نئی راہ افترا ہے کب بھلا مومن نے بدعت کی

۱۸۳ وہ گردن دیکھ یہ حالت ہوئی تغییرِ شیشہ کی
کہ تھمتی ہی نہیں ہچکی ہوئی ہے دیر شیشہ کی

مدام اس دلبرِ میکش کے منہ لگتا ہے اے ساقی
بنائی ہائے کیا اللہ نے تقدیر شیشہ کی

سوا اے محتسب اسکے کہ اپنے دل کی صورت ہے
سزاوارِ شکستن کون سی تقصیر شیشہ کی

اثر اس سنگدل کو کیا ہو عرضِ دل شکستن کا
شکایت ہے مری فریاد بے تاثیر شیشہ کی

مشہور مقولہ ہے کہ محنت کے بعد راحت ہے۔ فرہاد نے یہ محنت جھیلی کہ شیریں کی خاطر کوہ بےستون کو کاٹا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ خوابِ عدم کی راحت میسر ہوئی۔ فرہاد کو شیریں کام اس وجہ سے کہا ہے کہ اسکو مصائبِ زندگی سے آرام ملگیا۔ فرہاد اور شیریں کام میں ایہام تناسب ہے۔ جو میرے عرضِ حال کو شکایت سمجھکر شکایت کرتا ہے۔ مومن نے نئی راہ کب ایجاد کی۔ یہ اسپر افترا ہے۔ اصل میں وہ اسی مذہبِ عشق پر قائم ہے جو قیس و کوہکن کا تھا۔ بدعت کا لفظ خصوصاً مذہب میں نئی بات کو کہتے ہیں۔

۱۸۳ گردنِ معشوق کو صراحی (شیشہ) سے تشبیہ دیجاتی ہے اور ہچکی سے صدائے قلقل مراد ہے۔ دوسرے مصرع میں تعقید ہے۔ یعنی دیر ہوئی ہے۔ شیشہ کی ہچکی تھمتی ہی نہیں۔ محتسب تو جو شیشۂ شراب توڑتا ہے اسکا کیا قصور۔ ہاں یہ قصور ضرور ہے کہ یہ (شیشہ) میرے دل سے مشابہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ تیرا مقصد میری دلشکنی ہے اور بس شیشۂ شراب توڑنے کا تو صرف بہانہ ہے۔ عرضِ دلشکستن = دلشکنی کا بیان۔ میں اپنی دلشکستگی کا اس سنگدل سے بیان کرتا ہوں۔ مگر اس پر اثر نہیں ہوتا۔ گویا میری شکایت ایسی ہی رائگاں ہے جیسے شیشہ کی فریاد بےتاثیر۔ شیشہ کے ٹوٹنے کی جھنکار کو فریاد کہا ہے۔

ہوں اک آئینہ رو کا دیدۂ پرآب دیوانہ
بنا اشکِ مسلسل سے مرے زنجیر شیشہ کی

بیاں کرتا ہے ہکلانے کا اُس بدمست کے عالم
و لے کیا سمجھئے پیچیدہ ہے تقریر شیشہ کی

یہ کیا طاقت کہ اب بھی محتسب پامال کر ڈالے
ملا تو خاک میں پر ہے وہی توقیر شیشہ کی

کرامت ہے رخِ زرد آپ کے دل تفتہ کا ورنہ
کہیں بنتی سنی ہے آجتک اکسیر شیشہ کی

بھلا کیا اعتبار اے مومن ایسی پارسائی کا
کہ بیخود ہو گئے تم دیکھکر تصویر شیشہ کی

۱۸۴

کشتۂ حسرتِ دیدار ہیں یارب کس کے
نخلِ تابوت میں جو پھول لگے نرگس کے

وہ چلا جان چلی دونوں یہاں سے کھسکے
اِس کو کہتا ہوں کہ اُسکے پاؤں پڑوں کس کس کے

پاؤں تربت پہ مری دیکھ سنبھل کر رکھنا
چور ہے شیشۂ دل سنگِ ستم سے پس کے

اے دیدۂ پرآب۔ میں ایک آئینہ رو کی محبت میں دیوانہ ہوں۔ اور اُسکی یاد میں رو رہا ہوں۔ اسلئے
میرے تار اشک سے شیشہ کی زنجیر تیار کر۔ یعنی آئینہ رو کے دیوانہ کے لئے زنجیر بھی شیشہ کی ہونی چاہئے۔
آئینہ رو کی مناسبت سے شیشہ اور اشک مسلسل کی مناسبت سے زنجیر لکھا ہے۔ شیشہ کی قلقل (جسے تقریر کہا
گیا ہے) کی توجیہ شاعر نے یہ کی ہے کہ یہ اُس بدمست کے نشہ میں ہکلانے کی کیفیت بیان کر رہا ہے۔ مگر اس
(شیشہ) کی تقریر پیچیدہ ہے اسلئے سمجھ میں نہیں آتی۔ ہکلانے کی معنوی مناسبت قلقل مینا سے ظاہر ہے۔ کیونکہ اگر
محتسب شیشہ کو خاک میں ملانے کے بعد پامال کریگا تو اُسکے پاؤں زخمی ہو جائینگے۔ دل تفتہ = عاشق جسکا دل سوختہ ہو
اکسیر = وہ خاک جو سونا بنا دے۔ میرا دل جلکر خاک ہوا اور خاک میں اکسیر کی خاصیت پیدا ہو گئی جسکے اثر سے میرے چہرہ کا
رنگ زرد ہو گیا۔ یہ کرامت عشق ہے ورنہ شیشہ کی اکسیر نہیں بنتی۔ رخ زرد سونا ہے جو اکسیر کا نتیجہ ہے۔ دل کی مناسبت سے شیشہ کا
لفظ استعمال کیا ہے۔ شیشہ سے مراد شیشۂ مے ہے۔ نخل تابوت = ایک قسم کی آرائش جو مُردے کے تابوت پر کیجاتی تھی حسرت دیدار ۱۸۴
کی مناسبت سے "نرگس کے پھول" استعمال کیا نخل اور پھول کی رعایت ظاہر ہے۔ مبادا تیرے پائے نازک کو گزند پہنچ جائے۔

مجھکو مارا[۳] مرے حال متغیر نے کہ ہے	کچھ گماں اور ہی دھڑکے سے دلِ مونس کے
کس پہ پڑی روئے ستمگر سے ملا دل افسوس	کس پہ دیوانہ ہوا ہوش گئے ہیں اس کے
بخت پروانہ ہے[۴] قربانِ عدو ہوں یعنے	آگ بن جائے ہے وہ گرد پھروں میں جس کے
نالۂ[۵] رشک نہو باعثِ دردِ سرِ مرگ	غیر کے سر پہ لگاتا ہے وہ صندل گھس کے
لذتِ مرگ سے ہجراں میں دعا ہے کہ خدا	یہ مزا ہو نہ نصیبوں میں کسی بے حِس کے
کیوں نہ ہم شمع کے مانند جلیں دور کھڑے	جب عدو باعثِ گرمی ہوئی مجلس کے

یار[۶] مومن سے بھی ہیں مدعیِ طبعِ رواں
واہ افکارِ تر ان او دمغۂ یابس کے

مجھ پہ[۱] طوفان اٹھائے لوگوں نے	۱۸۵	مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے
کر دئے اپنے آنے جانے کے		تذکرے جائے جائے[۲] لوگوں نے

[۳] مونس سے ہمدم یا ہم نشیں مراد ہے۔ میرا حال دگرگوں (متغیر) دیکھ کر ہمدم کا دل دھڑکتا ہے اور مجھے اور ہی کچھ گمان ہوتا ہے (یعنی اب نہ بچوں گا) اس حال متغیر نے مجھے تباہ کر دیا۔ نہ یہ ہوتا نہ ہمدم کا دل دھڑکتا۔ اور نہ مجھے شبہہ ہوتا۔ لطف یہ ہے کہ عاشق کو خود اپنی حالت کا احساس نہیں۔ ہمدم کا حال دیکھ کر اس کو اندیشہ ہوا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ عشق میں میرا حال دگرگوں دیکھکر شاید ہمدم کو خیال ہوا کہ وہ شخص کتنا حسین ہوگا جسکی محبت میں مومن کا یہ حال ہے اور وہ میرا رقیب بن بیٹھا۔ ہمدم کے دل کی دھڑکن بظاہر میرے حال دگرگوں سے ہمدردی کا نتیجہ ہے۔ مگر دراصل (جیسا کہ مجھے گمان ہوتا ہے) خود اسکے عاشق ہو جانے کے سبب سے ہے۔ [۴] پروانہ آگ (شعلۂ شمع) کے گرد پھرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں بھی پروانہ کا نصیب لیکر رقیب کے گرد پھروں گا (قربان ہوں گا) تاکہ وہ آگ بن جائے۔ مطلب یہ ہے کہ رقیب آگ کی طرح جلنے لگے۔ شوخی شاعرانہ ملاحظہ ہو کہ شاعر اپنی برگشتگی طالع سے (جس کا اثر یہ ہے کہ جس کسی کے گرد پھرتا ہے وہ آگ بن جاتا ہے بالفاظ دیگر جس کی خوشامد کرتا ہے وہ بگڑ جاتا ہے) یہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے کہ رقیب آگ بن جائے یعنی جلنے لگے۔ [۵] معشوق رقیب کے سر پہ صندل لگا رہا ہے اور میں اس اختلاط کو دیکھکر رشک سے نالہ کرتا ہوں کہیں میرا نالۂ رشک میرے حق میں موت کا دردِ سر پیدا کر دے۔ واضح رہے کہ دردِ سر میں پیشانی پر صندل لگاتے ہیں۔ دردِ سرِ مرگ = وہ درد جسکا نتیجہ موت ہے یا دردِ سر کنایہ ہے رنج و الم سے (بہار عجم) [۶] افکارِ تر = تازہ فکر (طنزاً) ادمغہ دماغ کی جمع ہے۔ یابس یعنی خشک حریف مومن کے مقابلے میں بھی روانی طبع کے مدعی ہیں۔ ان خشک دماغوں کی نئی اُپج تو دیکھو۔ تر اور یابس میں ایہام تضاد ہے۔

۱۸۵ [۱] مطلع میں ایک جگہ ردیف بیکار معلوم ہوتی ہے، تمام غزل کا مضمون مسلسل اور اپنے حسبِ حال ہے۔ [۲] جائے جائے = جگہ جگہ۔ اب یوں نہیں بولتے۔

وصل کی بات کب بن آئی تھی — دل سے دفتر بنائے لوگوں نے
بات اپنی وہاں نہ جمنے دی — اپنے نقشے جمائے لوگوں نے
سُن کے اُڑتی سی اپنی چاہت کی — دونوں کے ہوش اُڑائے لوگوں نے
اور ہی کچھ پڑھا دیا اُس کو — دشمنوں کے پڑھائے لوگوں نے
بن کہے راز ہائے پنہانی — اُسے کیونکر سُنائے لوگوں نے
کیا تماشا ہے جو نہ دیکھے تھے — وہ تماشے دکھائے لوگوں نے

کر دیا مومن اُس صنم کو خفا
کیا کیا ہائے ہائے لوگوں نے

۱۸۶
تمھیں تقصیر اُس بت کی کہ ہے میری خطا لگتی — مسلمانو! ذرا انصاف سے کہیو خدا لگتی
تڑپنے لوٹنے رونے کا باعث تجھ پہ بھی کُھلتا — ترے دل کو بھی میری سی اگر اے بیوفا لگتی
ستم[1] اے شور بختی میری ہڈی کیوں ہما کھاتا — سگِ لیلیٰ ادا کو گر نہ ظالم یہ مزا لگتی
جو مر جاتا تو یہ دُکھ کاہے کو سہتا اگر آمیں[2] — نہ کہتا میں تو شاید دشمنوں کی بد دعا لگتی
وہ پھر ہے گرمِ نظارہ کہاں تک زخم دل ٹانکوں — کہ ہے ہر ہر نگہ کے ساتھ اک برچھی سی آ لگتی

۱۸۶ [1] شاعر کو شکایت ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری ہڈیاں ہمانے کیوں کھائیں - اگر محبوبۂ لیلیٰ ادا کا کتا کھاتا تو میری سعادت تھی۔ ظالم شور بختی (بدنصیبی) تیرا بُرا ہو- اگر تو نہ ہوتی تو میری ہڈیاں دوست کے کتّے کو کیوں بدمزہ لگتیں۔ شور اور بدمزہ کی رعایت اوپر گذری- کہا جاتا ہے کہ ہما کی غذا استخواں ہے۔ سگِ لیلیٰ کا قصہ مشہور ہے۔ [2] رقیبوں نے مجھے بد دعا دی (کہ اسے موت آ جائے) میں کہ زیست سے بیزار تھا شامتِ اعمال سے اُس پر آمین کہہ اٹھا- مگر چونکہ اثر کو میرے ساتھ دشمنی ہے میرے آمین کہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ موت ٹل گئی- کاش میں آمین نہ کہتا تو شاید دشمنوں کی بد دعا لگتی اور میں مر کر غم سے چھوٹ جاتا- اگر آمین کا تعلق مصرعِ ثانی سے ہے۔

نسیم[1] مصر کا دم پیر کنعاں کا ہے کو بھرتا
ہو گر یہ عرضہ کر دیتا تو جیسے نالہ کھینچا تھا
کئے تھے کاٹ کاٹ آلودہ خوں سے ہاتھ یاں اپنے
بلا سے یہاں ہوا دھیان اس سیہ کاکل کی چوٹی کا

اگر کوچہ کی تیرے خاک آلودہ ہوا لگتی
چمن میں کوہ میں صحرا میں آتش جابجا لگتی
وہاں دست عدو سے پاؤں میں تھی شستہ پا لگتی
نہ لگتا دل تو دل سکے پیچھے کا ہے کو بلا لگتی

کہیں سے ڈھونڈھ کر لاتا ثابت کافر کو اے مومن
طبیعت سیر جنت میں نہیں اُس کے سوا لگتی

۱۸۷

سرنگیں[1] چشم سے کیوں تیز نظر کرتا ہے
کب مرا نالہ ترے دل میں اثر کرتا ہے

جب[2] وہ حیرت زدہ چہرے پہ نظر کرتا ہے
آئینہ صد گلہ آئینہ گر کرتا ہے

گر[3] تصور سے ہوں ہم بزم تو بیتاب رہے
کس قدر وہ مرے ملنے سے حذر کرتا ہے

کس کے ہنسنے کا تصور ہے شب و روز کہ یوں
گدگدی دل میں کوئی آٹھ پہر کرتا ہے

[1] نسیم مصر = مصر کی ہوا جو مصر سے حضرت یوسفؑ کی بوئے پیراہن اُنکے پدر بزرگوار تک لائی - پیر کنعان = حضرت یعقوب علیہ السلام - دم بھرنا نسیم کے لئے خالی از لطف نہیں -

۱۸۷ [1] تو مجھے مصروف نالہ پاکر ناراض کیوں ہوتا ہے ؟ میرا نالہ تیرے دل پر اثر کرنے والا نہیں اور ظاہر ہے کہ بے اثر چیز پر ناراض ہونا بے سود ہے -

[2] جس وقت محبوب ہنگام آرائش آئینہ میں اپنے کمال حُسن کو دیکھکر حیرت زدہ انداز میں اپنے چہرہ پر نظر ڈالتا ہے تو آئینہ منفعل ہوکر اپنے بنانے والے کا گلہ کرتا ہے - کہ نہ آئینہ گر مجھے بناتا نہ میں محبوب کی حیرانی کا باعث ہوتا اگر حیرت زدہ چہرہ سے چہرۂ عاشق مراد لیں تو یہ معنی ہونگے کہ آئینہ رخسار سے آئینہ گر کی شکایت کرتا ہے کہ مجھے آئینہ کیوں بنایا - کاش میں بھی عاشق کا چہرہ ہوتا -

[3] اُس کو مجھ سے اس قدر نفرت ہے کہ اگر میں عالم تصور میں بھی اُس کا ہم بزم ہوتا ہوں تو وہ بیتاب ہو جاتا ہے -

۴؎ غم خط میں ترے مرجائیں تو کچھ کیا ہے عجیب
زہر کو جو کوئی کھاتا ہے ضرر کرتا ہے

۵؎ اِک نمکداں سے تو لذت نہ اُٹھی اے قاتل
زخمِ دل عرضِ نمکدان دگر کرتا ہے

کیا کیا دل نے کہ آنکھوں سے کہا رازِ نہاں
ایسے غمّاز کو بھی کوئی خبر کرتا ہے

عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو
کہ شبِ غم کوئی کس طور سحر کرتا ہے

عدم آباد سے آنا مجھے یاد آئے ہے جب
کوئی حسرت زدہ دنیا سے سفر کرتا ہے

۶؎ بختِ بد نے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اُٹھتا ہوں
تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

۷؎ قتل کی ٹھہر گئی اپنے رقیبوں میں کہ آج
خندہ کچھ طرزِ دگر چاک جگر کرتا ہے

سن رکھو سیکھ رکھو اس کو غزل کہتے ہیں
مومن اے اہلِ فن اظہار ہنر کرتا ہے

۱۸۸ ۱؎ دیکھ گریاں مجھے وہ چشم کو تر کرتا ہے
اشکِ غمّاز بھی کیا آنکھوں میں گھر کرتا ہے

۲؎ ذکر کر بیٹھیں برائی ہی سے شاید میرا
اب وہ اغیار کی صحبت سے حذر کرتا ہے

۴؎ سبزۂ خط کی مناسبت زہر سے ظاہر ہے کیونکہ زہر کھانے سے بدن سبز پڑ جاتا ہے۔ شعر کے معنی صاف ہیں ۵؎ نہ اُٹھی = نہ حاصل ہوئی۔ عرضِ نمکدانِ دگر = دوسرے نمکدان کی خواہش ظاہر کرنا۔ ۶؎ بختِ بد سے یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ دوست کی عنایت بھی کہیں میرے لئے تمہیدِ مصیبت نہ ثابت ہو۔ کیونکہ میری قسمت کیا اور سامانِ مسرت کیا۔ ۷؎ چاک جگر یا زخمِ جگر کے کھل جانے کو خندۂ زخم سے تعبیر کرتے ہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے زخمِ جگر یوں تو پہلے بھی ہنستا تھا مگر آج نئی طرز سے ہنس رہا ہے یعنی اُسکے خندہ میں طنز کا پہلو ہے۔ اسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاید رقیبوں میں میرے قتل کا مشورہ ہوا ہے۔ ہاں اگر محبوب خود قتل کرتا تو خندہ مسرت کا محل تھا۔

۱۸۸ ۱؎ غمّاز = چغل خور۔ اشک کو اسلئے غمّاز کہتے ہیں کہ رازِ محبت کو افشا کر دیتا ہے۔ آنکھوں میں گھر کرنا = عزت حاصل کرنا۔ میرے اشکِ غمّاز نے اُسکی آنکھوں میں گھر کیا کہ مجھے روتا دیکھکر وہ بھی رونے لگا۔ ۲؎ محبوب اغیار کی صحبت سے اسلئے پرہیز کرتا ہے کہ کہیں وہ میرا ذکر نہ کر بیٹھیں گو برائی ہی سے ہو۔ ذکرِ میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں"

ا۔ تا کہ غیرتِ بلبل سے بھڑک اٹھے ہے آگ
گل مری قبر پہ کیا کارِ شرر کرتا ہے

۲۔ سدِّ راہ ایسی نہیں غیرتِ یادِ اغیار
کب خیال اپنا ترے دل میں گزر کرتا ہے

۳۔ مرے زرد آبلوں سے تختۂ صد برگ ہے دشت
ہے وہ اکسیر جنوں خاک کو زر کرتا ہے

۶۔ ہے تری جا تو ہر ایک کے دل میں کیونکر
دیکھیے حال مرا سب کو اثر کرتا ہے

۷۔ تیری غفلت سے یہ حالت ہے کہ اب بیکہ مجھے
ترک آئینہ گری آئنہ گر کرتا ہے

۸۔ کیا رلاتی ہے مجھے فکرِ خیالِ دشمن
وصل میں جب وہ ادھر منہ کیے نظر کرتا ہے

۹۔ اشکِ شادی نے دمِ وصل جلایا کہ مجھے
منع نظارہ مرا دیدۂ تر کرتا ہے

۱۰۔ محوِ وعدہ ہے کسی بت کا تو مومن کہ نماز
پھیر کر قبلہ سے منہ جانبِ در کرتا ہے

ا۔ میری قبر پہ پھول پڑے ہیں اُنکو دیکھکر بلبل غیرت (رشک) سے نالے کرتی ہے۔ جنکی وجہ سے آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ اس طور سے گل میری قبر پہ چنگاری کا کام دیتا ہے۔

۲۔ تیرے دل میں یادِ اغیار ہے جسکے رشک سے چاہئے تھا کہ میرا خیال تیرے دل میں نہ جائے۔ لیکن میں یہ ننگ گوارا کروں تو بھی امید نہیں کہ میرا خیال تیرے دل میں گذر کرسکے۔ یعنی یادِ اغیار کا رشک تو چنداں مانع نہیں۔ تو خود ہی میرا خیال نہیں کرتا۔

۳۔ صد برگ ہے ایک قسم کا پھول ہے جیسے زرد آبلوں کی وجہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دشت میں گیندے کا تختہ کھلا ہوا ہے۔ جنون دراصل اکسیر کا حکم رکھتا ہے اس لئے خاکِ دشت میں زرد آبلوں کی خاصیت پیدا ہوگئی۔ ۶۔ لوگوں پر میری حالت دیکھکر کیا اثر ہو جبکہ ہر ایک کے دل میں تیری جگہ ہے ایسی حالت میں سب تیرے ہی طرفدار ہو جائینگے۔ ۷۔ آئینہ گر میری تباہ حالت دیکھکر آئینہ گری ترک کرتا ہے کہ نہ آئینہ ہوگا نہ معشوق آرائش کریگا اور نہ اپنے حسن پہ مغرور ہوکر عاشق سے غفلت کرے گا۔ ۸۔ یعنی مجھے بدگمانی یا فکر ہوتی ہے کہ دوست کہیں دشمن کے خیال میں نہ ہنس رہا ہو۔ ۹۔ وصل کی خوشی میں جو آنسو نکلے اُنکو دن نے مجھے یہ ستایا کہ رونے کی وجہ نظارۂ یار میں دشواری پیدا ہوئی۔ ۱۰۔ نماز کرنا نماز کردن کا ترجمہ ہے۔ اُردو میں رائج نہیں اُردو میں نماز پڑھنا کہتے ہیں

۱۸۹

فغاں کیا دم بھی لینا پارہ کا دل اُڑاتا ہے
کہوں کیا دردِ پنہاں کی کلیجہ مُنہ کو آتا ہے

سلہ سنا اُسنے مرا نالہ اثر بھی کچھ ہوا شاید
کہ دشمن کہہ گیا بیفائدہ کیوں غل مچاتا ہے

سلہ پری لوٹے ہے انگاروں پہ دوزخ میں پڑیں حوریں
تمھارا حُسن عالم سوز کس کس کو جلاتا ہے

سلہ گراں خوابی وہی ہے بخت خوابیدہ کی اے ظالم
مرا شور فغاں کاہے کو سوتوں کو جگاتا ہے

سلہ گرائے اشک پُر تاثیر کیوں خلوت میں اے انکھو
کوئی یوں خاک میں ایسے گُہر کو بھی ملاتا ہے

سلہ کبھی کی پھر گئیں آنکھیں فرشتے بھی نظر آئے
تمھارا مُنہ چھپانا دیکھئے کیا کیا دکھاتا ہے

سلہ میں ایسا ہوں کہ دونگا تجھکو طعنہ بیوفائی کا
بگڑنا گر نہیں دشمن سے کیوں باتیں بناتا ہے

سلہ نہ کرنی تھی نصیحت اسکے بیٹھے پر قیامت کی
عجب فتنہ ہے ناصح بھی کہ یہ فتنے اُٹھاتا ہے

سلہ خیالِ خوابِ راحت ہے علاج اس بدگُمانی کا
وہ کافر گور میں **مومن** مرا شانہ ہلاتا ہے

۱۸۹ سلہ میرا نالہ سُنکر دوست بد دماغ ہوا - چنانچہ دشمن اُسکا ترجمان بنکر مجھ سے کہہ گیا - کہ بے فائدہ کیوں غل مچاتا ہے - شاعر کے نزدیک نالے کے "اثر" کی ایک صورت یہ بھی ہے - یعنی کچھ اثر تو ہوا - گو مفید مطلب نہ ہی - سلہ پری لوٹے ہے .... یعنی آتش رشک سے - پری (آتشی نژاد) کی مناسبت انگاروں سے اور حوروں کی دوزخ سے ظاہر ہے - سلہ محبوب نے شکایت کی کہ تمھارا شور فغاں سوتوں کو جگاتا ہے - عاشق جواب دیتا ہے کہ اگر یہ الزام درست ہوتا تو میرا سویا ہوا نصیب ایسی گہری نیند کیوں سوتا - یعنی وہ بھی میرے شور فغاں سے جاگ اُٹھتا - سلہ خلوت (تنہائی) کے بجائے معشوق کے حضور میں اشک گرتے تو تاثیر بھی ہوتی - سلہ نزع کے وقت محتضر کو فرشتے نظر آیا کرتے ہیں - سلہ محبوب عاشق سے کہتا ہے کہ اگر میں نے تمھارے حسب منشاء رقیب سے بگاڑ کر لیا تو کل کو تم (عاشق) ہی مجھ (معشوق) کو طعنہ دوگے کہ انھوں نے رقیب سے بیوفائی کی - عاشق جواب دیتا ہے کہ اطمینان رکھو میں ہرگز اسکا طعنہ نہ دونگا - تم خواہ مخواہ باتیں بناتے ہو اور فرضی بہانے نکالتے ہو دراصل تمھیں اُس سے بگاڑ کرنا ہی منظور نہیں - شعر میں پیچ سے کام لیا ہے - سلہ مراد یہ ہے کہ محبوب اُسکی نصیحت سے برہم ہوکر اُٹھ گیا - سلہ میں مرگیا ہوں مگر وہ کافر یہ سمجھکر کہ یہ (عاشق) خواب راحت میں مصروف ہے - گور میں مرا شانہ ہلاتا ہے - آخر اس بدگمانی کا کیا علاج ہے؟ حضرات شیعہ کے یہاں رسم ہے کہ تلقین کے وقت میت کا شانہ ہلاتے ہیں - مومن کا مجبوب بھی اہل تشیع سے ہے اسلئے اس طرف اشارہ کیا -

۱۹۰ کیوں[1] بنی خوں نابہ نوشی بادہ خواری آپ کی — کس لئے ہے بیخودی غفلت شعاری آپ کی
کیوں رمِ جانانہ کے بدلے ہے از خود رفتگی — کس لئے شوخی ہوئی ہے بے قراری آپ کی
منفعل[2] سازِ دمِ ناہید نغمے کیا ہوئے — کیوں گذرتی ہے فلک سے آہ و زاری آپ کی
آشنا سے ہو گئے بیگانگی جاتی رہی — ہو گئی کس آشتی[3] دشمن سے یاری آپ کی
بوئے گل سے ہو مگر کس کی بو آئی ہے یاد — خاک اڑانے[4] کیوں لگی بادِ بہاری آپ کی
عشق[5] مہ رو میں تڑپتے ہو نہیں تو کس لئے — جوں کتاں ہر شب قبا ٹکڑے ہے ساری آپ کی
مجھکو[6] حیراں دیکھکر حیراں رہجاتے ہو کیوں — ایسی محوِ یاس ہے اُمیدواری آپ کی
جی جلا جاتا ہے کیوں ہر لحظہ کس پر دل گیا — لے گئی قابو سے جاں بے اختیاری آپ کی
کیوں ہے رنگ زرد پر گلگونہ[8] اشکِ سُرخ کا — کس لئے ملنے لگی رنگت ہماری آپ کی
ہائے[9] کیا بیتاب ہو کر دھر لیا سینہ پہ ہاتھ — کھل گئی مہوش کہے سے دلفگاری آپ کی

۱۹۰ ۱؎ یہ پوری غزل بطور قطعہ بند ہے۔ اس میں شاعر نے معشوق کے کسی پر عاشق ہونیکا بیان لکھا ہے۔ اس قبیل کے واقعات اکثر ہوسناک شعراء کو پیش آتے ہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی بادہ خواری خونابہ نوشی (خونِ دل پینے) سے کیوں مبدّل ہوگئی اور تغافل کے عوض بیخودی کی خو کیوں ہوگئی۔
۲؎ منفعل سازِ دمِ ناہید = ناہید کے زمزمے کو خجل کرنے والے۔ ناہید ستارہ زہرہ کو کہتے ہیں جس کا لقب مطربہ فلک ہے۔
۳؎ آشتی دشمن = صلح و وفا کا دشمن۔ اضافت مقلوب ہے۔
۴؎ کسی کی خاک اڑانا = سبک کرنا۔ رسوا کرنا۔ بادِ بہاری کو خاک اڑانے والی قرار دیا کیونکہ وہ بوئے گل لائی جو محبوب کی کدورتِ خاطر کا باعث ہوئی۔
۵؎ مشہور ہے کہ نورِ ماہ میں کتاں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ ۶؎ میں تمہاری تاثیرِ جمال سے حیران ہوں اور لطف یہ ہے کہ تم میرے اندازِ تحیّر کو دیکھکر حیران رہجاتے ہو اور اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ تمہارے ہی عشوہا‌ئے حُسن کا کرشمہ ہے۔ یعنی تمہاری اُمیدوں کے مطلع پر یاس کی گھٹا اس قدر چھائی ہے کہ اب تم کو اپنے حُسن کی دلاویزیوں کا بھی احساس نہ رہا۔ ۸؎ گلگونہ = غازہ۔ سُرخ پوڈر۔ ۹؎ میں نے تم کو مہوش کہا اور تم نے سُنکر سینہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ جس سے شاید تمہارا مقصد یہ تھا کہ پیشتر میں مہوش ضرور تھا۔ اب تو دلفگار ہوں مہوش اور دلفگار میں مناسبت ہے کیونکہ ماہ کا دل داغوں سے فگار (زخمی) ہوتا ہے۔

سرمہ[۹] دینے لگتے ہو جس وقت رونا آئے ہے		بارے ہے ابتک تو باقی شرمساری آپ کی
دل[۱۰] گیا دم پر بنی آنکھیں لڑیں کہتی ہے حال		بیقراری آہ وزاری اشکباری آپ کی
قطرہ ہائے اشک گنتے ہو اگر روتا ہوں میں		اس قدر خو ہو گئی اختر شماری آپ کی

کس[۱۱] صنم کی بندگی میں بت پرستی چھوڑ دی
ہوگئی مومن کی سی کیوں دینداری آپ کی

(٦)

صبر[۱۲] وحشت اثر نہ ہوجائے	۱۹۱	کہیں صحرا بھی گھر نہ ہوجائے
رشک[۱۳] پیغام ہے عناں کش دل		نامہ بر راہبر نہ ہوجائے
دیکھو مت دیکھیو کہ آئینہ		غش تمھیں دیکھ کر نہ ہوجائے
ہجر[۱۴] پردہ نشیں میں مرتے ہیں		زندگی پردہ در نہ ہوجائے

[۹] عاشق ہو کر بھی تم میں اس قدر احساس شرم باقی ہے کہ جب رونا آتا ہے تو آنکھوں میں سُرمہ لگانے لگتے ہو۔ تاکہ لوگ اشکوں کو غم عشق کے بجائے سرمہ کے اثر پر محمول کریں۔

[۱۰] دونوں مصرعوں میں لف ونشر مرتب ہے۔ [۱۱] معشوق اعتقاداً بُت پرست تھا مگر کسی صنم (محبوب) کی بندگی میں مذہب بُت پرستی چھوڑ بیٹھا۔ اس حساب سے جس طرح مومن اپنی دینداری میں خام ہے معشوق اپنے مذہب (بُت پرستی) میں غیر استوار ہے۔ یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ اب اُسکی دینداری مومن کی سی ہے کیونکہ دونوں (معشوق اور مومن) بُت پرستی سے کنارہ کش ہیں۔

۱۹۱ [۱۲] قاعدہ ہے کہ اگر انسان کسی چیز کا خوگر ہوجاتا ہے تو پھر اُس چیز کی دلاویزی زائل ہوجاتی ہے۔ میں جنون عشق میں گھر سے گھبرا کر صحرا میں آیا تھا۔ کہیں صحرا بھی میرے حق میں گھر نہ بن جائے۔ یعنی صحرا پر قناعت (صبر) کر کے بیٹھ رہا ہوں مگر ڈرتا ہوں کہ یہ قناعت وحشت کا اثر پیدا نہ کرے اور گھر کی طرح یہاں سے بھی دل اُچاٹ نہ ہو۔

[۱۳] میں نے نامہ بر کو دوست کے پاس بھیج تو دیا ہے مگر یہ رشک کہ "یہ پہونچا میں رہا جاتا ہوں" دل کو کھینچ رہا ہے۔ کہیں میں بھی اُسکے عقب میں دیار محبوب کو نہ چل کھڑا ہوں۔ اُس صورت میں اُسکی حیثیت ایک راہبر کی ہوگی وہ آگے آگے ہوگا میں پیچھے پیچھے۔ [۱۴] ہم اس خیال سے مرتے ہیں کہ اگر زندہ رہے تو راز عشق کی پردہ دری ہوگی۔

کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم[1] ۔۔۔ کہیں پامال سر نہ ہوجائے
میرے تغئیرِ رنگ کو مت دیکھ[2] ۔۔۔ تجھکو اپنی نظر نہ ہوجائے
مرے آنسو نہ پونچھنا دیکھو ۔۔۔ کہیں دامان تر نہ ہوجائے
بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں[3] ۔۔۔ کہ فغاں بے اثر نہ ہوجائے
اُسے قیامت نہ آئیو جب تک[4] ۔۔۔ وہ مری گور پر نہ ہوجائے
مانعِ ظلم ہے تغافلِ یار[5] ۔۔۔ بختِ بد کو خبر نہ ہوجائے
غیر سے بے حجاب ملتے ہو[6] ۔۔۔ شبِ عاشق سحر نہ ہوجائے
رشکِ دشمن کا فائدہ معلوم ۔۔۔ مُفت جی کا ضرر نہ ہوجائے
اے دل آہستہ آہِ تاب شکن[10] ۔۔۔ دیکھ ٹکڑے جگر نہ ہوجائے

مومن ایماں قبول دل سے مجھے
وہ بُت آزردہ گر نہ ہوجائے

Naseem

[1] راہ میں محبوب کا نقشِ قدم دیکھکر عشاق سجدے کرتے ہیں۔ شاعر کو خوف ہے کہ مبادا سجدوں کی کثرت سے اُسکا نشانِ پا بگڑ جائے یہ مضمون شعر بہت لطیف ہے۔ پامالِ سر کی ندرتِ ترکیب ملاحظہ ہو۔ [2] چونکہ میرے رنگِ رُخ کا متغیر ہونا تیرے حسن کا کرشمہ ہے اسلئے مبادا میری حالت کو دیکھکر تجھے اپنے دلاویزی حُسن کا احساس ہو۔ جسکے اثر سے تجھے خود اپنی نظر لگ جائے [3] ناصح کی بات سب بے اثر ہوتی ہے۔ مبادا اُس سے ہم کلام ہوکر مجھپر بھی اُسکی نحوست اثر کرجائے۔ [4] یعنی میں خرام یار ہی سے زندہ ہوجاؤنگا۔ قیامت کی مجھے احتیاج نہیں۔ [5] تغافل = غافل بننا۔ بے پروائی جس میں نہ کرم ہو نہ ستم۔ مراد یہ ہے کہ جب تک محبوب مجھ سے غفلت شعاری برتتا ہے اُسکے ظلم سے امن رہتا ہے۔ اگر بختِ بد کو خبر ہوگئی تو اس سے بھی محروم ہوجاؤنگا۔ یعنی محبوب تغافل چھوڑ کر ظلم کرنے لگے گا۔ [6] یعنی مبادا حسد و رشک سے عاشق کی زندگی کی رات سحر ہوجائے۔ لیکن مومن کے رنگ سے زیادہ قریب جو معنی خیال میں آتے ہیں یہ ہیں کہ کہیں تمھارے جلوہ بے حجاب کی روشنی سے عاشق کی شبِ تاریک ہمرنگ سحر نہ ہوجائے۔ یہ کرشاعرانہ مومن کا خاص انداز ہے۔ [10] تاب شکن = طاقت شکن۔

۱۹۲

جہاں سے شکل کو تیری ترس ترس گذرے
جو تجھ پہ بس نہ چلا اپنے جی سے بس گذرے

بنی ہے[1] صور سرافیل آہ بے تاثیر
کہ میرے دم پہ قیامت نفس نفس گذرے

نہ جاؤں[2] کیونکہ سوے دام آشیاں سے جب
خیال حسرت مرغان ہم قفس گذرے

ہوا[3] اور کو تو ہدایت جو خود ہوں آوارہ
یہ عمر کاش کے جوں نالۂ جرس گذرے

وفاے[4] غیرت شکر جفا نے کام کیا
کہ اب ہوس سے بھی اعداے بوالہوس گذرے

یہ نیم[5] جان و غم ہجر ہے وہی انصاف
جو تیرے دھیان میں اسے مرگ دادرس گذرے

دکھاؤں ناقۂ لیلیٰ خرام ناز تجھے
کبھی ادھر سے جو اس شوخ کا فرس گذرے

نہ چھوٹے[6] کیوں تن کاہیدہ سے پسینہ ہاے
طرف سے غیر کی جب نذر عطر خس گذرے

کہاں[7] وہ ربط بتاں اب کہ اسکو تو مومن
ہزار سال ہوئے سیکڑوں برس گذرے

۱۹۲ [1] حضرت اسرافیلؑ کے صور پھونکتے ہی دنیا میں قیامت برپا ہو جائیگی۔ اسی بنا پر شاعر نے اپنی آہ بے تاثیر کو صور سرافیل سے تشبیہ دی ہے۔ [2] مجھے مرغان ہم قفس کی حسرت کا خیال ہے۔ اسلئے آشیاں سے پھر دام کی طرف جاتا ہوں تاکہ گرفتار ہو کر محبوس قفس ہو جاؤں اور اپنے رفیقوں کا شریک درد ہوں۔ ہم قفس کا لفظ بتا رہا ہے کہ کہنے والا بھی پہلے اسیر قفس تھا۔ اب رہا ہو چکا ہے۔ [3] نالۂ جرس خود آوارہ ہے کیونکہ منتشر ہے اور کوئی مقصد نہیں رکھتا تاہم دوسروں کی رہنمائی کرتا ہے۔ کاش میرا حال نالۂ جرس ہی کا سا ہو۔ [4] میں نے معشوق کی بیداد پر شکر کیا۔ میرے اس طرز تحمل پر اعداے بوالہوس (رقیبوں) کو غیرت آئی۔ جس سے ان میں جذبۂ وفا پیدا ہوا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ انھوں نے ہوس ترک کر دی۔ یعنی عشق صادق کی صلاحیت تو ان میں کہاں تھی جبر وفا سے اتنا ہوا کہ ہوس چھوڑ بیٹھے۔ وفا اور ہوس میں تضاد ہے۔ [5] مجھ سا نیم جاں غم ہجر اٹھانے کے قابل نہ تھا۔ چاہئے تھا کہ اس صدمے سے مر جاتا۔ مگر اے "مرگ دادرس" جو تیری مرضی۔ [6] تن کاہیدہ کی مناسبت خس اور پسینے کی عطر سے ظاہر ہے۔ [7] اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ مومن کو ربط بتاں چھوڑے ہوئے (کعبہ کے اصنام کو نکالے ہوئے) ایک ہزار کئی سو برس گذر گئے۔ اسلئے کہ شعر کا زمانہ تصنیف سنہ ۱۲۰۰ ہجری کے بعد ہے۔

نہ انتظار میں یاں آنکھ ایک آن لگی ۱۹۳ نہ ہائے ہائے میں تالو سے شب زبان لگی

جلا جگر تپ غم سے پھڑکنے جان لگی
الٰہی خیر کہ اب آگ پاس آن لگی

گلی میں اُس کی نہ پھر آتے ہم تو کیا کرتے
طبیعت اپنی نہ جنّت کے درمیان لگی

جفائے غیر کا شکوہ تھا تیرا اچھا کیا ذکر
عبث یہ بات بُری تجھکو بدگمان لگی

ہنسو نہ تم تو مرے حال پر میں ہوں وہ ذلیل
کہ جس کی ذلت و خواری سے تم کو شان لگی

کہاں[1] وہ آہ و فغاں دم بھی لے نہیں سکتے
ہمیں یہ تیری دعائے بد آسمان لگی

میں[2] اور اُس کو بلاؤں گا روز وصل میں تو
اجل بھی کرنے محبّت کا امتحان لگی

سدا تمھاری طرف جی لگا ہی رہتا ہے
تمھارے واسطے ہے دل کو مہربان[3] لگی

ق

وہ[4] کینہ ورز تھا مومن تو دل لگایا کیوں
کہو تو کیا تمھیں ایسی بھلی وہ آن لگی

برنگ صورتِ بلبل نہیں نوا سنجی
یہ کیا ہوا کہ چپ اے گلستاں بیان لگی

۱۹۳ [1] یعنی پیشتر جب ہم آہ و فغاں کرتے تھے تو آسمان خوف سے کانپ اُٹھتا تھا۔ آخر اُس نے بددعا کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فریاد تو درکنار۔ سانس لینے کی طاقت بھی ہم میں باقی نہ رہی۔

[2] عاشق ہجر میں موت کو بڑے اشتیاق سے بلایا کرتا تھا۔ سوءِ اتفاق دیکھئے کہ اجل اُس کو اپنا عاشق جانکر وصل یار کے دن آموجود ہوئی۔ عاشق کہتا ہے۔ کہ لو اجل بھی مجھے اپنا مشتاق سمجھ کر میری محبت کا امتحان کرنے کے لئے آگئی۔ میں نے اس (اجل) کو بلایا ضرور تھا۔ مگر روز وصل میں بھلا کیوں بلانے لگا تھا۔ مرزا غالب کے یہاں بھی یہی مضمون ہے۔ خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے + آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے۔

[3] دل کو لگی ہے یعنی دل متوجہ ہے۔ [4] یہ اور شعر مابعد قطعہ بند ہیں۔ کینہ ورز = دشمنی اختیار کرنے والا۔ آن = ادا
گلستان بیان = رنگین بیان۔ آخر شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے رنگین بیان (مومن) عاشق ہو کر تیرا کیا حال ہوا کہ چپ سی لگ گئی اور تو نے بلبل تصویر کی طرح خاموشی اختیار کر لی۔

کیا مرے قتل پہ حامی[1] کوئی جلاد بھرے	۱۹۴	آہ جب دیکھ کے تجھ سا ستم ایجاد بھرے
خون[2] دل پیتے ہیں خو کردۂ محنت اے کاش		ساغر دہر میں ساقی مئے بیداد بھرے
کہیں ہو جائے وصال[3] آہ بلا سے چھوٹوں		ہجر کا دکھ کوئی کب تک دل ناشاد بھرے
تیشہ[4] کچھ دشنۂ شیرویہ نہیں اے غیرت		اپنے ہی خوں سے مگر دامن فرہاد بھرے
ہوش[5] میں وہ صید جگر خون اسیری مشتاق		جو پس ذبح بھی ہر دم دم صیاد بھرے
پھر[6] تو سرگوشی دشمن میں بھی تاثیر نہ ہو		گر نہ کان اسکے فغان گلہ ارشاد بھرے
چارہ[7] گر اسکی خطا کیا مرے تن میں نہ رہا		خون اتنا کہ سر نشتر فصاد بھرے

۱۹۴ [1] حامی بھرنا = اقرار کرنا۔ قبول کرنا۔ آمادہ ہونا۔ [2] ہم لوگ جو عشق میں رنج والم (محنت) کے خوگر ہو چکے ہیں جفائے یار کو ترستے ہیں اور ناچار خون دل پیکر رہ جاتے ہیں۔ کاش ساقی روزگار دہر کے ساغر میں بیداد کی شراب بھردے کہ ہمارا حوصلۂ جفا پسندی پورا ہو۔ [3] وصال یہاں بمعنی موت ہے۔ وصال و ہجر میں ایہام تضاد ہے۔ [4] شیرویہ خسرو پرویز کے بیٹے کا نام ہے جس نے اپنے باپ کو خنجر سے ہلاک کرکے تخت ایران پر قبضہ کرلیا تھا۔ شاعر غیرت سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ تیشۂ فرہاد کچھ شیرویہ کا دشنہ (خنجر) تو تھا نہیں کہ خسرو کو ہلاک کردیتا۔ ہاں فرہاد کو ہلاک کردینا اسکے اختیار میں تھا سو وہ کرگزرا۔ یعنی تقاضائے غیرت تو یہ تھا کہ فرہاد اپنے رقیب (خسرو) کا خاتمہ کردیتا۔ لیکن یہ اسکے بس میں نہ تھا۔ ناچار اپنا ہی خون کیا۔

[5] جگر خون = وہ جس کا کلیجہ خون ہوگیا ہو اسیری مشتاق میں اضافت مقلوب ہے۔ یعنی مشتاق قید۔

[6] فغان گلہ ارشاد = وہ فغاں جو شکایت کی طرف رہنمائی کرے یا جسے سنکر سامع متاثر ہونے کے بجائے الٹا شاکی ہو۔ اگر میری فغاں معشوق کو میرے خلاف نہ ابھار دیتی تو وہ دشمن کی سرگوشی پر بھی کان نہ دھرتا۔ یہاں معشوق کے ناشنوا ہونے پر زور دیا ہے۔ [7] چارہ گر نے عاشق دیوانہ کے لئے فصد کا علاج تجویز کیا چنانچہ فصاد نے آکر فصد لی مگر خون نہیں نکلا۔ اسپر شاعر فصاد کی بے قصوری ثابت کرتا ہے۔

دمبدم[ش] رنگ ہے تغیر مرا حیراں ہے — رنگ کیسا مری تصویر میں بہزاد بھرے

مومن[۹] اس شعلہ زبانی کی کہاں قدر مگر
مُنہ دُرِ آبلہ سے گرمیِ فریاد بھرے

۱۹۵

کرتا ہے قتل عام وہ اغیار کے لئے — دس بیس روز مرتے ہیں دو چار کے لئے
دیکھا[۱] عذاب رنج دلِ زار کے لئے — عاشق ہوئے ہیں وہ مرے آزار کے لئے
دل[۲] عشق تیری نذر کیا جان کیونکہ دوں — رکھا ہے اُس کو حسرتِ دیدار کے لئے
قتل اُس نے جرم صبر جفا پر کیا مجھے — یہ ہی سزا تھی ایسے گنہگار کے لئے
لے[۳] تو ہی بھیجدے کوئی پیغام تلخ اب — تجویز زہر ہے ترے بیمار کے لئے
آتا نہیں ہے تو تو نشانی ہی بھیجدے — تسکین اضطراب دلِ زار کے لئے
کیا دل دیا تھا اسلئے میں نے تمھیں کہ تم — ہوجاؤ یوں عدو مرے اغیار کے لئے
چلنا تو دیکھنا کہ قیامت نے بھی قدم — طرزِ خرام و شوخیِ رفتار کے لئے
جی میں ہے موتیوں کی لڑی اُسکو بھیجدوں — اظہار حال چشم گہربار کے لئے

ش بہزاد (مصوّر) حیران ہے کہ میرے تصویر میں کیا رنگ بھرے کیونکہ عشق کی بدولت ہر لحظہ میرے چہرے کا رنگ بدلتا رہتا ہے ۔ ۹ ایشیائی سلطنتوں میں بادشاہوں نے اکثر اہل کمال کے مُنہ موتیوں سے بھردیئے ہیں مومن کہتا ہے کہ میری شعلہ زبانی کی قدر کون کرے ۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ جب ناقدریٔ زمانہ پہ فریاد کروں تو اسکی گرمی کے اثر سے میرا مُنہ آبلوں کے موتیوں سے بھر جائے ۔ ورنہ اس دور میں قدر دانی معلوم ۔ شعلہ زبانی ۔ آبلہ ۔ گرمی میں ایہام تناسب ہے دُرِ آبلہ میں اضافت تشبیہی ہے ۔

۱۹۸ ۱ وہ میرے ستانے کے لئے کسی دوسرے پر عاشق ہوئے ہیں ۔ تاکہ مجھ سے بے التفاتی اور دوسرے سے گرویدگی کا بہانہ ہاتھ آئے ۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ صرف میرے دلِ زار کو رنج و بیتاب کی غرض سے خود عذابِ عشق میں مبتلا ہیں ۔
۲ شعر میں عشق مخاطب ہے ۔ کیونکہ بمعنی کیونکر ۔ ۳ یعنی پیغام تلخ ہی زہر کا کام دے ۔ زہر بھی تلخ ہوتا ہے ۔

دیتا ہوں اپنے لب کو بھی گلبرگ سے مثال
بوسے جو خواب میں ترے رخسار کے لئے

جینا[۵۷] امید وصل پہ ہجراں میں سہل تھا
مرتا ہوں زندگانیِ دشوار کے لئے

مومن کو تو نہ لائے کہیں دام میں وہ بت
ڈھونڈھے ہے تار سبحہ[۵۸] کے زنار کے لئے

۱۹۶

کہاں تک دم بخود رہیے نہ ہوں کیجے نہ ہاں کیجے
کہاں تک کھائیے غم کب تلک ضبط فغاں کیجے

سوائے نقطۂ[۵۹] موہوم کیا وصف دہاں کیجے
بنا کر بات کیا کہیے جو کچھ ہو تو بیاں کیجے

موا[۶۰] گل دیکھتے ہی یاد رخ میں یار کہتے تھے
ذرا بہلائیے جی چلئے سیر گلستاں کیجے

ق
عدو[۶۱] کے وہم سے تکتا ہوں بزم عیش میں ہر سو
نہیں ہے اور کچھ یوں آپ جو چاہیں گماں کیجے

غرض ہمسائے میں بھی اس کا رہنا کیا قیامت ہے
کہ سن لیتا ہے وہ گھر میں جو کچھ مذکور یاں کیجے

کہیں تو کیا کہیں اور بن کہے کیونکر دوا ہووے
بڑی مشکل پڑی کیا چارۂ دردِ نہاں کیجے

وہی ہجراں ہے غم کھانے پہ کب تک زندگانی ہو
بس اب مر جائیے کچھ کھا کے عیشِ جاوداں کیجے

رکھے سے ہاتھ سینے پر بھلا کب مانتا ہے دل
نہ جب تک روئیے دو چار آہِ خوں چکاں کیجے

۵۷ زندگانیٔ دشوار سے مراد وہ زندگی ہے جس میں امید وصل بھی نہ ہو۔ یعنی اگر ہجر میں امید وصل ہوتی تو زندگی باسانی بسر ہو جاتی۔ مگر اب رشتۂ امید بھی منقطع ہوگیا مجبوراً اس زندگانی دشوار کے ہاتھوں جان دے رہا ہوں۔

۵۸ سبحہ = تسبیح۔ زنّار = جنیو۔ وہ بت اپنے زنار کے لئے تسبیح کے تار تلاش کر رہا ہے۔ کہیں اس چال سے مومن کو پھانسنا مقصود نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ مومن تار تسبیح کو دیکھکر اسکی طرف مائل ہو جائیگا۔

۵۹ دہن کو شعرا نقطۂ موہوم سے تشبیہ دیتے ہیں کہ دونوں کا وجود محض اعتباری مانا جاتا ہے۔ نقطہ کی تعریف ریاضی میں یہ کی گئی ہے کہ وہ مقام تو رکھتا ہے۔ مگر حجم نہیں۔ منتہاے خط۔

۶۰ موا کا فاعل خود عاشق ہے جو محذوف ہے "یار کہتے تھے" کا تعلق دوسرے مصرع سے ہے۔

۶۱ یہ اور شعر مابعد قطعہ بند ہیں۔ دوسرے شعر میں ضمیر کا مرجع عدو ہے۔ تقریباً اسی مضمون کا غالب کا شعر سنئے۔
میں مضطرب ہوں وصل میں بیم رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

عدو؎ اس اوج پر شا کی ہے شاید غصہ آجاوے	ملا دے خاک میں یہ تو بھی شکرِ آسماں کیجے
کچھ آخر حد بھی ہے جور و جفا و ظلم کی کب تک	تحمل درگذر ہر لحظہ ہر دم ہر زماں کیجے
گلا ہم کاٹ لیں گے آپ تیغِ رشک؎ سے اپنا	عدو کو قتل کیجے پھر ہمارا امتحاں کیجے

عذابِ ایزدی جانکاہ ہے مانا بس اب مومن
خدا کے واسطے ذکرِ ستم ہائے بتاں کیجے

اجل سے خوش ہوں کسی طرح ہو وصال؎ تو ہے	۱۹۷	نہ آئے نعش پہ وہ پر یہ احتمال تو ہے
حنا؎ کے رشک سے کیونکر نہ آئے جوش میں خوں		کسی سبب سے ہو پر وہ بھی پائمال تو ہے
ذرا؎ تھم اے دلِ مضطر کہ فکرِ وصل کروں		شبِ قلق نہ سہی خواب بھی خیال تو ہے
زمیں؎ سے لگ گئیں آنکھیں تمھاری طرح نہیں		شریکِ قتل ہو گردوں کو انفعال تو ہے

؎ اگر آسمان مجھے خاک میں بھی ملا دے تو بھی مجھے چاہئے کہ اُسکے ظلم پر شکر کرتا رہوں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اُس آسمان کی عادت بگڑ جائے گی اور وہ اس شکر کو اپنا حق سمجھنے لگے گا۔ اُدھر رقیب کا یہ حال ہے کہ اس اوج کے باوجود آسمان کی شکایت کرتا رہتا ہے۔ بالآخر کسی دن آسمان شکایت پر بگڑ کر اُسکو نیچا دکھائے گا مطلب یہ ہے کہ آسمان تو مجھ ستم زدہ کی شکر گذاری کا خوگر ہوگا۔ رقیب کی شکوہ سنجی (اوج کے باوجود) اُس کو برہم کر دے گی۔ یہ شعر مکر شاعرانہ کی بہت لطیف مثال ہے۔

؎ رشک سے یہ مراد ہے کہ ہمیں یہ بھی گوارا نہیں کہ تم ہمیں چھوڑ کر عدو کو ہلاک کرو۔ نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت۔ مگر اصل میں مکر شاعرانہ ہے جیساکہ دوسرے مصرع سے ظاہر ہے۔

۱۹۷ ؎ اجل سے "وصال" تو حاصل ہوگا۔ گو برا سے نام ہی سہی۔ وصال کے لفظ سے خاص فائدہ لیا ہے۔ ؎ مجھے حنا پر رشک آتا ہے کہ وہ بھی میری طرح پائمال ہے۔ گو اُسکا پائمال ہونا عاشق کا نتیجہ نہیں۔ مطلب یہ کہ "شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری"۔ حنا کو پائمال اسلئے کہا ہے کہ اُس نگارِ رعنا نے پاؤں سے ملی ہے۔ ؎ شبِ قلق (شبِ ہجر) میں خواب نہ سہی (کہ معشوق کا جمال سوتے میں نظر آتا) خیال تو ہے (کہ تصور میں ملاقات کا لطف میسّر ہو) مگر شرط یہ ہے کہ دلِ مضطر ذرا ٹھہرے ورنہ خیال کی یکسوئی معلوم۔ ؎ مجھے اصل میں تم نے قتل کیا ہے مگر اللہ رے بیباکی کہ نام کو نادم نہیں۔ گردوں کو دیکھو کر شریکِ قتل ہو کر اُس کو اپنے فعل پر ندامت تو ہے جسکے باعث اُسکی آنکھیں زمین میں گڑ گئی ہیں آسمان کے خم ہونے کی خوب توجیہ کی ہے حسنِ تعلیل ہے۔

کہاں تلک گلہ ہائے تغافلِ قاتل — ہم آپ کاٹ لیں آخر یہ سر وبال تو ہے

جفائے یار کو سونپا معاملہ اپنا — اب آ گئے ہو نہ ہو اُمید انفصال تو ہے

وہ اضطراب کہاں ضعف سے مگر اب بھی — ہو آؤں حضرتِ عیسیٰ تک اتنا حال تو ہے

شبِ فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں — کہ گو خوشی نہیں ملنے کی پر ملال تو ہے

عبث ترقیِ فن کی ہوس ہے مومن کو
زیادہ ہوئے گا کیا اس سے بے مثال تو ہے

۱۹۸

تسلی دمِ واپسیں ہو چکی — ہمیں ہو چکے جب نہیں ہو چکی

قلق کشتۂ سخت جانی ہے پھر — اُمیدِ اجل آفریں ہو چکی

بلا اس سیہ روز کو بزم میں — شبِ عیش اے مہ جبیں ہو چکی

یہاں دم نہیں شوق سے قتل کر — مرے خوں سے تر آستیں ہو چکی

شہ ضعف کے باعث اگلی سی بے قراری تو باقی نہیں - البتہ اتنی تڑپ اب بھی ہے کہ چرخ چہارم کو چھو آتا ہوں - حضرت عیسیٰ (جو چرخ چہارم پر ہیں) کی تخصیص اسلئے ہے کہ مریضوں کو شفا بخشنے کا معجزہ اُن کو عطا ہوا تھا - سلہ میں شبِ فراق میں بھی زندگی کو عزیز رکھتا ہوں اسلئے کہ گو معشوق سے ملنے کی خوشی حاصل نہیں - نہ ملنے کا ملال تو ہے - یعنی اُس سے یک گونہ نسبت تو حاصل ہے - گو اُسکی نوعیت کچھ ہی کیوں نہو۔

سلہ جب تمھاری نہیں (انکار) ختم ہوئی ہم مرنے کے قریب ہو گئے - ایسی حالت میں تسلی بیسود - ۱۹۸
پہلے مصرع میں تسلی ہو چکی سے مراد یہ ہے کہ تسلی نہیں ہو سکتی -

سلہ اُمید اجل آفریں = موت کو پیدا کرنے والی امید قلق سے اُمید بندھ چلی تھی کہ شاید اسکے اثر سے مجھے موت آجائے - مگر وائے محرومی کہ وہ قلق بھی سخت جانی کے ہاتھوں مٹ گیا - اب یہ توقع بھی نہ رہی کہ مر کر غمِ عشق سے نجات ملے گی - سلہ دیکھو صفحہ ۲۲۸ -

دہ

مری تعزیت میں نہ لا غیر کو — کہاں تک ستم پیشہ کیں ہو چکی

کہو[۴] مرگ سے ہاں نوازش کرے — کہ اُس سے زیادہ نہیں ہو چکی

وہ[۵] ہمدوش ہوگا بھی تو غیر سے — مری قسمت اے شانہ بیں ہو چکی

اب اغیار سے ہاتھا پائی ہے کیوں — نزاکت[۶] بس اے نازنیں ہو چکی

خیالِ اجل سے تسلی کروں — یہ طاقت بھی جانِ حزیں ہو چکی

ثوابت[۷] ہیں سیّار مثلِ شرر — مری آہ کرسی نشیں ہو چکی

جنوں میں بھلا کوئی کیا خاک اُڑائے — کہ اک جوش ہی میں زمیں ہو چکی

کہیں میں ہے مومن وہ کافر صنم
بس اب پاسبانِ دیں ہو چکی

۱۹۹

در بدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے — وہی ہوتا ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے

اِک نظر دیکھے سے سر تن سے جُدا ہوتا ہے — بے جگہ آنکھ لڑی دیکھئے کیا ہوتا ہے

---

۳ تم مجھے شوق سے قتل کرو اور اندیشۂ رسوائی سے مطمئن رہو۔ کیونکہ میں اس قدر ناتواں ہوں کہ میرے خون سے تمھاری آستین کا تر ہونا محال ہے۔ دم کے لفظ میں ایہام ہے۔ ۴ موت کو میں نے بُلایا مگر اُس کا انکار معشوق کے انکار سے بھی بڑھ گیا۔ کوئی اُس سے کہدے کہ اب تو کرم کرے۔
۵ شانہ بیں = فال بتانے والا۔ اے شانہ بیں میری ایسی قسمت کہاں کہ وہ (معشوق) مجھ سے ہمدوش ہو اگر ہوا بھی تو غیر سے ہوگا۔ ۶ یعنی تمھاری نزاکت کے دعوے بس زبانی ہی تھے۔ ۷ ثوابت = وہ ستارے جو اپنی جگہ پر قائم ہیں ضد سیّار۔ کرسی نشیں = مقصود تک پہونچنے والی۔ فائز المرام۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری آہ منزلِ مقصود تک پہونچ گئی جسکے اثر سے ثوابت چنگاریوں کی طرح اُڑتے پھرتے ہیں۔ ثوابت سیّار اور کرسی میں رعایت ہے۔

شوق[1] کم ملنے سے اندوہ فزا ہوتا ہے — ہائے پرہیز سے یہ درد سوا ہوتا ہے
چشم خونبار مری آپ نے تلووں سے ملی — ورنہ ایسا بھی کہیں رنگ حنا ہوتا ہے
جاں بلب ہوں خبر وصل سنا دے قاصد — لب ہلانے میں ترے کام مرا ہوتا ہے
ہو کے آزردہ پشیماں ہوں کہ میں عبث کہوں — وہی کہوے کوئی ایسے سے خفا ہوتا ہے
دل دیا جس نے وہ ناکام رہا تا دم زیست — فی الحقیقت کہ برا کام برا ہوتا ہے
وار ہیں حشر تلک بہر دعا گو لب زخم — پر ترا حق نمک کوئی ادا ہوتا ہے
زہر[2] نوش غم شیریں نے کہا خسرو سے — تلخی مرگ میں شکر کا مزا ہوتا ہے
واقعی سجدۂ در ایسی ہی تقصیر ہے اب — جو ر جو بندہ پہ ہوتا ہے بجا ہوتا ہے
اے دل آ جانے دے اس زلف مسلسل کا خیال — جان کر کوئی گرفتار بلا ہوتا ہے
دل[3] میں اتنا تو سمایا ہے کہ جل جاتا ہوں — سرو نو خیز جو انگشت نما ہوتا ہے
ناتوانی مری مت پوچھ کہوں کیا ہمدم — بات کہنے میں میرا دم ہی ہوا ہوتا ہے
چاک[4] پیراہن گل پر تو نہ پھول اے بلبل — جامہ یاران لباسی کا قبا ہوتا ہے

ہو نہ بیتاب غم ہجر بتاں میں مومن
دیکھ دو دن میں بس اب فضل خدا ہوتا ہے

۱۹۹ [1] اندوہ فزا = غم بڑھ جانے والا۔ کم ملنے کو پرہیز سے اور شوق یا عشق کو درد سے تعبیر کیا ہے۔
[2] زہر نوش غم شیریں = شیریں کے غم میں زہر پینے والا یعنی فرہاد۔ زہر۔ شیریں۔ تلخی۔ شکر میں جو نسبت ہے مخفی نہیں۔ [3] تو اسقدر میرے دل میں سمایا ہے کہ "ہر چہ آید در نظر اے یار پندارم توئی"۔ یہانتک کہ اگر کوئی سرو نوخیز کی طرف بطور تحسین انگلی اٹھاتا ہے تو میں اسکو تیرے قامت رعنا کی شبیہ سمجھکر رشک سے جلجاتا ہوں کیونکہ میری غیرت اسکو بھی پسند نہیں کرتی کہ لوگ میرے بلند بالا محبوب (یا اسکی شبیہ) کا ذکر کریں۔
[4] نہ پھول = ناز نہ کر۔ لباسی = خوشامدی ریاکار۔ قبا ہونا۔ قبا شدن (فارسی محاورہ) کا ترجمہ ہے یعنی پارہ پارہ ہونا۔ چاک ہونا۔ اے بلبل گل کے پیرہن کے چاک ہونے پر ناز نہ کر یعنی یہ نہ سمجھ کہ گل نے میری محبت میں جامہ دری کی ہے۔ کیونکہ پیرہن کا چاک کرنا ریاکار لوگوں کا کام ہے۔ شاعر نے "لباسی" کے ایہام سے فائدہ اٹھایا ہے۔

۲۰۰ اجل[۱] جاں بلب اُسکے شیون سے ہے — یہ نادم مرے زود کشتن سے ہے

وہ[۲] بدخواہ مجھ سا تو میرا نہیں — عبث دوستی تم کو دشمن سے ہے

یہ[۳] پردہ نہ ہو نیشِ زنبور کا — مشبک مرا سینہ چلون سے ہے

مرے داغ یاد آئے گل دیکھکر — کہ بیزار وہ سیرِ گلشن سے ہے

جلانے[۴] سے بھی تیرے شاکر ہوں میں — گلہ نالۂ آتش افگن سے ہے

شبِ[۵] غم موئے شمع کو دیکھکر — ہمیں خجلت اُس شوخ بدظن سے ہے

مرا خون گیا یار گردن ہوا — کہ بیتاب وہ درد گردن سے ہے

دکھلائیے[۶] نہ کیوں سرمہ گوسالہ کو — خجل سامری چشم پُرفن سے ہے

۲۰۰ لہ شیون = شور ماتم۔ معشوق میرے جلد ہلاک کرنے سے اسقدر شرمندہ ہوا ہے کہ برابر مصروف شیون و فریاد ہے۔ اُسکی یہ حالت دیکھکر اجل (جیسی سنگدل) بھی جاں بلب ہوگئی ہے۔ اجل کے جاں بلب ہونے کی یہ وجہ ہے کہ وہ بھی شریک جرم تھی۔ جان بلب کی صفت اجل کے لئے خاص ندرت ہے معشوق کی شرمندگی و ندامت کا سبب شاید یہ ہو کہ اُس نے عاشق کو جلد کیوں قتل کر دیا۔ اب مشق جفا کس پر ہوگی۔ کہ دشمن (رقیب) سے تم کو دوستی ہے اور وہ میرا بدخواہ ہے۔ اسکے معنی یہ ہوئے کہ تمھیں میرے بدخواہ سے محبت ہے۔ مگر یہ خیال رہے کہ وہ اس قدر میرا بدخواہ نہیں جس قدر میں خود اپنا بدخواہ ہوں۔ اسلئے مجھ سے تم کو بدرجہ اولی دوستی چاہئے۔

سہ نیش زنبور = بھڑ کا ڈنک۔ مشبک = سوراخدار۔ میرا سینہ چلون (چلمن) کی بدولت چھد گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درِ یار کا پردہ (تیلیوں کے بجائے) نیش زنبور سے بنا ہے۔ سینہ کے مشبک ہونے کی وجہ یہ ہے کہ چلمن نظارۂ دلدار سے مانع ہے۔ کہ تیری نوازش تو درکنار۔ میں تیرے جلانے کا بھی شکرگذار ہوں۔ اگر شکایت ہے تو اپنے نالۂ آتش افگن سے ہے کہ دنیا میں آگ لگا دیتا ہے مگر تیرے دل پر اثر نہیں کرتا۔ ہہ شب ہجر میں شمع کو دیکھکر ہمیں اپنے نگار شعلہ رو کی یاد آئی اور جان نکل گئی۔ اب اُس بدگماں سے شرمندگی ہے۔ مبادا وہ یہ خیال کرے کہ یہ شمع پر عاشق تھا جو اُسکو دیکھتے ہی پروانہ کی طرح نثار ہوگیا۔ لہ سامری ایک کافر جادوگر تھا جس نے اپنی عیاری سے ایک سونے کا گوسالہ (بچھڑا) بنا یا جو بولتا تھا۔ آخر اُس کے اغوا سے بنی اسرائیل اُسکی پرستش کرنے لگے۔ سامری محبوب کی چشم جادو کو دیکھکر شرمندہ ہے اور اپنے سحر کو باطل کرنے پر آمادہ۔ واضح رہے کہ سرمہ کھانے سے آواز بیٹھ جاتی ہے۔ سرمہ کی مناسبت چشم کے ذکر کے ساتھ ظاہر ہے۔

جہاں۴۹ خاک اُڑائی وہیں دب رہے ہے
کدورت عبث فکر مدفن سے ہے

نئی کچھ نہیں اپنی جانبازیاں
یہی کھیل ہم کو لڑکپن سے ہے

بگڑتے ہو کیا اب بھی کہتا ہوں میں
عیاں صلح پھر کس کی چتون سے ہے

دلِ۵۰ مومن آتشکدہ کیوں بنے
لگاوٹ یہ طفلِ برہمن سے ہے

۲۰۱

ہے۱ دل میں غبار اُسکے گھر اپنا نہ کرینگے
ہم خاک میں ملنے کی تمنّا نہ کرینگے

کیونکر یہ کہیں منتِ اعدا نہ کرینگے
کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کرینگے

ہنس ہنس کے وہ مجھ سے ہی مرے قتل کی باتیں
اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا نہ کرینگے

کیا نامہ میں لکھوں دلِ۲ وابستہ کا احوال
معلوم ہے پہلے ہی کہ وہ وا نہ کرینگے

غیروں۳ سے شکرلب سخنِ تلخ بھی تیرا
ہرچند ہلاہل ہو گوارا نہ کرینگے

بیمار۴ اجل چارہ کو گر حضرت عیسیٰ
اچھا بھی کرینگے تو کچھ اچھا نہ کرینگے

۴۹ جنوں میں جہاں خاک اُڑائی وہیں ہمارا مدفن ہوگیا۔ پھر فکر مدفن بیکار ہے۔ خاک اور کدورت میں جو خوبی ہے ظاہر ہے۔

۵۰ جب طفل برہمن سے محبت ہے تو کیا وجہ ہے کہ مومن کا دل سوزِ غم سے آتشکدہ بن گیا، کیونکہ آتشکدوں کا تعلق برہمنوں سے نہیں بلکہ آتش پرستوں سے ہوتا ہے۔

۲۰۱ ۱ محبوب کے دل میں ہماری طرف سے غبار ہے۔ ایسی صورت میں ہم اُسکے دل میں گھر کرنا پسند نہ کرینگے۔ کیونکہ ایسا کرنا خاک میں ملنے کے مترادف ہوگا۔ غبار اور خاک میں رعایت ہے۔ ۲ وابستہ = دلگیر، مغموم۔ وابستہ اور وا میں ایہام تضاد ہے۔ ۳ شکرلب = شیریں لب ہمیں یہ گوارا نہیں کہ تو غیروں سے باتیں کرے۔ خواہ وہ زہر ہلاہل کی طرح تلخ کیوں نہ ہوں۔ ۴ بیمار اجل چارہ = وہ بیمار جس کا علاج صرف موت ہو۔ یہ مومن کی مخصوص تراکیب میں سے ہے ایسے بیمار کے لئے شفا اچھی نہیں مرنا ہی بہتر ہے۔

جھنجھلاتے ہو کیا دیجئے اک بوسہ دہن کا
ہو جائینگے لب بند تو غوغا نہ کرینگے

دیوار کے گر پڑتے ہی اُٹھنے لگے طوفاں
اب بیٹھ کے کونے میں بھی رویا نہ کرینگے

گر سامنے[۵۵] اُسکے بھی گرے اشک تو دل سے
کیوں روزِ جزا خون کا دعویٰ نہ کرینگے

کس وقت کیا مردمکِ[۵۶] چشم کا شکوہ
اے پردہ نشیں ہم تجھے رسوا نہ کرینگے

ناصح کفِ افسوس نہ مل چل تجھے کیا کام
پامال کرینگے وہ مجھے یا نہ کرینگے

اُس کو میں ٹھہرنے نہ دیا جوشِ قلق نے
اغیار سے ہم شکوۂ بیجا نہ کرینگے

گر ذکرِ وفا سے بھی غصہ ہے تو اب سے
گو[۵۷] قتل کا وعدہ ہو تقاضا نہ کرینگے

مومن وہ غزل کہتے ہیں اب جس سے یہ مضمون
کھل جائے کہ ترکِ درِ بتخانہ نہ کرینگے

۲۰۲ توبہ[۱] ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کرینگے
وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کرینگے

ٹھہری[۲] ہے کہ ٹھہرائینگے زنجیر سے دل کو
پر برہمیِ زلف کا سودا نہ کرینگے

اندیشۂ مژگاں میں اگر خوں نے کیا جوش
نشتر سے علاجِ دلِ دیوانہ نہ کرینگے

۵۵ اگر محبوب کے سامنے بھی میرے اشک گرے تو بھی وہ (اشک) اُس کو ملزم نہ ٹھہرائینگے بلکہ قیامت میں دل ہی پر اپنے خون کا دعویٰ کرینگے - کیونکہ یہی تمام مصائب کا ذمہ دار ہے - اب دل پر دعویٰ کرنا بولتے ہیں - ۵۶ اس میں رعایت یہ ہے کہ مردمکِ چشم (پتلی) بھی پردہ نشین ہے - ۵۷ یعنی اب ہم وفائے وعدہ قتل پر بھی اصرار نہ کرینگے مگر شاعرانہ ہے -

۲۰۲ ۱ شاعر عشق بتاں سے توبہ کر رہا ہے - ابتک اسکو یہ توفیق نصیب نہ ہوئی تھی - آئندہ بھی اس (توبہ) کی نوبت نہ آئے گی کیونکہ جب گناہ (عشق) ہی نکرے گا تو توبہ کی کیا احتیاج - پوری مسلسل غزل واسوخت کے رنگ میں ہے -

۲ یعنی دل آشفتہ کو باندھکر رکھیں گے - مگر زلف برہم کے دیوانے نہ بنیں گے مناسبت الفاظ ظاہر ہے -

گر آرزوے وصل نے بیمار کیا تو
پرہیز کرینگے پہ مداوا نہ کرینگے

تشبیہ[۳] زبس دیتے ہیں لبہاے بتاں کو
مرجائیں گے پر منت عیسیٰ نہ کرینگے

پھر جائے نہ تا چشم صنم آنکھ کے آگے
سیر چمن نرگس شہلا[۴] نہ کرینگے

رکھ لیوینگے پتھر مگر ان سنگدلوں کو
چھاتی سے لگانے کی تمنا نہ کرینگے

گو دار[۵] پہ کھینچیں ہمیں دلدار نصاری
پر آرزوے زلف چلیپا نہ کرینگے

گر حسن[۶] گلو سوز نے پھر آگ لگائی
کیوں آب دم تیغ سے ٹھنڈا نہ کرینگے

ہے عہد کہ پھر جا نہ پھریں کوے بتاں میں
پھر جائیں اب اس عہد سے ایسا نہ کرینگے

کہتے ہیں یہ ہم جائے خاک ہمیں ہوں گو خاک
پر اب تو زمیں بوس کلیسا نہ کرینگے

جوں[۷] قبلہ نما گرچہ تڑپتے ہی کٹے عمر
پر منہ سوئے دیر صنم آرا نہ کرینگے

ق

اے حضرت مومن یہ مسلّم جو ہے ارشاد
بھولے سے بھی اب ذکر بتوں کا نہ کرینگے

لیکن جو بتوں نے ہی بھلا آپ کی بات
پھر آپ ہی فرمائیں کہ کیا کیا نہ کرینگے

---

[۳] جاں بخشی کے اعتبار سے لبہاے بتاں کو حضرت عیسیٰؑ سے تشبیہ دیجاتی ہے۔ [۴] نرگس شہلا: نرگس جس میں زردی کے بجاے سرخی مائل سیاہی ہو۔ ضد عبہر۔ چشم صنم کو نرگس شہلا سے تشبیہ دیتے ہیں۔

[۵] دار = سولی۔ دلدار نصاری = مسیحی معشوق۔ چلیپا = + صلیب جس پر عیسائیوں کے عقیدے میں جناب مسیحؑ کو ہلاک کیا گیا تھا۔ زلف چلیپا = زلف پُر خم۔ [۶] حُسن گلوسوز = حُسن شیریں یعنی حُسن صبیح۔ گلوسوز اسلیئے کہا ہے کہ زیادہ شیرینی سے حلق جل جاتا ہے۔ اگر حُسن گلوسوز نے آگ لگائی تو ہم اس (آگ) کو آب دم تیغ سے ٹھنڈا کرینگے یعنی اپنے آپ کو تیغ سے ہلاک کرکے جوش عشق کو فرو کرینگے۔

[۷] قبلہ نما = ایک آلہ جس کی سوئی ہر طرف گھوم کر قبلہ کی سمت قائم رہتی ہے۔ دیر صنم آرا = وہ دیر جس کی زینت بتوں سے ہو۔

۲۰۳

نہ کٹی ہم سے شب جدائی کی — کتنی ہی طاقت آزمائی کی

رشکِ[1] دشمن بہانہ تھا سچ ہے — میں نے ہی تم سے بیوفائی کی

کیوں بُرا کہتے ہو بھلا ناصح — میں نے حضرت سے کیا بُرائی کی

دل[2] عاشق ہے دل دہی نہ تم — دل کو چھینا تو دلربائی کی

آسے[3] وہ دستِ غیر میں دئے ہاتھ — آس ٹوٹی شکستہ پائی کی

گر نہ بگڑو تو کیا بگڑتا ہے — مجھ میں طاقت نہیں لڑائی کی

گھر تو اُس ماہوش کا دور نہ تھا — لیک طالع نے نارسائی کی

مر گئے پڑے رہے بے خبر صیاد — اب توقع نہیں رہائی کی

کوچۂ[4] غیر میں ملا وہ ہمیں — ہرزہ تازی نے رہنمائی کی

دل[5] ہوا خون خیالِ ناخنِ یار — تو نے اچھی گرہ کشائی کی

مومن آؤ تمھیں بھی دکھلادوں
سیر بتخانہ میں خدائی کی

۲۰۳ ۱؎ میں نے رشکِ دشمن کا محض بہانہ رکھکر تم سے دوستی ترک کی۔ در اصل میں ہی بیوفائی کا مجرم ہوں۔ شاعر نے محبوب کے الزام کو طنزاً درست مانا ہے۔ ۲؎ دل دہی = دلجوئی۔ نوازش۔ عاشق کو گرویدہ کرنیکا ذریعہ مہربانی ہے نہ کہ ظلم۔ اگر تم نے دل چھینا تو اس کو کوئی دلربائی کہے گی۔ دلدہی نہ کہے گی۔ ۳؎ میں شکستہ پا تھا اور اُمید رکھتا تھا کہ دوست شاید میری عیادت کو آئے۔ وہ آیا تو ضرور مگر رقیب کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے۔ آہ میری شکستہ پائی نے جو توقعات قائم کر لی تھیں سب نقش بر آب ثابت ہوئیں۔ ۴؎ ہرزہ تازی = آوارہ گردی۔ بیہودہ پھرنا۔ ہم آوارہ پھرتے پھرتے کوچۂ غیر میں پہونچ گئے اور وہاں معشوق موجود ملا۔ اس طرح آوارہ گردی نے مقصود تک رہنمائی کی۔ ۵؎ عشق کی بدولت میرے دل میں غم کی گرہ پڑ گئی تھی۔ ناخن یار کے تصور نے دل کو یکسر خون کر ڈالا۔ اس طریقہ دل کی گرہ تو کھل گئی مگر دل کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ ناخن سے گرہ کشائی کا کام لیا جاتا ہے۔ شعر میں طنز کا پہلو ہے۔

شب[۱] تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے	۲۰۴	کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے
پوچھا[۲] کسی پہ مرتے ہو اور دم نکل گیا		ہم جان سے عناں بہ عنانِ صدا گئے
پھیلی[۳] وہ بُو جو ہم میں نہاں مثلِ غنچہ تھی		جھونکے نسیم کے یہ نیا گُل کھلا گئے
اے[۴] آبِ اشک آتشِ عنصر ہے دیکھنا		جی ہی گیا اگر نفسِ شعلہ زا گئے
مجلس[۵] میں اُس نے پان دیا اپنے ہاتھ سے		اغیار سبز بخت تھے ہم زہر کھا گئے
اُٹھا[۶] نہ ضعف سے گُلِ داغِ جنوں کا بوجھ		قاروں کی طرح ہم بھی زمیں میں سما گئے
غیروں[۷] سے ہو وہ پردہ نشیں کیوں نہ بے حجاب		دمہائے بے اثر مرے پردہ اُٹھا گئے
تھی بدگمانی اب اُنھیں کیا عشق چور کی		جو آ کے مرتے دم مجھے صورت دکھا گئے

۲۰۴ [۱] آنکھیں چرانا = اغماض برتنا - کھویا جانا = خفیف ہونا - پا جانا = تاڑ جانا - یعنی تمھارے اغماض کرنے کیوجہ سے میں سب کے سامنے سبک ہوا اور رقیب بھی میری حالت کو تاڑ گئے۔

[۲] پوچھا کا فاعل معشوق (محذوف) ہے - عنان بہ عنانِ صدا = آواز کے ساتھ ساتھ -

[۳] نسیم بہار کے جھونکوں نے یہ نیا گُل کھلایا کہ اُنکے چلنے سے وہ بو (بوئے جنون یا عشق) جو ہمارے دل میں غنچہ کی طرح چھپی ہوئی تھی دنیا میں پھیل گئی - جوشِ جنوں (جو لازمۂ عشق ہے) کا تعلق نسیم سے شعرا کے یہاں عامۃ الورود ہے - الفاظ کی مناسبت ملحوظ رہے۔

[۴] عُنصُر = اصل - آتش و آب و خاک و باد کو عناصر کہتے ہیں - میری شعلہ انگیز آہیں میرے حق میں آتشِ عنصری کا حکم رکھتی ہیں - جس کی ترکیب پر نظامِ زندگی کا انحصار ہے - اے آبِ اشک دیکھ اس آگ (آہ) کو نہ بجھانا ورنہ میری زندگی محال ہے - [۵] پان دیا کا مفعول اغیار ہے - سبز بخت = خوش نصیب - پان کی رعایت سے سبز بخت اور زہر استعمال کیا ہے - [۶] داغِ جنوں = زخموں کے نشان جو دیوانگی میں جسم پر رہجائیں - داغ کی تشبیہ گُل سے عام ہے - مطلب یہ ہے کہ ناتوانی کے باعث ہم سے یہ بوجھ بھی نہ اُٹھا - آخر قارون کی طرح زندہ درگور ہوگئے -

[۷] معشوق کی بے حجابی کی خوب وجہ بیان کی ہے - کہتا ہے کہ میری بے اثر آہوں نے اُس کا پردہ اُٹھا دیا یعنی اُس کو بے پردگی پر دلیر کر دیا - آہ کو (جو ہوا کی طرح ہے) پردہ اُٹھانے کا باعث قرار دیا ہے ماحصل یہ ہے کہ اگر میری آہ میں تاثیر ہوتی تو یہ نوبت نہ آتی -

تابندہ[۸] و جوان تو بختِ رقیب تھے		ہم تیرہ روز کیوں غمِ ہجراں کو بھا گئے
بیزار[۹] زندگانی کا جینا محال تھا		وہ بھی ہماری نعش کو ٹھوکر لگا گئے
واعظ[۱۰] کے ذکرِ مہرِ قیامت کو کیا کہوں		عالم شبِ وصال کے آنکھوں میں چھا گئے
جس وقت اُس دیار سے اغیار بوالہوس	ن	بدخوئیوں سے یار کی ہو کر خفا گئے
دنیا ہی سے گیا میں جو ہیں ناز سے کہا		اب بھی گمان بد نہ گئے تیرے یا گئے

اے مومن آپ کب سے ہوئے بندۂ بتاں
بارے ہمارے دین[۱۱] میں حضرت بھی آ گئے

از بس[۱] جنوں جدائیِ گُل پیرہن سے ہے	۲۰۵	دل چاک چاک نغمۂ مرغِ چمن سے ہے
سرگرم[۲] مدحِ غیر دمِ شعلہ زن سے ہے		دوزخ کو کیا جلن مرے دل کی جلن سے ہے

۸ تابندہ = روشن - غمِ ہجراں کو چاہئے تھا کہ رقیب کو پسند کرتا - ہم سیاہ بختوں کو ناحق پسند کیا - ۹ محبوب کی ٹھوکر میں یوں تو جان بخشی کی صفت مسلّم ہے مگر میں دراصل خود زندگی سے بیزار تھا - یہی وجہ تھی کہ اُسکی ٹھوکر کے باوجود زندہ نہ ہوا - ۱۰ واعظ کے بیان پر مجھے "زمانۂ وصال کی تجلی یار" (جو جلوہ آفتاب قیامت سے مشابہ تھی) یاد آگئی - ۱۱ دین سے یہاں مراد بت پرستی ہے -

۲۰۵ ۱ مرغِ چمن (بُلبُل) کے نغمے سنکر یہ خیال آتا ہے کہ یہ گُل پر عاشق ہے اور گُل سے مجھے اپنے گُل پیرہن کی یاد آتی ہے جس سے دل چاک چاک ہو جاتا ہے - دیوانہ را ہوسے بس است -

۲ دوزخ اپنے شعلوں کی لپٹوں سے رقیب کی مدح میں سرگرم ہے اور میرے سوزِ دل کی (جو دوزخ سے کہیں زیادہ ہے) تعریف نہیں کرتی - اسکی وجہ یہ ہے کہ اُس (دوزخ) کو میرے دل کی جلن پر رشک آتا ہے - یعنی چونکہ وہ سوز میں مجھ سے کمتر ہے اسلئے مجھ پر حسد کرتی ہے اور میرے جلانے کے لئے رقیب کی (جو سوزِ عشق سے خالی ہے) تعریفیں کرتی ہے -

روزِ جزا نہ دے جو مرے قتل کا جواب
وہ ہم سخن رقیب کی اُس کم سخن سے ہے

یاد آگیا زبس کوئی مہ روئے مہروش
اُمید داغ تازہ سپہر کہن سے ہے

۵۳ کچھ بھی کیا نہ یار کی سنگیں دلی کا پاس
سب کاوشِ رقیب بجا کوہکن سے ہے

۵۴ اُن کو گماں ہے گلۂ چینِ زلف کا
خوشبو دہانِ زخم جو مشکِ ختن سے ہے

۵۵ میں کیا کہ مرگِ غیر پہ دامان تر نہ ہو
وہ اشک ریز خندۂ چاکِ کفن سے ہے

۵۶ کیونکر نجات آتشِ ہجراں سے ہو کہ مرگ
آئی تو دور ہی تب و تابِ بدن سے ہے

۵۷ خود رفتگی میں چین وہ پایا کہ کیا کہوں
غربت جو مجھ سے پوچھو تو بہتر وطن سے ہے

۵۳ یار سے شیریں اور رقیب سے خسرو مراد ہے۔ کوہکن نے پتھر کاٹ کر نہر نکالی اور اپنی محبوبہ کی سنگدلی کا پاس نہ کیا۔ یعنی پاس ادب کا تقاضا تو یہ تھا کہ پتھر کو دلِ یار سے مشابہ سمجھ کر اُس کا احترام کرتا۔ مگر نہ کیا۔ اسلئے خسرو کی دشمنی اُس سے بالکل حق بجانب ہے۔

۵۴ مشک زخم میں کاٹ کرتا ہے۔ عاشق ایذا پسند نے اپنے زخم پر مشک ختن لگایا جس سے دہانِ زخم میں خوشبو آنے لگی۔ مگر محبوب کو یہی گمان ہے کہ دہانِ زخم نے میرے زلفِ مشکیں کی شکن کا گلہ کیا ہے۔ جس کے اثر سے یہ بوئے خوش پیدا ہوگئی ہے۔

۵۵ چاک کفن کو لبِ خنداں سے تشبیہ دیجاتی ہے۔ عاشق کی میت پر آکر معشوق روتا ہے۔ جس سے لوگوں کو اُسکی نرم دلی کا گمان ہوسکتا تھا۔ مگر عاشق کہتا ہے کہ وہ اسقدر سخت دل ہے کہ میں تو کس شمار میں ہوں۔ رقیب کی موت پر بھی نہ روئے گا۔ در اصل وہ ظالم میرے چاک کفن کے ہنسنے پر اشک بار ہے کہ کم نصیب مرنے والے کو براے نام مسرت بھی کیوں نصیب ہوئی۔

۵۶ آتشِ ہجراں سے نجات کی صورت یہ تھی کہ مر جاتا۔ مگر موت آئی بھی تو بدن کی گرمی (جو آتشِ ہجراں کا نتیجہ ہے) کے خوف سے دور ہی کھڑی رہی۔ ۵۷ خودرفتگی کو غربت سے تشبیہ دی ہے۔

رشکِ[8] پری کہے سے عدو کے یہ وحشتیں
نفرت بلا تمھیں مرے دیوانہ پن سے ہے

داغِ[9] جنوں کو دیتے ہیں گُل سینے بس مثال
میں کیا کہ عندلیب کو وحشت چمن سے ہے

کیوں[10] یار نوحہ زن میں کہاں مرگ مجھکو تو
لب بستگی تصورِ بوسِ دہن سے ہے

کیا کیا جواب شکوہ میں باتیں بنا گیا
لو اب بھی دل درست اسی دل شکن سے ہے

اپنا[11] شریک بھی نہ گوارا کرے بتو
مومن کو ضد یہ کیش بد برہمن سے ہے

۲۰۶

وہ کہاں[12] ساتھ سُلاتے ہیں مجھے
خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے

اُس[13] پری وش سے لگاتے ہیں مجھے
لوگ دیوانہ بناتے ہیں مجھے

یارب اُن کا بھی جنازہ اُٹھے
یار اُس کو سے اُٹھاتے ہیں مجھے

ابروے[14] تیغ سے ایما ہے کہ آ
قتل کرنے کو بلاتے ہیں مجھے

بیوفائی[15] کا عدو کی ہے گلہ
لطف میں بھی وہ ستاتے ہیں مجھے

۸ بلا = بلا کی۔ غضب کی۔ تمھیں میرے دیوانہ پن سے بلا کی نفرت ہے کہ رقیب تک اگر تمھیں رشکِ پری کہہ دیتا ہے تو چراغ پا ہو جاتے ہو۔ یعنی چونکہ پری کا سایہ پڑنے سے آدمی دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اس واسطے تمھیں اتنی نسبت بھی اپنے دیوانہ سے گوارا نہیں جو پری۔ وحشت۔ بلا۔ دیوانہ میں جو نسبتیں ظاہر ہے۔ ۹ میری وحشت کا کیا پوچھنا۔ بلبل جو گل پر عاشق ہے اُس کو بھی میری نسبت کی وجہ سے جنون کا خلل ہو گیا اور چمن سے وحشت ہونے لگی ہے۔ ۱۰ میں مرا نہیں ہوں۔ بلکہ بوسۂ دہانِ یار کے تصور میں میرے لب بند ہو گئے ہیں۔ "مجھکو تو" کا تعلق دوسرے مصرع سے ہے۔ ۱۱ مومن کو برہمن کے مذہب بد یعنی شرک سے اسقدر ضد ہے کہ خدا کا شریک تو درکنار۔ اُس (مومن) کو اپنا شریک بھی گوارا نہیں۔ اس میں لطافت یہ ہے کہ مومن بھی بتوں کا پرستار ہے اور برہمن بھی اس لحاظ سے دونوں ایک دوسرے کے شریک ٹھہرے۔

۱۲ خواب میں دیکھتا ہوں کہ دوست سے ملاقات ہوئی۔ مگر خواب کی بات کا کیا اعتبار۔ خواب سے مراد فرضی منصوبے بھی ہو سکتے ہیں۔ ۱۳ لگانا = متہم کرنا۔ ۱۴ تیغ کو خم کے اعتبار سے ابرو کہا ہے۔ اور ابرو کا کام ہے ایما (اشارہ) کرنا۔ ۱۵ مطلب یہ ہے کہ "ذکر اُس کا یہ بدی بھی مجھے منظور نہیں"۔ ۲۰۶

۵ حیرتِ حسن سے یہ شکل بنی
کہ وہ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

۶ پھونک دے آتشِ دل داغ مرے
اُس کی خو یاد دلاتے ہیں مجھے

گر کہے غمزہ کسے قتل کروں
تو اشارت سے بتاتے ہیں مجھے

میں تو اُس زلف کی بو پر غش ہوں
چارہ گر مشک سونگھاتے ہیں مجھے

۷ شعلہ رو کہتے ہیں اغیار کو وہ
اپنے نزدیک جلاتے ہیں مجھے

۸ جاں گئی پر نہ گئی جور کشی
بعد مردن بھی دباتے ہیں مجھے

۹ وہ جو کہتے ہیں تجھے آگ لگے
مژدہ وصل سناتے ہیں مجھے

۱۰ اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں
تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

مومن اور دیر خدا خیر کرے
طور بیڈھب نظر آتے ہیں مجھے

۵ حیرتِ حسن سے میری یہ صورت ہوگئی کہ مردہ کا دھوکا ہوتا ہے چنانچہ وہ زندگی اور موت کی تمیز و تحقیق کی غرض سے مجھے آئینہ دکھاتے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ سکتہ کی حالت میں امتحان کی غرض سے آئینہ مُنہ کے قریب رکھا جاتا ہے۔ ۶ داغوں کی سوزش سے یار کی آتش خوئی یاد آتی ہے۔

۷ میرے جلانے کے لئے وہ غیر سے اس طرح خطاب کرتے ہیں جیسے کوئی کسی حسین کو مخاطب کرے مثلاً شعلہ رو۔ ۸ مرنے کے بعد مٹی میں دبانے کو جور قرار دیا ہے۔ ۹ محبوب کے کوسنے کی توجیہ بطور تاویل الکلام بما لا یرضی بہ قائلہ خوب کی ہے۔ چونکہ وہ آتشیں خو خود آگ ہے۔ اسلئے شاعر نے اس طرح تفاؤل کیا۔ ۱۰ میری ناتوانی اب اس حد تک پہونچ گئی کہ احباب مجھے معشوق سے چھپاتے ہیں کہ مبادا ضعف کے باعث جذبہ فرط مسرت کی تاب نہ لاسکوں اور مر جاؤں یا یہ کہ میری حالت اسقدر ردی ہے کہ معشوق دیکھنے کا تحمل نہ کر سکیگا

۲۰۷

جذبۂ دل ۱؎ زور آزمانا چھوڑ دے — پائے نازک کا ستانا چھوڑ دے

جان ۲؎ سے جاتی ہیں کیا کیا حسرتیں — کاش وہ دل میں بھی آنا چھوڑ دے

حال دکھلاتا ہوں شاید شرم سے — غیر اُس کو منہ دکھانا چھوڑ دے

گوشِ نازک پر کسی کے رحم کر — جوشِ افغاں غل مچانا چھوڑ دے

داغ ۳؎ سے میرے جہنم کو مثال — تو بھی واعظ دل جلانا چھوڑ دے

پردہ کی کچھ بھی اُسے پردہ نشیں — کھل سکے دل بس منہ چھپانا چھوڑ دے

ہوں ۴؎ وہ مجنوں کہ میں زنداں میں ہوں — فصلِ گل گلشن میں آنا چھوڑ دے

لب ۵؎ پہ حرفِ آرزو کا خوں ہوا — رنگِ پاں کا منہ لگانا چھوڑ دے

ہم نہیں اُٹھنے کے تیری بزم سے — پاس غیروں کا بٹھانا چھوڑ دے

اُس ۶؎ دہن کو غنچہ اے دل کیا کہوں — ڈر لگے ہے مسکرانا چھوڑ دے

وصل میں بھی دل سے غم جاوے کہاں — کیا کوئی اپنا غم کھانا چھوڑ دے

۲۰۷ ۱؎ میرے جذبۂ دل سے مجبور ہوکر وہ نازنین بیتابانہ میرے گھر آتا ہے اور مجھے اُسکے پائے نازک کی تکلیف شاق گزرتی ہے۔ ۲؎ کاش محبوب تصور میں بھی نہ آیا کرے۔ کیونکہ اُسکے آنے سے حسرتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور آخر کو فنا ہو جاتی ہیں۔ اگر وہ تصور میں نہ آئے تو یہ تو بنتے ہی کیوں آتے۔ ۳؎ مطلب یہ ہے کہ میرا داغِ دل سوزش میں جہنم سے کہیں زائد ہے۔

۴؎ یعنی فصلِ گل گلشن میں محض اس غرض سے آیا کرتی ہے کہ میرے جوشِ جنوں کو برانگیختہ کرے۔ جب میں زنداں میں ہونگا تو بہار کے گلشن میں آنے کی کیا ضرورت ہوگی۔

۵؎ تو نے اپنے لب سے میری التجا پر انکار کر دیا۔ گویا تیرے لب پہ میرے حرفِ آرزو کا خون ہوگیا۔ ایسی حالت میں رنگِ پان کا منہ لگانا بیکار ہے۔ سُرخی لب کے لئے یہی خون کافی ہے۔

۶؎ محبوب کے دہن کو غنچہ کہنا درست نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اس حقیر تشبیہ سے برہم ہوکر مسکرانا ترک کر دے۔ واضح رہے کہ غنچہ میں (جب تک وہ غنچہ ہے) مسکراہٹ نہیں ہوتی۔

آہ[۴] میری کب دعاسے نوح تھی
ناتوانی[۵] سے نزاکت ہے زیاد

چشمِ تر طوفاں اُٹھانا چھوڑ دے
مجھ سے تو دامن چُھڑانا چھوڑ دے

گر ہے[۶] مومن روزۂ وصلِ بتاں
تو غمِ فرقت بھی کھانا چھوڑ دے

۲۰۸

پھر[۷] سینہ سوز داغِ غمِ شعلہ فام ہے
پھر گرمجوشیِ دل و سودائے خام ہے

ہر مو[۸] پہ پھر ہے طائرِ مجنوں کا آشیاں
پھر فوج فوج سر پہ مرے ازدحام ہے

پھر زیب[۹] سر ہے شعلۂ داغِ جنوں سے تاج
پھر دورباش نالہ اثر اہتمام ہے

پھر دل ہے داغ مطلعِ خورشید[۱۰] دیکھ کر
از بسکہ یاد جلوۂ بالائے بام ہے

اُس[۱۱] آہوئے رمیدہ کو پھر ڈھونڈتا ہے دل
رم کردہ شوق وصل پھر اِک صیدِ رام ہے

۴ه جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا پر زمین سے پانی کا عالمگیر طوفان برپا ہوا تھا۔ اسی طرح عاشق کی آہ پرچشمِ تر سے سیلاب آگیا۔ اس پر وہ اپنی چشمِ تر سے کہتا ہے کہ یہ طوفان کیوں اُٹھایا ہے۔ کیا میری آہ دعائے نوح تھی۔ ۵ه تو نازک ہے میں ناتواں ہوں۔ مگر تیری نزاکت میری ناتوانی سے بڑھی ہوئی ہے۔ اسلئے اگر تو نے مجھ سے دامن چُھڑالیا تو تیری نزاکت پر حرف آئے گا۔

۶ه روزہ یہاں صوم کے لغوی معنی میں لکھا ہے۔ یعنی کسی چیز کے تمتع سے محرومی

اگر وصلِ بتاں حاصل نہیں ہوتا تو غمِ جدائی بھی کیوں برداشت کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ روزہ میں کوئی چیز
۲۰۸ کھائی نہیں جاتی۔ ۷ه سینہ سوز = سینہ جلانیوالا۔ شعلہ فام = نگار شعلہ رو۔ گرمجوشی = اختلاطِ سودائے خام تمنائے لاحاصل۔ پھر ایک شعلہ رو کا داغِ عشق سینہ سوز ہے اور پھر دل اور سودائے خام میں اختلاط ہوا ہے۔ پوری غزل مسلسل ہے۔ ۸ه طائر مجنوں = مرغِ مجنوں۔ تفعیل اوپر گذری۔ فوج فوج سے کثرت مقصود ہے ازدحام سے طائروں کا ازدحام مراد لیا ہے۔ ۹ه داغ جنوں کے شعلے کو تاج سے تشبیہ دی ہے۔ میرے سر پر داغ کا تاج ہے اور نالے (کے نقیب) کی آوازِ دور باش تاثیر کا اہتمام کرنے میں مصروف ہے یعنی نالہ قرینِ اثر ہے دورباش اُس نیزے کو بھی کہتے ہیں جسے لیکر نقیب آگے آگے چلتے ہیں۔ ۱۰ه مطلع خورشید دیکھ کر جلوۂ بام یاد آتا ہے اور دل جلا جاتا ہے ۱۱ه آہوئے رمیدہ = بھاگا ہوا غزال یعنی محبوب۔ رم کردہ = بھاگا ہوا۔ صیدِ رام = شکار جو قابو میں آجائے۔ یعنی شوقِ وصل جو دل سے نکل گیا تھا۔ اب پھر قابو میں آگیا۔

پھر آگیا ہے کون سے بیباک کا خیال
یہ کیا ہوا کہ رخصتِ ناموس و نام ہے

جاں لوٹتی ہے پھر کہ وہی عیش ہو نصیب
ہم[6] ہیں وہ مست ناز ہے اور دورِ جام ہے

جی[7] چاہتا ہے پوچھے کوئی کیا وہ مر گیا
پھر ایک بات کہنے میں قصہ تمام ہے

پھر تلخ کامیوں نے کیا جان و دل سے کوچ
پھر آرزوئے بوسۂ کالب پر مقام ہے

چلون[8] سے کس پری کا نظارہ ہوا نصیب
پھر اپنے تنکے چُننے کی کیوں دھوم دھام ہے

پھر پردہ[9] در ہے کس کی وہ انگلی ہلال سی
جو مثلِ صبح چاک گریبانِ شام ہے

پھر کس نے مسکرا کے مجھے بیوفا کہا
کیوں کہہ رہا ہوں بندہ تو صاحب غلام ہے

پھر کس[10] نے غیر کو نہ دیا ناز سے جواب
پھر خواہشِ پیامِ اجل کا پیام ہے

دیکھا[11] نگاہِ ناز سے کس شوخ چشم نے
پھر مضطرب نظر کو جہانِ نیم گام ہے

کس کم سخن نے دیکھ مجھے آہ کی کہ پھر
اپنے[12] بھی چُپکے رہنے میں کچھ کچھ کلام ہے

پھر کس ستم[13] شعار نے پوچھا ہے میرا حال
پھر ناصحوں کو کیوں خطرِ انتقام ہے

---

[6] دوسرے مصرع میں عیش کی تفسیر کی ہے۔ [7] جی چاہتا ہے کہ میں حالت نزع میں ہوں اور دوست آ کر کسی سے دریافت کرے "کہ کیا وہ مر گیا" یا اُس کی اس پرسش پر میری تمام شکایات کا قصہ تمام ہو جائے [8] چلون کی رعایت سے تنکے چننا لکھا ہے۔ تنکے چننا جنون کی علامت ہے۔ [9] محبوب نے اپنی ہلال نما انگلی سے پردہ (چلون) کو چاک کر دیا جس سے اُس کی تجلی آشکا ہوئی اور گریبان شام صبح کی طرح چاک ہو گیا۔ یعنی شام میں صبح کی ضیا نظر آنے لگی۔ [10] معشوق نے غیر کو جواب نہیں دیا۔ جس پر اُس (غیر) نے مایوس ہو کر یہ پیام کہلا بھیجا کہ میں اب پیام اجل کا خواہاں ہوں۔ [11] اُدھر اُس شوخ چشم نے میری طرف نگاہ کی۔ اِدھر اُسکے اثر سے میری نظر میں اس قدر تڑپ پیدا ہو گئی کہ جس کے روبرو وسعت دُنیا نصف قدم کے برابر ہے۔ [12] کلام = مشتبہ۔ اعتراض۔ اب میرا بھی خاموش رہنا محل اعتراض ہے یعنی اب مجھے بھی نالہ و فریاد کرنی چاہئے۔ [13] اُس ستم شعار نے میری پرسش حال کی ہے جس پر ناصحوں کو انتقام کا خوف پیدا ہو گیا ہے یعنی ناصحوں کو ڈر ہے کہ اب تک یہ (عاشق) ہماری تلخ نوائی برداشت کرتا تھا۔ اب اسکی بن آئی ہے۔ اُلٹا ہمیں ہدف ملامت بنا سکے گا۔

پھر کیوں نہ کام ہووے کہ اس کینہ پر کہا
سو بار مجھ کو تم سے تمھیں مجھ سے کام ہے

پھر کچھ صدائے پا سے دلِ مردہ جی اُٹھا
پھر جلوہ ریز کون قیامت خرام ہے

پھر دوریٔ بتاں میں نہیں خواب کا خیال
مومن[۱۱۴] مرے بھی دین میں سونا حرام ہے

۲۰۹

میں احوالِ دل مر گیا کہتے کہتے
تھکے تم نہ بس بس سُنا کہتے کہتے

مجھے[۱] چپ لگی مدعا کہتے کہتے
رُکے ہیں وہ کیا جانے کیا کہتے کہتے

زباں گُنگ ہے عشق میں گوش کر[۲] ہے
بُرا سُنتے سُنتے بھلا کہتے کہتے

شبِ ہجر میں کیا ہجومِ بلا ہے
زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

گلہ[۳] ہرزہ گردی کا بیجا نہ تھا کچھ
وہ کیوں مُسکرائے بجا کہتے کہتے

صد[۴] افسوس جاتی رہی وصل کی شب
ذرا ٹھیر اے بیوفا کہتے کہتے

[۱۱۴] دین سے دین عشق مُراد ہے۔ "سونا" کے لفظ سے خاص فائدہ لیا ہے۔

۲۰۹ [۱] میں عرض مدعا کر رہا تھا کہ اُنھوں نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر رُک گئے۔ اس فکر میں کہ نہ جانے وہ میرے موافق کہنے والے تھے یا خلاف۔ مجھے چُپ لگ گئی۔ [۲] کر = بہرا۔

[۳] عاشق نے معشوق سے اُسکی ہرزہ گردی (آوارہ گردی) کا گلہ کیا۔ اُس نے مُسکرا کر (طنزاً) جواب دیا۔ "بجا"۔ اس سے عاشق نے ستم ظریفی سے یہ نتیجہ نکالا کہ میرا شکوہ بیجا نہ تھا ورنہ وہ "بجا" کہکر اعتراف کیوں کرتا۔

[۴] ہم شبِ وصل سے برابر کہتے رہے۔ کہ "اے بیوفا۔ ذرا ٹھیر"۔ مگر وہ چل دی۔

چلئے[1] تم کہاں میں نے تو دم لیا ہے	فسانہ دلِ زار کا کہتے کہتے
بُرا ہو ترا محرمِ راز تو نے	کیا اُن کو رسوا بُرا کہتے کہتے
ستمہائے گردوں مفصّل نہ پوچھو	کہ سر پھر گیا ماجرا کہتے کہتے

نہیں[2] یا صنم مومن اب کفر سے کچھ
کہ خو ہو گئی ہے صدا کہتے کہتے

مشورہ کیا کیجئے چرخِ پیر سے	۲۱	دن نہیں پھرتے کسی تدبیر سے
کس[3] طرح مایوس ہوں تاثیر سے		دم رُکے ہے نالۂ شبگیر سے
میری وحشت کے لئے صحرا کہیں		تنگ تر ہے خانۂ[4] زنجیر سے
کیوں[5] نہ ٹپکے آب جب ٹپکے لہو		برق کٹتی ہے تری شمشیر سے
وہ سُناوے نامۂ مضمونِ وصل		گر ہو خطِ کاتبِ تقدیر سے
یوں بنا کر حالِ دل کہنا نہ تھا		بات بگڑی میری ہی تقریر سے
اُنگلیوں میں خامہ جم کر رہ گیا		نامہ ہائے شوق کی تحریر سے

[1] یعنی ابھی افسانۂ دل ختم نہیں ہوا ہے۔ [2] میرا "یا صنم" کہنا کفر کی نیت سے نہیں بلکہ ہمیشہ کہتے کہتے عادت ہو گئی ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ ندارِ غیر اللہ کفر ہے۔

[3] نالۂ شبگیر (پچھلے پہر کا نالہ) سے سانس رُکنے لگتی ہے۔ پھر میں تاثیر سے مایوس کیوں ہوں۔ یعنی نالے کی یہ تاثیر کیا کم ہے کہ میری جان پر بن گئی۔ شعر میں طنز ہے۔

[4] خانۂ زنجیر = حلقۂ زنجیر۔

[5] تیری شمشیر سے خون ٹپکتا دیکھ کر برق کٹتی ہے (خجل ہوتی ہے) اور یہ پانی جو آسمان سے برستا ہے برق کا عرقِ خجالت ہے۔

قہر ہے پھرنا نگاہِ یار کا — الاماں اس بازگشتی[۷] تیر سے
وحشت[۸] چشمِ پری رو دیکھنا — پھر گیا جی سرمۂ تسخیر سے
لے گئی[۹] جاں یادِ رونق ہائے وصل — گھر مرا ویراں ہوا تعمیر سے

اے[۱۰] صنم مومن ہوں آخر کس طرح
مجھکو تسکیں ہو تری تصویر سے

۲۱۱
کیونکہ پوچھے[۱۱] حال تلخی عاشقِ دلگیر سے — ہوگئے ہیں بند لب شیرینیِ تقریر سے
جوشِ[۱۲] وحشت کشمکش اُس ناتواں دلگیر سے — جو نہ در تک پہونچے صحنِ خانۂ زنجیر سے
کام[۱۳] ہوتے ہیں جوانوں کے سپہرِ پیر سے — لے گیا ہے پشتِ خم شاید تری شمشیر سے
دوستو لے آؤ قاتل کو کسی تدبیر سے — سر کٹائینگے کہ اب تو جنگ ہے تقدیر سے

۷ بازگشتی تیر۔ نگاہ کو تیر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اور چونکہ نگاہ "پھر جاتی ہے" اسلئے اُسکو "بازگشتی" تیر کہا گیا۔ ۸ میں نے اپنے آنکھ میں سرمۂ تسخیر لگایا کہ معشوق پری رو اُسکی تاثیر سے مسخر ہو جائے۔ مگر اُلٹا اثر ہوا کہ وہ اور وحشت کرنے لگا۔ آخر سرمۂ تسخیر سے میرا جی بیزار ہو گیا۔ ۹ جان جانے کو خانہ ویرانی اور رونق ہائے وصل کو تعمیر سے تعبیر کیا ہے۔ ۱۰ اہل ایمان تصویر رکھنا شرعاً ناجائز سمجھتے ہیں۔ ماحصل یہ ہے کہ تو خود آ اپنی تصویر نہ بھیج۔

۲۱۱
۱۱ اس شکرلب کے ہونٹ شیرینیِ تقریر کی وجہ سے بند ہوگئے ہیں۔ پھر میرا حال کیونکر پوچھے۔
۱۲ اے جوشِ وحشت ایسے ناتواں (عاشق) سے کشمکش نہ کر جو حلقۂ زنجیر سے نکلکر در زنداں تک نہ پہونچ سکے۔
۱۳ آسمان پیر ہے اور اُسکی پشت خم ہے۔ مگر اسکے باوجود جوانوں کے سے کام کرتا ہے شاید تیری شمشیر سے پشت خم مستعار لے گیا ہے جو یہ حال ہے۔ یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اُسکے ہاتھ سے جوانوں کے کام تمام ہوتے ہیں۔

۱؎ صبح دم جاتا ہے پہلو سے مرے وہ مہ جبیں
دن سیہ ہوتے ہیں کیا کیا مہر کی تنویر سے

۲؎ وہم میخواری سے دل کو نشۂ بنگ آگیا
ہوش جاتے ہیں تری بہکی ہوئی تقریر سے

۳؎ فرط ضعف و جوش بیتابی ہے میرا حال دیکھ
اشک خوں جاری ہیں چشم ہر جوان و پیر سے

۴؎ ہوں غضب سے اُسکے سرگرم فغانِ شعلہ زن
جل گیا جی احتراقِ زُہرہ کی تاثیر سے

۵؎ لذتِ وحشت سے جلتا ہوں کہیں بھاگے نہ دل
ہیں مشابہ آپ کی زلفیں بہت زنجیر سے

۶؎ کام جز اُلفت نہیں اسے کاتبِ اعمال یاں
فائدہ حرفِ مکرّر کی بھلا تحریر سے

۷؎ طوطیاں سیکھیں کہاں سے نالۂ رشک آفریں
ہو نہ زیب پشت آئینہ تری تصویر سے

ہوں سزاوارِ ستم میں نے کیا ہے جرمِ عشق
بوالہوس ہیں بیگنہ ۸؎ پھر کیوں ڈریں تعزیر سے

۱؎ آفتاب کی روشنی میرے حق میں سیاہ روزی کا حکم رکھتی ہے کیونکہ صبح ہوتے ہی وہ مہ جبین پہلو سے رخصت ہو جاتا ہے

۲؎ تو نے بہکی بہکی باتیں کیں اور مجھے وہم ہوا کہ کہیں بزم غیر میں میخواری نہ کی ہو۔ اس وہم نے میرے ہوش اس طرح اُڑا دئے جیسے بنگ کے نشہ سے اُڑ جاتے ہیں۔ ۳؎ دیکھ = دیکھ کر۔ ۴؎ احتراق جل جانا منجموں کی اصطلاح میں قمر کے سوا کسی سیارہ کا برج واحد میں جمع ہونے کی وجہ سے شعاع خورشید کے نیچے چھپ جانا احتراق کہلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب خورشید رو برسرِ عتاب ہے گویا میرا طالع سعد (زہرہ) زیر شعاع آگیا ہے (اُسکی سعادت معدوم ہو گئی) یہی سبب ہے کہ میں جل کر فغان آتشیں کرتا ہوں۔ ۵؎ میں لذت وحشت (بادیہ گردی) کا دلدادہ ہوں اور زنجیر سے بھاگتا ہوں۔ مگر چونکہ آپ کی زلفیں زنجیر سے مشابہ ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ دل زلفوں سے بھی بھاگنے لگے۔ باز آیا ایسی لذت وحشت سے

۶؎ میرے نامۂ اعمال میں اُلفت کے سوا کوئی عمل نہیں۔ پھر ایک ہی بات کو بار بار لکھنے سے فائدہ؟

۷؎ آئینہ کی پشت پر طوطی کی تصویر بنا دیتے ہیں اور جاندار طوطی کو آئینہ کے سامنے بٹھا دیتے ہیں جس پر وہ اپنی شبیہ کو دیکھکر بولنا سیکھ جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پشت آئینہ پر تیری تصویر بنی ہوئی ہے۔ جس کو دیکھکر طوطیاں نالۂ رشک آفریں سیکھ گئیں۔ نالۂ رشک آفریں = نالہ جس پر مجھے بھی رشک آتا ہے۔ ۸؎ بیگنہ جس نے جرم (عشق) نہ کیا ہو۔ تاکید الذم بما یشبہ المدح کی اچھی مثال ہے۔

اے [۱۱] فسونگر چشم جادو پر نہیں چلتا عمل — دیکھنا بھی چھوٹ نہ جائے سُرمۂ تسخیر سے
حسن [۱۲] کی نیرنگیوں سے کم نہیں ارژنگ عشق — تو بنو جلوہ ملا لو رنگ کی تغئیر سے

رشکِ دامانِ جواہر اور لکھی ہے غزل
جس کو مفلس بھی نہ بدلے نسخۂ اکسیر سے

۲۱۴- جل [۱] گئے اختر یہ کس کے حُسن کی تنویر سے — ہے منوّر تر شبِ غم مہرِ عالمگیر سے
رو دیا بے اختیار اُس شوخ نے تاثیر سے — دودِ دل [۲] بھی کم نہیں ہے سُرمۂ تسخیر سے
چین ہو خواب عدم میں تو کسی تدبیر سے — میرے بالش [۳] کے لئے پر لا دو اُسکے تیر سے
ہو گئی [۴] ساری زمیں صرفِ حروفِ نو رقم — اِک جہاں ویراں ہے میرے نامہ کی تحریر سے
کیوں [۵] کہا تھا یہ کہ بکتے بکتے سر پھرنے لگا — اب تو باندھوں گا میں ناصح اسکو بھی زنجیر سے

[۱۱] کسی فسونگر نے عاشق کو سرمۂ تسخیر دیا کہ دوست مسخر ہو جائے۔ وہ جواب دیتا ہے کہ مبادا اس عمل کی اُلٹی تاثیر ہو اور محبوب میری جانب دیکھنا بھی چھوڑ دے۔ [۱۲] نیرنگ عجائبات۔ ارژنگ = نگار خانہ۔ یعنی اگر تمہارا جمال ہر وقت نئی ادا سے جلوہ گر ہوتا ہے تو میرا رنگ رُخ بھی ہر دم دگر گوں ہوتا رہتا ہے۔
۲۱۲ [۱] معشوق آیا اور اُسکے حُسن کی روشنی سے میری شبِ غم مہرِ عالمگیر سے زیادہ روشن ہو گئی (یعنی مبدّل بہ روز ہو گئی) اور شدّتِ نور کے باعث ستارے جل گئے۔ [۲] دودِ دل (آہ) کی مشابہت سرمۂ تسخیر سے ظاہر ہے۔ [۳] بالش = تکیہ۔ تکیہ میں اکثر پر بھرے جاتے ہیں۔ تیر کا پر مشہور ہے۔ [۴] میں نے دوست کو اس قدر اشتیاق نامے لکھے کہ حروفِ تازہ کے نقش کرنے میں تمام زمین کی مٹی ختم ہو گئی اور دنیا ویران ہو گئی۔ [۵] ناصح نے کہیں کہدیا کہ تجھے نصیحت کرتے کرتے میرا سر پھرنے لگا مگر تجھپر اثر نہیں ہوتا۔ عاشق دیوانہ جواب دیتا ہے کہ جب میں آوارہ پھرتا تھا تو میرے پاؤں میں زنجیر ڈالی گئی تھی۔ اب تیرا سر پھرتا ہے تو اس کو میں زنجیر سے باندھوں گا۔

کیوں نہ مجھ سے رم وہ مہوش اب زیادہ کرے
بدگماں ہے سبعۂ سیارہ کی تسخیر سے

یاس مجھ قطع آز اور شوق بیتاب جواب
باندھتے ہیں نامہ بالِ ہدہد تصویر سے

جی رکے ہے ضبط کرتے ہیں تو مر گیا
ناک میں آیا دم اس آہِ ستم تاثیر سے

صبح کیونکر ایک دم میں ہو گئی شامِ فراق
کیا اثر ہوتا تھا تم کو نالۂ شبگیر سے

کہتے ہیں سب یہ رہا آوارہ بعدِ قتل بھی
ہو گئی کتنی مری نام آوری تشہیر سے

اُن کو جلدی جانے کی مجھکو عذابِ جانکنی
دونوں کا دم ناک میں ہے موت کی تاخیر سے

میں نے سوچا آپ اپنے خونِ ناحق کا جواب
نام اُس کا سینے پر لکھا ہے نوکِ تیر سے

۶ سبعہ سیارہ کی تسخیر = ساتوں سیاروں کو قابو میں لانے کا عمل۔ جب سے میں نے تسخیر سیارہ کا عمل پڑھا ہے وہ ماہوش بدگمان ہوکر مجھ سے اور زیادہ وحشت کرنے لگا ہے۔ کیونکہ وہ "ماہوش" ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو بھی سبعۂ سیارہ میں سے سمجھتا ہے۔ ۷ آز = حرص۔ "خواہش" مایوسی اُمید کے قطع کرنے میں مصروف ہے اور شوق جواب نامہ کے حصول کے لئے بیتاب ہے۔ اسلئے ہم تصویر کے ہدہد کے بازو سے اپنا خط باندھتے ہیں۔ ہدہد تصویر کا وجود و عدم برابر ہے اُس کے بازو سے خط باندھنے کی وجہ یہ ہے کہ مایوسی نے جواب سے بے نیاز کر دیا ہے۔ مگر چونکہ شوق بے تاب ہے۔ اسواسطے دل کو بہلانے کے لئے باندھ دیتے ہیں۔ ہدہد کی نامہ بری کا قصہ مشہور ہے۔ ۸ ستم تاثیر = جو ستم کا اثر رکھے۔ آہ کو ستم تاثیر اسلئے کہا کہ جو ستم یار کا نتیجہ ہے (یعنی موت) وہی آہ کا نتیجہ ہے۔ ۹ میں نے پچھلے پہر نالہ کیا اور شام فراق خیر متوقع طور پر اچانک صبح سے مبدل ہو گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم پر میرے نالہ کا اثر ہوا اور تم نے گھبرا کر نالہ کے ختم یا صبح کے آغاز ہونے کی دعا کی۔ ورنہ میری فریاد میں تاثیر کہاں۔ ۱۰ مرنے کے بعد میری نعش کو تشہیر کرایا گیا جس پر لوگوں نے کہا کہ یہ (عاشق) زندگی میں تو آوارہ تھا ہی "مرنے کے بعد بھی آوارگی رہی"۔ عاشق اس چرچے کو ذریعۂ ناموری سمجھتا ہے۔ ۱۱ میں نے آپ اپنے خون ناحق کے سوال کا جواب سوچ لیا۔ یعنی قاتل کا نام اپنے سینہ پر نوک تیر سے لکھ رکھا کہ تفتیش کرنیوالوں کو زحمت جستجو نہ ہو۔

غیر کے خط لکھنے کو تم نے تراشی ہے قلم
ورنہ میرے استخواں کیوں ہو گئے قطگیر سے[۲۱۱]

[۲۱۲]مار ڈالا ہم کو جورِ گردشِ ایام نے
بڑھ گئی رات اپنی روزِ حشر کی تقصیر سے

[۲۱۳]مومن اب پڑھتا ہوں وہ مضمون بسمل کی غزل
شوخیوں کو جس کی دعویٰ ہو رمِ نخچیر سے

۲۱۴

[۱]سنئے فسانہ سنا کے سو رہے کب کسی تدبیر سے
نیند آتی ہے ہمارے خواب کی تعبیر سے

ہائے پھر مرنے لگا میں لطف کی تقریر سے
اُس کا دم[۲] بھی کم نہ تھا ہرگز دمِ شمشیر سے

بزم دشمن سے نہ اُٹھے وہ کسی تدبیر سے
مل گئے ہم خاک میں محشر تری تاخیر سے

[۳]میرے لکھے کو مٹایا آپ نے اچھا ہوا
تھا شگوں ہی مدعا یاں نامہ کی تحریر سے

[۲۱۱] قطگیر = قط زن یعنی ہڈی کا پتلا سا ٹکڑا جس پر قلم کو رکھکر قط دیتے ہیں۔ استخوان کو لاغری کے لحاظ سے قطگیر سے تشبیہ دی ہے۔ [۲۱۲] میری شبِ فرقت اس قدر طویل و مہیب ہے کہ اُس کی صبح اگر ہو سکتی ہے تو صبح روزِ حشر ہی ہو سکتی ہے۔ جس قدر روزِ حشر کے آنے میں کوتاہی ہوئی میری شبِ ہجر دراز ہوئی۔ اگر گردشِ ایام مخالف نہ ہوتی تو یہ نوبت کیوں آتی۔

[۲۱۳] مضمون بسمل = پھڑکتا ہوا مضمون۔ رم نخچیر = شکار کا بھاگنا۔ ایسا مضمون بسمل پڑھتا ہوں جسکی شوخی کو صید رم کردہ کی شوخی سے برابری کا دعویٰ ہو۔

۲۱۴ [۱] ہم نے دوست سے ہمخواب ہونے کا خواب دیکھا اور اُس سے جاکر تعبیر خواب بیان کرنے لگے۔ مگر وہ ستم ظریف اُس کو افسانہ سمجھکر سو گیا اور ہمارا خواب بے تعبیر رہ گیا۔ قاعدہ ہے کہ افسانہ سنکر نیند آجاتی ہے۔ افسانہ میں پہلو یہ ہے کہ یہ امید افسانہ کی طرح بے اصل ہے۔ [۲] پہلے دم کے معنی گفتگو اور دوسرے کے معنی دھار۔ [۳] میرے لکھے (نامہ) کو محبوب نے مٹا دیا۔ میں نے اُسکے طرزِ عمل سے یہ فال نیک لی کہ وہ میرے لکھے (نوشتۂ تقدیر) کو مٹا دیگا اور میرے بھلے دن آئینگے۔ یعنی خط سے مقصود عرض حال نہ تھا بلکہ شگون لینا منظور تھا۔

جاتے[۴] شربت مرتے دم بھی خوں پلایا ہائے
منہ مرا کھولا ستم پیشہ نے نوکِ تیر سے

ایسے[۵] نازک کے شمائل کیوں نہ دل میں نقش ہوں
کھنچ گیا سینہ پہ نقشہ غیر کی تصویر سے

کب[۶] لگا اے کاسہ گر اُس لب سے جام اس خاک کا
کام ہونے کا نہیں پھر فائدہ تدبیر سے

کاٹتا[۷] ہوں عرضِ سوزش میں زباں کو دمبدم
میرے دندانِ ندامت کم نہیں گلگیر سے

اے[۸] جنوں اپنی اسیری بعد مردن بھی رہی
حلقۂ ماتم میں آئے حلقۂ زنجیر سے

کب[۹] ہمارے ساتھ سوتے ہیں کہ دیکھیگا کوئی
اُن کو بیتابی ہے کیوں اس خوابِ بے تعبیر سے

تم[۱۰] سے وہ کرتا ہے باتیں رشک سے روتا ہوں میں
سچ کہا جھڑتے ہیں موتی غیر کی تقریر سے

[۴] حالت نزع میں پیاس زیادہ ہوتی ہے اس لئے شربت پلایا جاتا ہے۔ ظالم نے آخر وقت بھی ظلم میں کمی نہ کی۔ یعنی میرا منہ کھولا تو نوکِ تیر سے۔ اور پلایا تو خون۔ [۵] شمائل ہے شکل۔ اسکی نزاکت کا یہ عالم ہے۔ کہ جب اُس نے غیر کی تصویر اپنے سینے سے لگائی تو سینہ پر غیر کا نقشہ کھنچ گیا۔ بھلا ایسے نازک کی شکل کیوں نہ دل میں کھب جائے۔ واضح رہے کہ نازک چیز جلد اثر قبول کر لیتی ہے اسلئے غیر کا نقشہ کھنچ گیا۔ [۶] کاسہ گر = کسگر۔ پیالہ بنانے والا۔ مراد یہ ہے کہ میری خاک کا جام بنے تو بھی معشوق منہ سے لگانے والا نہیں۔ [۷] مجھے ندامت ہے کہ میں نے کسی سے سوزشِ محبت کا بیان کیوں کیا اسی لئے ہنگام عرضِ سوزش اپنی زبان کو دندانِ ندامت سے کاٹتا ہوں۔ جس طرح گلگیر سے شمع کو کاٹا جاتا ہے۔ زبان کو شمع اور دندان کو گلگیر سے تعبیر کیا ہے۔ [۸] یعنی زندگی میں حلقۂ زنجیر میں اسیر تھے۔ مرنے پر نعش احباب کے حلقۂ ماتم میں گھری ہوئی ہے۔ [۹] وصالِ یار کی تمنا خوابِ بے تعبیر ہے جس کے پورا ہونے کی اُمید نہیں۔ اسلئے اس (معشوق) کی بے تابی لاحاصل ہے۔ کیونکہ جب ہمخوابی امرِ محال ہے تو اندیشۂ رسوائی بے بنیاد۔ [۱۰] معشوق نے تعریف کے طور پر کہا کہ غیر (رقیب) کی تقریر سے موتی جھڑتے ہیں۔ عاشق جواب دیتا ہے کہ یہ سچ ہے۔ کیونکہ جب وہ تم سے باتیں کرتا ہے تو میں رشک سے روتا ہوں۔ چونکہ میرے آنسو موتی ہیں۔ اسلئے اس لحاظ سے ضرور اُسکی تقریر سے موتی جھڑتے ہیں۔

نالہ[۱۱] ہائے بوالہوس نے کھو دیا آزارِ شوق
لو ہم اچھے ہوگئے درمان بے تاثیر سے

ساتھ[۱۲] سونا غیر کے چھوڑا ابتو اسے سیمیں بدن
خاک میری ہوگئی نایاب تر اکسیر سے

عشق[۱۳] اُس قاتل کا بعدِ قتل بھی ہمکو رہا
ہے یہ کیسا جرم جو جاتا نہیں تعزیر سے

سر پٹکتا ہے فلق میں مومنِ خانہ خراب
مسجدیں رہتی نہیں کیا فائدہ تعمیر سے

۲۱۴

مومن[۱] سوے شرق اُس بُتِ کافر کا تو گھر ہے
ہم سجدہ کدھر کرتے ہیں اور کعبہ کدھر ہے

بیہوش[۲] ہے عاشق پہ سیہ مست سے کمتر
تم مجھکو تو کہتے ہو کچھ اپنی بھی خبر ہے

کھاتا[۳] ہوں محبت میں اس آداب سے میں گل
گویا شجرِ وادیِ ایمن کا ثمر ہے

حسرت[۴] سے میں دیکھوں تو فلک کیونکہ نہو رام
اُس نرگسِ جادو کی نگہ پیش نظر ہے

[۱۱] رقیب نے دوست کی محبت ظاہر کرنے کے لئے نالے کئے۔ ہم نے اس رشک میں آزار محبت ہی سے پرہیز اختیار کیا اور بیماریِ (عشق) سے شفا پائی۔ رقیب کے نالوں کو درمان بے تاثیر قرار دیا ہے درمان اسلئے کہا کہ انکی بدولت آزار شوق جاتا رہا۔ بے تاثیر اسلئے کہ اُسکے نالے خلوص سے خالی تھے۔ درمانِ بے تاثیر سے اچھا ہو جانا نئی بات ہے
[۱۲] عشق میں مٹ کر میری خاک اکسیر سے بھی زیادہ نایاب ہوگئی۔ ابتو رقیب سے اختلاط چھوڑ۔ سونا۔ سیمیں بدن۔ اکسیر خاک میں شاعرانہ رعایت ہے۔ [۱۳] قاتل نے ہمیں جرم عشق میں قتل کیا۔ مگر قتل ہوکر بھی عشق (جرم) نہ گیا

۲۱۴ [۱] یعنی اُسکے گھر کی سمت سجدہ کرنا چاہئے تھا کہ وہی اپنا کعبہ ہے۔ [۲] اگر میں بیہوش ہوں تو تم سیہ مست ہو۔ نہ تم مجھے الزام دے سکتے ہو نہ میں تم کو۔ [۳] گل کھانا = داغ کھانا۔ شجرِ وادیِ ایمن = وہ درخت جہاں سے حضرت موسیٰ کو تجلی الہی نظر آئی تھی۔ وادی کوہ طور کی سیدھی طرف تھی۔ اسلئے وادی ایمن (جانب راست) کہلاتی ہے [۴] محبوب کی نرگس جادو (چشم سحر فن) کی نگاہ ہر وقت میری آنکھوں میں پھرتی ہے۔ اسوجہ سے میری آنکھوں میں تسخیر کا اثر پیدا ہوگیا ہے۔ یہانتک کہ اگر عالم حسرت میں آسمان کی طرف دیکھوں تو وہ بھی مطیع و مسخر ہو جائے

خط کی سمجھے قاصد کو ہے انعام کی ہوس
میں دست نگر خود ہوں وہ کیا دست نگر ہے

ارمان[۵۵] نکلنے دے بس اے بیم نزاکت
ہاں ہاتھ تصور میں مرا زیر کمر ہے

رندوں[۵۶] پہ یہ بیداد خدا سے نہیں ڈرتا
اے محتسب ایسا تجھے کیا شاہ کا ڈر ہے

ایسے[۵۷] دمِ آرام اثر خفتہ کب اٹھا
ہم کو عبث امید دعاہاے سحر ہے

ہم حال کہے جائینگے سنئے کہ نہ سنئے
اتنا ہی تو یاں صحبتِ ناصح کا اثر ہے

وہ ذبح کرے اور یہاں جان فدا ہو
ایسے سے نبھے یوں یہ ہمارا ہی جگر ہے

اب بھی نہیں جاتی ترے آجانے کی امید
گو پھر گئیں آنکھیں پہ نگہ جانبِ در ہے

دل کھول کے مل لیجئے مومن صنموں سے
اس سال میں گر سوے حرم عزمِ سفر ہے

۲۱۵
دل[۵۹] میں اس شوخ کے جو راہ نہ کی
ہم نے بھی جان دی پر آہ نہ کی

پردہ[۶۰] پوشی ضرور تھی اے چرخ
کیوں شبِ بوالہوس سیاہ نہ کی

تشنہ[۶۱] لب ایسے ہم گرے مے پر
کہ کبھی سیرِ عید گاہ نہ کی

۵۵ شاعر بیم نزاکت یار سے (جو تصور میں بھی ارمان نکلنے دینے سے مانع ہے) مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میرا ہاتھ تصور میں اسکے زیر کمر ہے۔ اب تو کوئی اندیشہ کی بات نہیں۔ ۵۶ یعنی بادشاہ کے ڈر سے تو خدمت احتساب بجالاتا ہے مگر رندوں کی دل شکنی کرنے میں خوف خدا نہیں کرتا۔ ۵۷ صبح کا وقت آرام کا ہوتا ہے۔ اسلئے ایسے وقت اٹھنا ناگوار ہوتا ہے۔ انہیں دعاے سحر کی اجابت کی توقع ناحق ہے۔ کیونکہ اپنے آرام کے وقت سویا ہوا اثر بھلا کیونکر جاگ اٹھیگا۔

۲۱۵ ۵۹ آہ سے ہم ایسے متنفر ہو گئے کہ جان دیدی مگر آہ نہ کی۔ راہ نہ کی کا قافیہ "آہ" ہے۔ ۶۰ اے چرخ اگر تجھے بوالہوس کی طرفداری منظور تھی تو اسکی شب وصل کو سیاہ کرنا چاہئے تھا۔ تاکہ اسکا پردہ نہ کھلتا۔ شب کے سیاہ ہونے سے شب کا منحوس ہونا مراد ہے۔ شعر میں یکرشاعرانہ ہے۔ ۶۱ چونکہ رمضان بھر سے تشنہ لب تھے۔ اسلئے عید کے دن ہی شراب پر گرے

اسے[۵۴] کو دشمن سے کیا بچاتے وہ چرخ
جس نے تدبیر خسفِ ماہ نہ کی

کون ایسا کہ اُس سے پوچھے کیوں
پرسشِ حالِ دادخواہ نہ کی

تھا[۵۵] بہت شوق وصل تو نے تو
کمی اے حسنِ تابکاہ نہ کی

عشق[۵۶] میں کام کچھ نہیں آتا
گر نہ کی حرص مال و جاہ نہ کی

تابِ کم ظرف کو کہاں تم نے
دشمنی کی عدو سے چاہ نہ کی

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

محتسب یہ ستم غریبوں پر
کبھی تنبیہ بادشاہ نہ کی

گریہ[۵۷] و آہ بے اثر دونوں
کس نے کشتی مری تباہ نہ کی

تھا[۵۸] مقدر میں اُس سے کم ملنا
کیوں ملاقات گاہ گاہ نہ کی

دیکھ[۵۹] دشمن کو اُٹھ گیا بے دید
میرے احوال پر نگاہ نہ کی

مومن اس ذہن[۶۰] بے خطا پر حیف
فکرِ آمرزشِ گناہ نہ کی

۵۴ خسف یا خسوف = چاند گرہن - ضد کسوف - جب آسمان اپنے ماہ کے خسوف کی روک تھام نہ کر سکا تو اُس سے یہ اُمید رکھنا کہ میرے ماہوش کو رقیب سے دور رکھے بیسود ہے - چرخ از تو ہزار بار بیچارہ تر است ۔ ۵۵ تاب کاہ = تاب شکن - طاقت گھٹانے والا - اے حسنِ یار تو نے تو ہماری ہمت توڑنے میں اپنی سی کمی نہ کی - مگر چونکہ یہاں شوق وصل حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا اسلئے ہم عشق میں نباہ کرتے رہے - ۵۶ مال و جاہ کا اگر کوئی مصرف ہو سکتا تو یہ ہوتا کہ عشق میں کام آتا - مگر ایسا نہیں لہذا اُس کی حرص بے سود - ۵۷ آب و ہوا دونوں کشتی کی رفتار میں مُعین ہیں - مگر جب پانی اور ہوا طوفان خیز ہوتے ہیں تو کشتی تباہ ہو جاتی ہے - میری کشتی حیات بھی پانی (گریہ) اور ہوا (آہ) کے مخالف ہونے کی بدولت تباہی میں آئی - ۵۸ تقدیر میں محبوب سے کم ملنا لکھا تھا - ہم آغاز عشق ہی میں اس قدر مل لئے کہ جو مقدار مقدر ہو چکی تھی پوری ہو گئی - اسلئے اب ہجر کے صدمے اُٹھانے پڑے - اگر گاہ گاہ ملاقات کرتے تو یہ نوبت نہ آتی - ۵۹ میں دوست کو اپنا حال دکھا رہا تھا کہ رقیب آگیا اور وہ بے مروت اُس (رقیب) کو دیکھکر اُٹھ گیا اور میری جانب توجہ نہ کی - ۶۰ ذہن بے خطا = غلطی نہ کرنے والا ذہن - آمرزش = بخشش -

بندھا[1] خیالِ جناں بعد ترکِ یار مجھے	۳۱۶	کیا ہے یاس نے کیا کیا امیدوار مجھے
نہ آسمان کا رُخ پھیر دوں جدھر چاہوں		دیا ہے کیا طپشِ دل نے اختیار مجھے
وہ شامِ وعدہ جو آئے تو بیخود و سرمست		رہا وصال میں بھی وہ ہی انتظار مجھے
وہ رند خمکدہ[2] کش ہوں کہ زہر دیتے ہیں		بتنگ آکے حریفانِ بادہ خوار مجھے
نہ ہو[3] وہ بات کہ جس سے وفا میں آئے خلل		کہیں نہ کیجیو ناصح سے شرمسار مجھے
بقدرِ[4] جوش تڑپنے کو تھا وے پسِ قتل		وہ بے قرار ہوئے آگیا قرار مجھے
اُمیدِ[5] مرگ پہ ہر فتنہ راحتِ جاں ہے		شبِ فراق میں کیا بیمِ روزگار مجھے
قرانِ[6] انجمِ سیّارہ بُرجِ آبی میں		ڈبوئے گی مری چشمِ ستارہ بار مجھے

[1] یعنی "عشقِ صنم" (جو بمنزلۂ کفر ہے) چھوڑ کر مجھے جنت کی امید بندھی۔ گویا اس طرف سے مایوسی ہوئی ۳۱۶
تو اُس طرف کی توقع پیدا ہوئی۔ [2] خمکدہ کش = میخانہ کا میخانہ پی جانے والا۔ حریفان بادہ خوار اسلئے تنگ آکر مجھے زہر دیتے ہیں کہ مَیں اُنکے حِصّہ کی بھی پی جاتا ہوں۔ خمکدہ کش مومن کی خاص ترکیب ہے۔ [3] ناصح تمھیں بیوفا بتاتا ہے اور مَیں اُسکی تکذیب کرتا ہوں۔ خدا کے لئے کہیں اب بیوفائی نہ کرنا کہ اُس کا قول سچ ہو جاسے اور مجھے اُس سے قائل ہونا پڑے۔ [4] یعنی وہ میرے تڑپنے پر بیقرار ہوئے اور مجھ سے اُن کی بیقراری نہ دیکھی گئی۔ [5] شبِ فراق میں مجھے فتنہ ہائے روزگار کا ڈر نہیں۔ کیونکہ جو فتنہ برپا ہوگا میری موت میں مُعین ہوگا۔ اور موت تو مَیں خدا سے چاہتا ہوں اور اسی امید پر ہر فتنہ کو راحت جان سمجھتا ہوں۔ [6] قران = شمس کے سوا دو سیاروں کا ایک برج میں جمع ہوتا۔ برج آبی = سرطان و عقرب و حوت۔ شاعر نے اپنے اشکوں کو انجم سیارہ سے اور اپنی چشم ستارہ بار (ستارہ برسانے والی) کو برج آبی سے تشبیہ دی ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو جمع ہیں۔ گویا انجم سیارہ کا برج آبی میں قران ہے جو کثرت باراں کی علامت ہے۔ یقین ہے کہ میری چشم اشکبار اس طوفان میں مجھ کو ڈبو کر رہے گی۔ کہا جاتا ہے کہ جب طوفان نوحؑ آیا تھا تو ساتوں سیارے برج سرطان میں جمع تھے۔

اگر حساب[۷] وفا امتحاں کے بعد نہ ہو
قبول عذر ستمہائے بیشمار مجھے

شب[۸] وصال میں سب قطرہ قطرہ مے پی لی
رہا نہ وسوسۂ چارۂ خمار مجھے

رقیب[۹] کھائے قسم تو وفا کا آئے یقیں
تو میری جان ہے کیا تیرا اعتبار مجھے

نہ سیر گل نہ قدح نوشی اُسکے ساتھ ہوئی
غم خزاں ہے نہ کچھ حسرت بہار مجھے

پس[۱۰] شکستن خم زجر محتسب معقول
گناہگار نے سمجھا گناہگار مجھے

لبوں پہ جان ہے ایسی بھی کیا ہے بے دردی
نہ قرض دیتے ہو بوسہ نہ مستعار مجھے

نہ کام زور سے نکلا نہ عجز کام آیا
بس اب تو چین نہ دے اے شوق ہرزہ کار مجھے

خدا[۱۱] کرے ملک الموت اُنسے پہلے آئے
بہت سی لینی ہیں جانیں پئے نثار مجھے

کئے[۱۲] ہیں طول امل نے تمام کام خراب
ہمیشہ نظم جہاں کے ہیں کاروبار مجھے

ہر[۱۳] آن آن دگر کا ہوا مَیں عاشق زار
وہ سادہ ایسے کہ سمجھے وفا شعار مجھے

ثواب ترک صنم سچ سہی ولے مومن
یہ کیا سبب کہ سُناتے ہو بار بار مجھے

۷؎ تم امتحان کے نام سے مجھ پر ستمہائے بیشمار کرتے ہو۔ مجھے یہ عذر قبول ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ امتحان کے بعد (جب مَیں وفا کی آزمائش میں پورا اتروں) مجھ سے وفا کی پابندی کا مطالبہ نہ کیا جائے۔
۸؎ مَیں نے تمام شراب پی لی اور یہ خیال نہ رہا کہ جب نشہ کے بعد اعضا شکنی (خمار) ہوگی تو کیا پیونگا مے سے اغلباً مے عیش مراد ہے۔ ۹؎ جان (زندگی) اعتبار کے قابل نہیں اور چونکہ تو میری جان ہے۔ اِس لئے مَیں تیرا بھی اعتبار نہیں کر سکتا۔ شوخی ملاحظہ ہو۔
۱۰؎ محتسب نے خود تو گناہ کیا کہ خم مے توڑ کر ہم رندوں کی دل شکنی کی۔ اُس پر مستزاد یہ کہ بجائے نادم ہونے کے اُلٹا ہمیں کو گناہگار سمجھکر ملامت کرنے لگا۔ زجر = سرزنش۔ جھڑکی۔ ۱۱؎ اُدھر محبوب نے آنے کا وعدہ کیا ہے۔ اِدھر مَیں موت کی گھڑیاں گن رہا ہوں۔ خدا کرے ملک الموت اُس سے پہلے آئے۔ کیونکہ اُس سے مجھے بہت سی جانیں اُس (محبوب) پر نچھاور کرنے کے لئے لینی ہیں۔ ۱۲؎ طول امل = خواہشوں کی کثرت نظم جہاں = دنیا کا بندوبست۔ طول امل کی بدولت مَیں نے اپنے ذمہ دنیا بھر کی فکریں لگالی ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ کام جو میری ذات سے متعلق ہیں تمامتر نظرانداز ہو گئے۔ ۱۳؎ آن = وقت۔ نیز ادا۔ میں تلوّن سے ہر بار معشوق کی نئی ادا پر عاشق ہوا۔
مگر وہ سادگی سے مجھے وفا شعار سمجھتا رہا یعنی وفا شعاری کا اقتضا تو یہ تھا کہ ہمیشہ ایک ہی ادا کی پرستش کرتا رہتا۔

دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لئے[1]	۲۱۷	سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لئے
نہ پائے یار کے بوسے نہ آستاں کے لئے[2]		عبث میں خاک ہوا میلِ آسماں کے لئے
خلافِ وعدۂ فردا کی ہم کو تاب کہاں[3]		اُمید یک شبہ ہے یاسِ جاوداں کے لئے
سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں[4]		کہ سخت چاہیئے دل اپنے رازداں کے لئے
ہجابِ چرخ بلا ہے ہوا کرے بیتاب		فغاں اثر کے لئے اور اثر فغاں کے لئے
ہے اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا[5]		وگرنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کے لئے
مزا یہ شکوہ میں آیا کہ بیمزہ تھے وہ[6]		میں تلخ کام رہا لذتِ زباں کے لئے

۲۱۷ ۱ شبِ ہجر میں مصیبت کی اس قدر شدت تھی کہ دعا کرنی غضب تھی۔ ادھر بات کی، اُدھر دم نکل گیا۔

۲ میل = خواہش۔ آسماں کی خواہش تو پوری ہو گئی۔ کہ میں مشکل خاک ہو گیا۔ لیکن اگر خاک ہو کر پائے یار یا آستانِ یار کا نصیب ہوتا تو میں بھی سمجھتا کہ عشق کا مقصود حاصل ہوا۔

۳ معشوق نے کل کے ملنے کا وعدہ کیا ہے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ اُس کا وعدہ پورا ہونے کے لئے نہیں ہوا کرتا۔ تاہم ہمارے نام آج رات بھر اُمید رہے گی۔ کل اگر وہ نہ آیا (جیسا کہ یقین ہے) تو یاسِ جاوداں شروع ہو جائیگی۔ اور میں جان دیدونگا کیونکہ مجھے خلافِ وعدۂ فردا کی تاب نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ باوجود نا اُمیدی کل تک اور اُمید سے نباہ ہوگا کیونکہ ابھی وعدہ کی میعاد نہیں [illegible] لازمی ہے۔

۴ نرم دل شخص یہ احوال سُننے کی تاب نہیں لا سکتا۔ سخت دل صرف تم ہو یا رقیب ہے۔ اگر تم نہیں سُنتے تو رقیب سے کہونگا

۵ پاسبان کا فرض ہے کہ شب بھر بیدار رہے۔ مگر پاسبانِ یار اطمینان کی نیند سوتا ہے [illegible] سوتے ہونے [illegible] پر بھروسہ ہے اور جانتا ہے کہ عاشق [illegible] کی وجہ سے کا شانۂ دلدار تک نہ پہونچ سکے گا۔ پھر پاسبانی کی کیا ضرورت ہے

۶ [illegible] شکایت کرنے میں اس قدر مزہ آیا۔ کہ برابر شکایت کئے گیا یہانتک کہ دوست بے مزہ [illegible] کی بدولت مجھے یہ زہر کے گھونٹ پینے پڑے اور ہمی یار کا صدمہ اٹھایا)

لیا ہے ۷ دل کے عوض جان دے رقیب تو دوں
میں اور آپ کی سوداگری زیاں کے لئے

وہ ۸ لعل روح فزا دے کہاں تلک بوسے
کہ جو ہے کم ہے یہاں شوق جانفشاں کے لئے

۹ ملے رقیب سے وہ جب سنا وصال ہوا
دریغ جان گئی ایسے بدگماں کے لئے

کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ امن قفس
ہے بیم برقِ بلا روز آشیاں کے لئے

جنونِ ۱۰ عشق ازلی کیوں نہ خاک اڑائیں کہ ہم
جہاں میں آئے ہیں ویرانیِ جہاں کے لئے

۱۱ بھلا ہوا کہ وفا آزما ستم سے موئے
ہمیں بھی دینی تھی جاں اُسکے امتحاں کے لئے

رواں ۱۲ فزائی سحرِ حلال مومن سے
رہا نہ معجزہ باقی لبِ بتاں کے لئے

۲۱۸

اگر ۱۳ غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

موئے آغازِ الفت میں ہم افسوس
اُسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی

۷ میں نے تمھیں دل کے عوض لیا ہے۔ اگر رقیب واقعی تمھارا خریدار ہے تو اپنی جان دے۔ ورنہ میں اُس سے تمھارا معاملہ کرنے اور خسارہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اچھا ہے اسی طرح رقیب ٹھکانے لگے۔ ۸ لعل روح فزا = لب جاں فزا۔ ۹ محبوب ایسا بدگمان ہے کہ میرے وصال (موت) کی خبر سُنکر رقیب سے ملنے لگا۔ یعنی اُس کو گمان ہوا کہ اُس (عاشق) کا کسی دوسرے سے وصال ہوا ہے۔ وصال کے لفظ سے فائدہ لیا ہے۔ ۱۰ ہمارا جنون عشق ازلی (ہمیشہ سے) ہے پھر ہم کیوں نہ خاک اڑائیں الخ۔ ۱۱ وفا آزما ستم = ظلم جو وفا کی آزمایش کے لئے کیا جائے۔ ہمیں آخر تو جان دینی تھی ہی کہ دوست کی ستم شعاری کا امتحان کریں۔ اگر ہم اُسکے ستم سے مرے تو اچھا ہوا کہ اُسکو بھی ہماری وفا کا امتحان ہوگیا مطلب یہ کہ دونوں کا مقصد حاصل ہوگیا۔ ۱۲ رواں فزائی = جاں فزائی۔ سحرِ حلال = وہ جادو جو جائز ہو یعنی کلام فصیح۔ مومن کے کلام پر جاں بخشی کی صفت ختم ہو گئی۔ کیونکہ اُس نے اپنے کلام سے اس قدر مردے جلائے
۲۱۸ ہیں کہ اب لب بتاں کو جاں بخشی دکھانے کا موقع نہ رہا۔ ۱۳ ظالم نے پہلے تو عاشق سے غفلت کی جب متوجہ ہوا تو عنایت کی بجائے جفا شروع کر دی۔ غفلت کی تلافی جفا سے کرنا ستم ظریفی نہیں تو پھر کیا ہے

کبھی[۱] انصاف ہی دیکھا نہ دیدار
قیامت اکثر اُس کو میں رہا کی

فلک[۲] کے ہاتھ سے میں جا چھپوں گر
خبر لا دے کوئی تحت الثرا کی

شبِ[۳] وصل عدو کیا کیا جلا ہوں
حقیقت کھل گئی روزِ جزا کی

چمن[۴] میں کوئی اُس کوچے سے آیا
گئی برباد سب محنت صبا کی

کشادِ[۵] دل پہ باندھی ہے کمر آج
نہیں خیر آپ کے بندِ قبا کی

کیا جب التفات اُس نے ذرا سا
پڑی ہم کو حصولِ مدعا کی

کہا[۶] ہے غیر نے تم سے مرا حال
کہے دیتی ہے بیباکی ادا کی

تمھیں[۷] شور و فغاں سے میرے کیا کام
خبر لو اپنی چشمِ سرمہ سا کی

دیا علم و ہنر حسرت کشی کو
فلک نے مجھ سے یہ کیسی دغا کی

غمِ[۸] مقصد رسی تا نزع اور ہم
اب آئی موت بختِ نارسا کی

۱ قیامت میں مخلوق کا انصاف اور خالق کا دیدار ہوگا۔ معشوق کے کوچہ میں قیامت تو اکثر برپا ہوئی مگر "انصاف" یا "دیدار" ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ ۲ اگر زمین کے نیچے کی کوئی خبر لا دے کہ وہاں تو آسمان اور اُسکے مظالم نہیں۔ تو میں فلک کے ہاتھ سے بچکر وہاں جا چھپوں۔
۳ یعنی اس رات کی جلن آفتاب قیامت یا نار دوزخ کی جلن سے کم نہ تھی۔ ۴ صبا کی تمام تگ و دو کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اُسکی ترغیب سے چمن میں جا کر بہار چمن دیکھیں مگر کوچہ یار کی دلاویزی ایسی نہ تھی کہ کوئی اُسکو چھوڑ کر چمن کی طرف رخ کرتا
۵ میں نے اپنے دل کی حل مشکل پر کمر باندھی ہے۔ اب آپکے بند قبا کی خیر نہیں۔ کیونکہ میں آزادی سے کھل کھیلوں گا۔ ۶ تمھاری اداؤں کی بے باکی صاف کہہ رہی ہے کہ میرا حال تمھیں غیر کی زبانی معلوم ہوا ہے۔ اگر تم کسی صحیح ذریعہ سے سنتے تو اس قدر دیدہ دلیری سے کام نہ لیتے۔ ۷ یعنی میرا شور و فغاں تمھاری چشم سرگیں کی شوخیوں کا نتیجہ ہے۔ ۸ حصول مقصد کی حسرت ہمارے ساتھ نزع تک رہیگی۔ ادھر ہم مرے اُدھر یہ حسرت ختم ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ بخت نارسا (جو غم و حسرت کا باعث ہوا ہے) کا وجود بس ہمارے دم تک ہے۔

مجھے اے دل تری جلدی نے مارا
نہیں تقصیر اُس دیر آشنا کی

جفا سے تھک گئے تو بھی نہ پوچھا
کہ تو نے کس توقّع پر وفا کی

کہا اُس بُت سے مرتا ہوں تو مومن
کہا میں کیا کروں مرضی خُدا کی

۲۱۹

نہ ربطِ[۱] اُس سے نہ یاری آسماں سے
جفا بہرِ عدو لاؤں کہاں سے

یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے
کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے

قیامت[۲] مرتے دم آئی فغاں سے
جہاں لے کر چلے ہیں ہم جہاں سے

شبِ وصل آپ کا عذرِ نزاکت
بجا ہے پر نہ مجھ سے نیمجاں سے

بُرا[۳] ہے عشق کا انجام یارب
بچا تا فتنۂ آخر زماں سے

رہی[۴] شب کی سی بیتابی تو ہر روز
چُرائیں گے ہم آنکھیں پاسباں سے

وہ[۵] آیا خاک پر تو بھی نہ اُٹھے
ہوئے ہم کیا سبک خوابِ گراں سے

۲۱۹ [۱] جفا میں کامل اگر کوئی ہے تو معشوق ہے یا دوسرے درجہ پر آسمان۔ اور بدقسمتی یہ کہ مجھ سے دونوں سے تعلق نہیں ایسی صورت میں رقیب کے لئے جفا کہاں سے لاؤں۔ مراد یہ ہے کہ معشوق یا آسمان موافق ہوتے تو انکو رقیب کے ستانے پر مسلط کر دیتا۔ [۲] ہم نے مرتے دم فغاں کی جس سے قیامت برپا ہوگئی اور قیامت کے آتے ہی دُنیا فنا ہوگئی۔ گویا ہم ملکِ عدم کو اپنے ساتھ ایک جہان لیکر جا رہے ہیں۔ [۳] آخر زمانہ میں (قریب قیامت میں) ہزاروں فتنے اُٹھ کھڑے ہونگے جن سے احادیث کریمہ میں ڈرایا گیا ہے۔ عاشق جو اپنے خیال میں محو ہے عشق کے انجام کو فتنۂ آخر زماں سمجھتا ہے اور اُس سے پناہ مانگتا ہے۔ [۴] رات ہم بے تاب ہو کر درِ یار پر پہونچ گئے اور اظہارِ اضطراب کیا جس پر پاسبان سے محجوب ہونا پڑا۔ اگر یہی حالت رہی تو روز اُس سے خفیف ہونا پڑیگا [۵] موت کے خوابِ گراں (گہری نیند) کا یہ اثر تھا کہ ہم معشوق کے آنے پر بھی قبر سے نہ اُٹھے اور بالآخر سبک (خفیف) ہوئے۔ گراں اور سبک میں ایہام تضاد ہے۔

مرا۵ بچنا برا ہے آپ نے کیوں — عیادت کی لبِ معجز بیاں سے

ملے دشمن سے کیونکر بے حجاب آپ — نہ شرم آئی مرے شوقِ نہاں سے

مرے۶ گھر آپ یوں جاتے تھے کس دن — اٹھانا مدعا ہے آستاں سے

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر آپ — تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

ق گرا اپنے وہم ہی سے اس نے پوچھا — مرا احوال میرے رازداں سے

نہ بولوں گا نہ بولوں گا کہ میں ہوں — زیادہ بدگماں اس بدگماں سے

نہ نکلی۷ ہائے یوں بھی حسرتِ دل — بجھے سو بحرِ چشمِ خونفشاں سے

نہ بجلی۸ جلوہ فرما ہے نہ صیاد — نکل کر کیا کریں ہم آشیاں سے

اٹھے۹ دیوار کیا جب خانۂ غیر — بنے میرے غبارِ ناتواں سے

جہاں سے تنگ تر جنت نہ ہو جائے — بہت حسرت بھرا جاتا ہوں یاں سے

برا۱۰ انجام ہے آغاز بد کا — جفا کی ہوگئی خو امتحاں سے

خدا۱۱ کی بے نیازی ہائے مومن
ہم ایماں لائے تھے نازِ بتاں سے

۵ لبِ معجز بیان سے عیادت کرنے کا یہ اثر ہوگا کہ میں اچھا ہو جاؤنگا اور بدستور مصائبِ عشق میں مبتلا ہونا پڑیگا۔ ۶ میں آپ کے آستاں پر پڑا تھا۔ آپ گھر سے باہر نکلے ہیں جس سے یہ ظاہر کرنا منظور ہے کہ آپ میرے (عاشق کے) گھر جا رہے ہیں۔ مگر اصل مقصد یہ ہے کہ میں اس دھوکے میں آکر آپ کے آستانہ سے چلا جاؤں۔ ۷ یعنی کاش آنسوؤں ہی کے ذریعہ سے حسرت نکل جاتی۔ ۸ شاعر نے اپنی ایذا پسندی پر زور دیا ہے۔ ۹ میری خاکِ ناتواں خانۂ غیر کی تعمیر میں صرف ہو رہی ہے مگر ناتوانی کا اثر اب بھی باقی ہے کہ اسکے گھر کی دیوار کا اٹھنا دشوار ہوگیا ہے۔ اٹھنے کے لفظ سے شاعر نے فائدہ اٹھایا ہے۔ ۱۰ محبوب نے پہلے عاشق پر محض امتحان کے طور پر جفا کی تھی۔ اب جفا کی عادت پڑ گئی۔ ۱۱ ہم بتوں کے ناز سے عاجز آکر خدا پر ایمان لائے تھے۔ مگر خدا نے وہ بے نیازی برتی جسکی کوئی حد نہیں۔

فردیات

قلق نے شب یہ گھبرایا نہ جب وہ ماہرو آیا | کہ جب اُچھلا زمیں سے دامنِ گردوں کو چھو آیا

اُس ستم کیش نے یہ اپنے نصیبوں کا لکھا | خط بھی لکھا تو سلام اُس میں رقیبوں کا لکھا

۱؎ جوڑا اُکھلا تو زلفِ سیہ فام میں پھنسا | چھوٹا تھا دل قفس سے سو پھر دام میں پھنسا

۲؎ سینۂ مجنوں کی جانب دیکھ کر رخ کیجیو | محملِ لیلیٰ کہیں مت سنگِ طفلاں توڑنا

۳؎ عطر ملتا تھا وہ عذرِ بد دماغی کے لئے | دُور سے دیکھا عدو کو ہاتھ مل کر رہ گیا

۴؎ نہ کیونکر دیکھ مجھکو رنگ بدلے اُس پری رو کا | پلٹنا اُن نگاہوں کا اُلٹ جانا ہے جادو کا

۵؎ بدایوں میں مجھے جوشِ جنوں لایا ہے دلی سے | یہ کیونکر چارۂ پندِ خردمنداں کا ہوش آیا

وقتِ وداعِ یار ۶؎ عجب اپنا حال تھا | کیا کرتے ہمرہی کہ ٹھہرنا محال تھا

جانباز مومن اُس نے دیا غیر کو خطاب | ہم جان پر بھی کھیلے پہ نام ادھر کا ہوا

۱؎ جوڑے کو قفس سے اور زلف کو دام سے تشبیہ دی ہے۔ ۲؎ یعنی جسے تم سینۂ مجنوں سمجھتے ہو یہ اصل میں محملِ لیلیٰ ہے کیونکہ اس میں لیلیٰ رہتی ہے۔ ۳؎ محبوب پہلے مجھ سے بد دماغی (بدمزاجی) کر چکا تھا۔ اب اُسکے عذر یا تلافی کے طور پر وہ میرے بدن میں عطر ملنے لگا۔ سو اتفاق سے سامنے رقیب نظر آگیا۔ محبوب نے اُسکے دکھانے کے لئے ہاتھ ملنے شروع کیئے تاکہ وہ سمجھے کہ عطر نہیں مل رہا ہے۔ بلکہ اُسکی (رقیب کی) محبت میں کفِ افسوس مل رہا ہے۔ ۴؎ محبوب کی نگاہوں نے مجھے دیکھا۔ جنکے اثر سے میری حالت غیر ہوگئی اس پر اُسکی نگاہیں اپنی طرف پلٹیں (یعنی اپنی دلاویزی حُسن کا احساس ہوا) بالآخر اس پلٹنے سے وہی تاثیر دکھائی جو جادو کے اُلٹ جانے میں ہوتی ہے۔ (قاعدہ ہے کہ جادو اُلٹ کر جادو کرنے والے کو ضرر پہونچاتا ہے) یہی وجہ ہے کہ مجھے تباہ حال دیکھ کر اُسکا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ ۵؎ حیرت ہے کہ مجھے جنوں میں ناصحوں کی نصیحت سے بچنے کی تدبیر ہی کیسے سوجھی۔ جو دلی سے بھاگ کر بدایوں آیا۔ ۶؎ یعنی جوشِ بے تابی سے ٹھہرنا محال تھا۔ پھر سفر میں محبوب کی ہمراہی کیونکر ہوسکتی

رحم کرنے کا نہیں مومن وہ کافر کیش پھر
فائدہ رونے سے سر جو کھٹکے حاصل توڑنا

تھے ہمیں مومن کی خودداری پہ کیا کیا اعتماد
کیا خبر تھی یہ کہ یوں محوِ بتاں ہو جائے گا

تمھیں ملنا تھا دشمن سے تو ملتے
ولے یک چند ترسایا تو ہوتا

یار ۷ سے محشر میں بگڑا تو ہمیں بن آیا
کہ اٹھے خاک سے جب وہ سرِ مدفن آیا

جاں ۸ دی اور اس وفا پر امتحاں باقی رہا
حشر کی فریاد کا اس کو گماں باقی رہا

ہے ۹ زمیں سب فتنہ خیز اس کے خرامِ ناز سے
یہ قیامت کیسی آئی آسماں باقی رہا

خیالِ نرگسِ میگوں ۱۰ میں مر گئے ہیں ہم
نہ کیونکہ لوگ پئیں اپنی بزمِ غم میں شراب

پہلا
محروم ہوا مومن ناکام محبت
اے اہلِ محبت یہ ہے انجام محبت

در بت خانہ پر کھڑا تھا آج
مومن دیں دار کیا باعث

جس ۱۱ سے ہمیں ہے کام اسی خودکام کے باعث
ہمنام سے صحبت ہے تو کیوں نام کے باعث

بھیج قاصد اسے دلجو اور معتمد سا بھیج
تیرے واسطے میں نے دل رکھا ہے منگوا بھیج

---

۷ بن آیا = بن پڑا - یعنی ہم محشر کے اٹھائے نہ اٹھے۔ ۸ ہم نے عشق میں جان دی مگر اس وفا کے باوجود دوست کو یہ امتحان کرنا باقی رہا کہ عاشق حشر میں میری شکایت کرے گا یا نہیں۔ ۹ اس کے خرام ناز کے فتنوں سے زمین پر قیامت آگئی مگر حیرت ہے کہ اس قیامت کے باوجود آسمان سلامت رہا۔ حالانکہ قیامت کے دن آسمان پارہ پارہ ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ خرام یار کا اثر زمین تک محدود ہے۔

۱۰ نرگس میگوں = وہ آنکھ جس میں شراب رنگ کے گلابی ڈورے ہوں۔

۱۱ شعر کی نثر کر دینا کافی ہے۔ ہمیں جس (کسی) سے کام ہے اسی خودکام (معشوق) کے باعث ہے (اگر اٹھے) ہم نام سے (ہماری) صحبت ہے تو کیوں (اسی کے) نام کے باعث۔

اُسے[١٢] غیر کے پاس سنتے نہیں ہیں — زیادہ ہمیں ہوش سے بھائے ہے غش
میں تو دیوانہ ہوں مومن کا کہ ہے اُس شخص کو — اس قدر وحشی مزاجی پر بھی اِک عالم سے ربط
چکھتے ہیں شورِ محبت کا مزا اللہ نصیب — تجھ سے اے ناصح کہے کیا کوئی غم کھانے کا حظ
مجھ پہ ہنستے تو ہیں پر دیکھنا رو دینگے رقیب — لبِ خنداں کی قسم دیدۂ گریاں کی قسم
خوش نہ کیونکر ہوں مَیں کافر کو مسلماں کر کے — مومن اُس بُت نے دلائی مجھے ایماں کی قسم
بیجا کدورتوں سے تری دم ہے ناک میں — رل جاؤں کاش پر اسی کوچے کی خاک میں
مضمون[١٣] بسمل ان کے کہوں کیا عتاب میں — قاصد کی لاش آئی ہے خط کے جواب میں
دستِ[١٤] جنوں کے جائیے صدقے کہ جیب سے — پھیلائے پاؤں ہم نے گریباں کے چاک میں
ساقیا[١٥] زہر دے ہجراں میں کہ بیہوش ہوں میں — کاسۂ عمر ہو لبریز تو مے نوش ہوں میں
نہ کیوں اُٹھ جائیں اس محفل سے جب یہ طور ہم دیکھیں — لڑائے آنکھ تو غیروں سے بیٹھا اور ہم دیکھیں
ہے لطف بناوٹ کا ہم خوب سمجھتے ہیں — یہ طور لگاوٹ کا ہم خوب سمجھتے ہیں
مجھکو کیا کام کہ آئینہ کی حیرت دیکھوں — دیکھ تو آئینہ اور مَیں تری صورت دیکھوں
جیوں یا مر چکوں یوں نزع کب تک — اِدھر ہو جاؤں یا رب یا اُدھر میں
نہ ہو تو بیٹھے بٹھائے خراب اے مومن — لڑا نہ اُس بُتِ خانہ خراب سے آنکھیں

١٢ ہمیں ہوش سے زیادہ غش پسند ہے۔ کیونکہ حالت غش میں محبوب کا رقیب سے اختلاط تو سُننے میں نہیں آتا۔

١٣ اُس سفاک نے میرے خط کے جواب میں بگڑ کر قاصد کی لاش بھیجی ہے اس سے زیادہ پھڑکتا ہوا مضمون اور کیا ہوگا۔ ١٤ یعنی دست جنوں کے طفیل میں گریبان کا چاک بڑھکر پاؤں تک پہونچ گیا ہے

١٥ یعنی ہجر میں شراب کی کسے خواہش ہے۔ زہر دے کہ بیہوش ہو جاؤں غرض میرا مے نوش ہونا یہی ہے کہ عمر کا پیالہ لبریز ہو جائے

[۱۶] مری تربت پہ کیا ہے کام شمع و گل کا اے یارو
یہاں پروانہ و بلبل کے اک دو چار پر رکھدو

خوش آئے مجھکو صبا کب گلوں کی باغ میں بو
بھری ہوئی ہے یہاں اور ہی دماغ میں بو

[۱۷] بہا ہیں کیا کہیں اب دیدۂ اعدا سے ہم آنسو
کہ بن کر بہ گئی اسے شوق گریہ چشم نم آنسو

یار کسی صورت سے تو احوال جتا دو
دروازے پہ اسکے مری تصویر لگادو

میں تو بولا ہی نہیں کس نے کیا ہے شکوہ
جھوٹ طوفاں نہ اٹھا خیر ہے برہم مت ہو

[۱۸] گریۂ شب نے بھگویا ہے اب اے آہ سحر
تیری گرمی سے جو بستر نہ جلے خشک تو ہو

یہ حالت بن گئی مومن ذرا کچھ منہ سے تو پھوٹو
تمھیں کیا ہوگیا یہ دل دیا کس شوخ کا فرکو

ہو صورت خاک ڈالنے کی جنت میں بھلا مومن
مری نظروں میں ہے شاہجہاں آباد کا نقشہ

[۱۹] سنگ مرقد سے مرے فیض ہے سب کو مومن
ہوں تہ خاک بھی طوطی پس آئینہ

یہ جان و دل پیام یار کی تعظیم کی ہم نے
سلام اسکا کہا قاصد نے جاں تسلیم کی ہم نے

[۲۰] اسے ماتم فراق اجل سے بچا بچا
رکھا تھا میں نے جان کو کیا تیرے واسطے

اس نے نامہ لکھا نصیب پھرے
نامہ بر کیا پھرا نصیب پھرے

جہاں تئے جوں خاک ہم کو روندا نہ تم ملتے نہ ایسے بنتے
ہوئی ہے مٹی خراب کیا کیا نہ تم سے ملتے نہ ایسے بنتے

---

۱۶ پروانہ و بلبل کے پر اس امر کی علامت ہونگے کہ یہ عاشق کی قبر ہے۔ شمع و گل سے عاشق کو کیا کام؟

۱۷ ہماری چشم نم آنسو بن کر بہ گئی۔ اب کیا ہم رقیبوں کی آنکھوں سے روئیں۔

۱۸ گریۂ شب کے باعث میرا بستر بھیگ گیا ہے۔ اے آہ سحر اگر تجھ میں اتنی گرمی نہیں کہ بستر کو جلادے تو کم از کم اس کو خشک تو کر دے۔ ۱۹ اپنے سنگ مرقد کو آئینہ اور اپنے آپکو طوطی قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے مزار کی برکت سے لوگ سخن سنجی سیکھ جاتے ہیں۔ ۲۰ شاعر ماتم فراق سے (جو اجل کا سبب ہے) مخاطب ہے مطلب یہ ہے کہ جان نذر دوست کے لئے رکھی ہے۔ تیرے لئے نہیں۔

بہا کب[21] اشک آکر اسکی چشم سرمگیں میں ہے — عصائے آبنوسی دست بیمار حزیں میں ہے

چھیڑ دیکھو جو سُنا نالۂ موزوں میرا — غیر سے شوخ نے اشعار فغانی[22] مانگے

ستمگر پوچھتا ہے حال کیا بیمار کا اپنے — کوئی دم کا گھڑی کا لحظہ کا ساعت کا مہماں ہے

خدا کے واسطے اب تو جنوں ہو سلسلہ جنباں — کوئی دیوانہ وحشت زدہ تا دست[23] و پا کھولے

چاک کر کھول دیا گرچہ یہ سینہ تو نے — تو بھی دل کی نہ گرہ ناخنِ شمشیر کھلی

جنبش[24] نہ دیجے ابروئے خوش خم کو دیکھیے — تیغ ستم کو دیکھیے اور ہم کو دیکھیے

دیکھا ہے خواب میں کہیں آرام جاں کو ہائے — غش پہروں آپ جان کے رہتے ہیں ہم پڑے

ہجر کی شب اور یادِ زلف نے لوٹا مجھے — جی وہ آکر لے گئی اور دل یہ آکر لے گئی

لچھے ریشم کے نہ ہاتھوں میں پہن — دیکھ نازک ہے کلائی تیری

باقی نہیں رہا ہے کچھ تن میں حال اپنے — اک ایک موئے سر ہے سر کا وبال اپنے

جو بعد مرگ بھی اُلفت کا کچھ اثر ہو جائے — ہماری خاک پہ ہو جائے یار پر ہو جائے

یاں[25] یہ ٹھہری ہے کہ اب بیڑی بنوانی چاہیے — اُنکو مقناطیس کی چوکھٹ لگانی چاہیے

کافر اسے بنا نا تھا یہ کیا کیا بتو — مومن سے مل کے تم بھی مسلماں ہو گئے

دو ہی دن ہے شب و روز غم و شادی مومن — کچھ ہمیشہ نہ رہے گا نہ رہا یاد رہے

---

[21] چشم یار کو بیمار سے اور اُسکے سرمہ آلود اشک کو جو آنکھ سے بہ کر آیا ہے عصائے آبنوسی سے تشبیہ دی ہے

[22] فغانی - ایران کے مشہور شاعر کا تخلص ہے - مراد یہ ہے کہ میری فغاں سے مقابلہ کرنے کے لئے محبوب نے کلام فغانی طلب کیا - [23] تاکہ ہاتھ کو آزادی سے جامہ دری کا اور پاؤں کو صحرا نوردی کا موقع ملے -

[24] یعنی کہاں تیغ ستم (ابرو) اور کہاں ہم ناتواں - [25] میرے احباب نے میرے لئے بیڑی تجویز کی ہے تاکہ درِ یار پر نہ جا سکوں - اب اگر محبوب کا آستانہ سنگ مقناطیس کا ہوا تو کام بن جائیگا کیونکہ میری آہنی زنجیر خود بخود کھنچ کر وہاں جا لگے گی -

مُعَمّیات

(۱) مُعمّا بہ اسم مومن

کیفیت وصال بس اب کچھ نہیں رہی	کیونکر نہ ہوں ملول کہ شب کچھ نہیں رہی

(۲) ایضاً

ازل سے جی ہے لگا سینہ سپر حاصل ہے	ہم سرِ اشک سے شاداب گلشنِ دل ہے

(۳) مُعمّا بہ اسم غلام علی خان

قید بے حد ہے خانہ بے در ہے	تو بھی صاحب غلام سے ملئے

(۴) مُعمّا بہ اسم میر محبوب علی

مرجا رقیب رشک سے گو ہے وصال یار	ہے اُس کی چشم شوخ ادا میرے واسطے

حل - معمّا نمبر (۱) "ملول ہیں" سے شب (یعنی "لیل") نکال دیجائے تو مومن باقی رہے گا۔
اس طرح - م ل و ل م ی ن
ل ل ی

م و م ن

معمّا نمبر (۲) - دل کی عربی قلب ہے جس کے اعداد (۱۳۲) ہیں۔ اور اشک کو عربی میں دمع کہتے ہیں۔ لہذا سرِ اشک = سرِ دمع جو (۴) کا ہم عدد ہے۔ اب ۴ کو ۱۳۲ میں جمع کرنے سے ۱۳۶ حاصل ہوتے ہیں۔ یہی مومن کے اعداد ہیں۔

معمّا نمبر (۳) - قید کی حد یعنی "د" دور کرنے سے "قی" رہ جاتی ہے۔ اس کے اعداد (۱۱۰) لفظ علی کے اعداد کے برابر ہیں۔ خانہ کا در (حرفِ آخر) گرانے سے خان بنتا ہے۔ اب علی خان کو غلام سے ملا دیجئے

معمّا نمبر (۴) مرجا بمعنی میر (امر از مُردن) ہے یہاں سید مراد ہے۔ یار کو عربی میں محبوب کہتے ہیں۔ اسی طرح چشم کی عربی عین (ع) اور میرے واسطے کی عربی لی ہے۔ ع اور لی کے ملانے سے علی ہوتا ہے۔

(۵) معمّا بہ اسم مہتاب رائے

بنے کیونکر کہ ہے سب کار الٹا	ہم الٹے بات الٹی یار الٹا

(۶) معمّا بہ اسم نواب مصطفےٰ خاں بہادر

نوا بلبل کی بے بس کر رہی ہے	بہار اک جام بے جا بھر رہی ہے
صدا بے درد قمری کی بلا ہے	سر طاقت بھی جس کا نقش پا ہے
فلک کو کل نہیں بے جور و بیداد	سر مے کیا ہو گو ہے فصل خورداد
کہ وہ سرو خراماں یاں نہیں ہے	سرور اپنا تو اب امکاں نہیں ہے
بہار سبز پا کے پاؤں لوٹیں	کہ درد بیحد حسرت سے چھوٹیں

معمّا نمبر (۵) - لفظ ہم کو الٹنے سے مہ بنجاتا ہے اسی طرح بات اور یار کے الٹنے سے تاب رائے

معمّا نمبر (۶) - بلبل کے اعداد (۶۴) میں سے بس کے اعداد (۶۲) منہا کرنے سے ۲ باقی بچتے ہیں - یہی ب کے عدد ہیں - نوا میں ب شامل کرنے سے نواب ہوا - جام میں سے جا خارج کرنے سے م حاصل ہوئی - اب صدا میں سے درد (یعنی دا جو عربی میں درد کا مترادف ہے) خارج کیا ص رہ گیا - سر طاقت سے حرف ط مراد ہے - فلک سے کل دور کرنے سے ف اور سرمے کاٹنے سے ے حاصل ہوئی - ان سب حروف کا مجموعہ مصطفےٰ ہوا اب (سرو خراماں) میں سے سرور اپنا (یعنی سرورا) خارج کر دیا جائے تو خاں رہجاتا ہے اسی طرح بہار کا پاؤں (ر) اور درد کی حد (آخری د) دور کرنے سے لفظ بہادر بنتا ہے -

پرنٹر
کے۔بی۔اگروالاشانتی پریس
الہ آباد۔۲
منیجر
حبیب اللہ جائسی